

دوسرے انتظار کرنے کی عادت نہیں۔ جہاں درخت موجود ہوں وہاں کشتیاں تیار کرنے میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔
 بس کہ سنبھلنے کا موقع دینا نہیں چاہتے۔ سین! تم قسطنطنیہ دیکھ چکے ہو اور ہم قیصر کے محل کی طرف بھیجے جانے
 سے شکر کی راہنمائی تمہارے سپرد کرتے ہیں۔ ہم تمہاری طرف سے اس کے سوا کوئی اور نبر سنا پسند نہیں
 پس گے کہ قسطنطنیہ فتح ہو چکا ہے اور تم ہر قتل کو پاہ زنجیر لارہے ہو۔“

سین نے کہا۔ ”عالیجاہ! آپ کے اس ناچیز غلام سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ لیکن.....“

”لیکن کیا؟ پرویز نے برہم ہو کر پوچھا۔“

”عالیجاہ! میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ قسطنطنیہ کا محل وقوع اور اس کے دفاعی استحکامات اُن تمام شہروں
 سے مختلف ہیں جنہیں ہم اس سے قبل فتح کر چکے ہیں۔ ہمیں اس شہر پر حملہ کرنے کے لئے ایک نہایت مضبوط
 بڑے کی ضرورت ہے۔“

شہنشاہ کو غضب ناک دیکھ کر دوسرے جرنیل نے کہا۔ ”عالیجاہ! ہماری طرف سے کوتاہی نہیں ہوگی۔
 ضرورت پڑی تو ہم اس کھائی کو اپنی لاشوں سے پاٹ دیں گے۔“

سین نے کہا۔ ”عالیجاہ! یہ ممکن ہے کہ آبنائے باسفورس کو لاشوں سے پاٹا جاسکے لیکن قسطنطنیہ فتح
 کرنے کے لئے ہمیں زندہ آدمیوں کی ضرورت ہے۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ ہمارے لئے مکمل تیاری
 کے بغیر قسطنطنیہ پر حملہ کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔“

دوسرے جرنیل دم بخود ہو کر کبھی سین اور کبھی خسرو کی طرف نہ لیکر رہے تھے۔ اگر کوئی دوسرا اس قسم کی
 جرات کا مظاہرہ کرتا تو پرویز اُس کی زبان کھنچوا دینے کے لئے تیار ہو جاتا۔ لیکن سین کی جرات، ہمت اور آوازی
 شگ و شبہ سے بالاتر تھی۔ ایران کا مغزور حکمران جس قدر اُس کی بیباکی پر برہم تھا اُسی قدر اُس کے تدبیر اور دوراندیشی
 کا مغزوف تھا۔ چنانچہ اُس نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی فتوحات
 کے باوجود تمہارے دل سے رومیوں کی سیدیت دور نہیں کر سکے۔“

سین نے بتیانیہ لہجے میں کہا۔ ”میرے آنا! اگر صرف میری جرات اور وفاداری کا امتحان لینا مقصود ہو تو
 بس تمہارا باسفورس عبور کر کے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اگر آپ نے مجھے قسطنطنیہ فتح کرنے کے لئے

باب ۲۳

بالیون کی طرح اسکندریہ میں بھی رومیوں کے جھنڈے سرنگوں ہو چکے تھے۔ اور خسرو پرویز کا دوسرا
 لشکر جسے ایشیائے کوچک کی تسخیر کی جہم سوچی گئی تھی، راستے کی بستیوں اور شہروں کو تباہ و ویران کرنے کے بعد
 انگورہ اور خلقدون تک پہنچ چکا تھا۔ جو سیت کے علمبرداروں کے لئے ہر دن فتح کا دن تھا اور رومی ہر لمحے
 نئے آلام و مصائب کا سامنا کر رہے تھے۔ پے در پے شکستوں کے بعد جہاں رومی سپاہیوں کے جوصلیت
 ہو چکے تھے وہاں اُن مقدس راہوں کی زبانیں بھی لنگ ہو چکی تھیں جو ہر شکست کے بعد کلیسا کے جاں نثاروں
 کو ایک عظیم فتح کی بشارت دیا کرتے تھے۔

اناطولیہ کے وسیع میدان کو روندنے کے بعد ایک دن خسرو پرویز آبنائے باسفورس کے کنارے اپنے
 عالیشان نیچے سے باہر سین اور دوسرے جرنیلوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس کے دائیں بائیں اور پیچھے ہتھکڑا تک
 ایرانی لشکر کے نیچے نصب تھے۔ اور سامنے دوسرے کنارے پر قسطنطنیہ کا عظیم شہر دکھائی دیتا تھا۔ کھلاہ ایران
 کی مغزور اور بے رحم نگاہیں قیصر کے آخری حصار کی طرف مرکوز تھیں اور اُس کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ
 تنہا باسفورس کے پانی کی سطح پر دوڑتا ہوا قسطنطنیہ کے قلعے پر حملہ کر دیتا تو بھی اُس کے ساتھیوں کو تعجب نہ ہوتا۔
 مسلسل کامیابیوں کے باعث آبنائے آڈم گئے تھے کا سارا غور اُس کے وجود میں جمع ہو چکا تھا۔ اچانک اُس نے
 مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اگر گہرے پانی کی یہ کھائی ہمارے راستے میں حائل نہ ہوتی تو آج ہم
 قیصر کے محل میں آرام کرتے۔ اب ہم واپس جا کر قسطنطنیہ کی فتح کا انتظار کریں گے۔ اور یہ بات یاد رکھو کہ ہمیں

منتخب کیا ہے تو میری فرض شناسی کا آپس تقاضا یہ ہے کہ میں بلا ضرورت آپ کے ایک سپاہی کی جان میں ضائع نہ ہونے دوں۔ میری احتیاط کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے قسطنطنیہ کے دفاعی لشکر دیکھے ہیں۔ ایک کامیاب حملے کے لئے ہمیں ایک مضبوط جنگی بیڑے کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ کی پوری کرنے میں ہم کو زیادہ عرصہ نہیں لگے گا۔

پروین نے قدم سے نرم ہو کر کہا۔ اب بیڑے کے متعلق سوچنا تمہارا کام ہے۔ ہم واپس جانے ہیں اور تم سب کو یہ بات کان کھول کر سن لینی چاہیے کہ مابعد دولت قسطنطنیہ کی فتح کے سوا کوئی اور خبر سننا پسند کریں گے۔ ہم تمہاری طرف سے صرف اُس پہلی کو دیکھنا پسند کریں گے جو ہرقل کو پاپاہ زنجیر اپنے ساتھ لائے گا۔ میں نے کہا۔ عالیجاہ! آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔

خبر دیکھ کر اور کہے بغیر اپنے نیچے کی طرف چل پڑا۔

تھوڑی دیر بعد جب سین اپنے نیچے کا رخ کر رہا تھا۔ فوج کے ایک عمر رسیدہ سالار نے اُسے پیچھے سے آواز دے کر روکا اور قریب آ کر کہا۔ آج آپ میری توقع سے زیادہ خوش قسمت ثابت ہوئے ہیں لیکن آپ کو بار بار شیر کے منہ میں ہاتھ دینے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ اب آپ شہنشاہ کی مصیبت کے ساتھ نہیں ہیں، بلکہ ایک عظیم فاتح کے سپاہی ہیں۔ اب انہیں صبح رائے دینے والوں کی بجائے اُن کے غلط احکام کی تعمیل کرنے والے زیادہ محفوظ ہیں۔

سین نے کہا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ میں نے آج صرف ایک وفادار سپاہی کا فرض ادا کیا ہے مجھے یقین ہے کہ قسطنطنیہ پر فردی حملہ ہمارے لئے خودکشی کے مترادف ہوگا۔

”یہ ہم سب جانتے تھے۔ اور مجھے یقین ہے کہ شہنشاہ کو بھی یہ معلوم ہے۔ لیکن میں آپ کو یہ مشورہ دیتا چاہتا ہوں کہ دوسروں کی موجودگی میں شہنشاہ کے ساتھ بات کرتے ہوئے آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔“

سین نے جواب دیا۔ ”مجھے یقین نہیں آتا کہ شہنشاہ کو میرے متعلق کوئی غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ بہر حال آپ کا شکر گزار ہوں اور آئندہ محتاط رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔“



قسطنطنیہ پر درفش کا دیوانی لہرانے کے لئے ایرانی لشکر کی متعدد کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ بازنطینی حکومت جس کی تعمیر میں گزشتہ چار صدی سے ایک عظیم سلطنت کے لامحدود وسائل صرف کئے گئے تھے۔ یہ جزا فیانی محل وقوع کے اعتبار سے بھی روئے زمین کا انتہائی ناقابل تسخیر قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا مشرقی لہے باسفورس، شمال ایک علیج اور جنوب بحیرہ مارمورا کے باعث محفوظ تھا۔ تین اطراف سے پانی میں گھرے تھے اس شہر کو ایک مضبوط قلعہ کے علاوہ رومیوں کی بحری قوت نے اور زیادہ ناقابل تسخیر بنا دیا تھا۔ ایشیا میں اپنی وسیع سلطنت سے محروم ہونے کے بعد مغرب کے اس دروازے کی حفاظت رومیوں کے لئے موت و حیات کا مسئلہ بن چکا تھا۔ چنانچہ اُن کا تمام جنگی بیڑا یہاں جمع ہو گیا تھا۔

مغربی سمت دوسری تفصیل اور قریباً سو فٹ گہری خندق کی بدولت باقی تین اطراف کی نسبت کم محفوظ تھی۔ تمام فصیلوں کے اوپر جگہ جگہ بھاری بھاری خندقیں نصب تھے، جن کی گولہ باری کے سامنے پانی یا خشکی کی طرف سے کسی بڑے سے بڑے لشکر کا شہر پر طیارہ کرنا ناممکن تھا۔ ایران کی گزشتہ فتوحات کا راز اُس کی بری افواج کی برتری میں تھا لیکن اس محاذ پر دشمن کو مغلوب کرنے کے لئے پیادہ اور سوار دستوں سے زیادہ جہازوں اور کشتیوں کی ضرورت تھی۔ سین جسے ضرور نے قسطنطنیہ فتح کرنے اور ہرقل کو پاپاہ زنجیر پیش کرنے کی ہم سوچی تھی اس شہر کے دفاعی استحکامات سے ناواقف نہ تھا۔ اُس نے دشمن کی بحری قوت کا مقابلہ کرنے کے لئے مفتوحہ علاقوں کے رازوں کا ریکارڈ جہاز بنانے پر لگا دیئے تھے اور اُسے یقین تھا کہ مکمل تیاریوں کے بعد جب وہ بحیرہ مارمورا، ابلتے باسفورس اور بحیرہ اسود میں دشمن کے جنگی بیڑوں کو شکست دینے کے قابل ہو جائے گا تو قسطنطنیہ اُس کے محروم پر ہوگا۔ سمندر کے راستے رسد و لگ سے محروم ہونے کے بعد رومی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یمن ضرور کے لئے معمولی تاخیر بھی ناقابل برداشت تھی۔ اُسے ملحق کرنے کے لئے سین نے اپنی خواہش کے تحت چند حملے کئے لیکن ایرانی لشکر کو ہر بار شدید نقصانات اٹھانے پڑے۔

سین کی بیوی اور بیٹی لشکر کے پڑاؤ سے کوئی آٹھ میل مشرق کی طرف ایک چھوٹے سے شہر کے باہر

قلعہ نامکان میں مقیم تھیں اور سین فرسنت کے دن ان کے ساتھ گزارا کرتا تھا۔

موسم بہار کی ایک صبح فلسطینہ اور اُس کی ماں ایک کشادہ کمرے کے دریچے کے سامنے بیٹھی تھیں باہر ایک ٹیلے کے دامن میں سیب اور ناشپاتی کے درخت پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ فلسطینہ کے سر میں شباب کی رعنائیوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اور اُس کی نگاہوں میں شوخی کی بجائے مناسبت آگئی تھی۔

یوسیبیائے کہا "بیٹی تمہارے ابا جان نے پیغام بھیجا تھا کہ میں تین چار دن بہت مصروف ہوں، لیکن اب پورا ہفتہ گزر چکا ہے میرا خیال ہے کہ وہ آج ضرور آئیں گے"

فلسطینہ نے کوئی جواب نہ دیا وہ بظاہر دریچے سے باہر سیب کے درختوں کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن اُس کے پھرے کی اداسی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی مددگاہ سے کہیں آگے کسی کھوئی ہوئی چیز کو تلاش کر رہی ہے۔

یوسیبیائے کہا "فلسطینہ بیٹی، کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ چونک کر ماں کی طرف متوجہ ہوئی۔ "آپ نے کیا کہا تھا؟ امی جان!"

"میں کہہ رہی تھی کہ تمہارے ابا جان کیوں نہیں آئے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ آج ضرور آئیں گے"

یوسیبیائے کہا "بیٹی سچ بتاؤ ایرج کو اُس دن تم نے کیا کہا تھا اُس نے ایک جینے سے ہمیں صورت نہیں دکھائی۔"

فلسطینہ نے قدرے آندہ ہو کر کہا "امی جان! آپ اُس کے متعلق کیوں پریشان ہیں۔ اُسے جس وقت موقع ملے گا وہ سیدھا اس طرف جھاگا ہوا آئے گا، آخر ہمارا قلعہ فلسطینہ کا قلعہ تو نہیں جس کے دروازے اُس کے لئے بند ہیں"

ماں نے کہا "کاش! میں تمہاری نفرت کی وجہ سمجھ سکتی"

"مجھے اُس سے نفرت نہیں، امی! لیکن اگر وہ ہمارے کسی عرصے کا نام نہ لے کر چلے تو میں کیا کر سکتی ہوں"

یوسیبیائے کہا "پہلی کہیں کی، تمہیں اُس کے سامنے عاصم کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"امی! میں نے اُس سے صرف یہ پوچھا تھا کہ مصر میں پیش قدمی کرنے والی فوجوں کے متعلق کوئی اطلاع

ہی آئی لیکن وہ آپ سے باہر ہو گیا۔"

"تمہیں اُس سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی، کیا تمہارے ابا جان نے یہ بات معلوم کرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا؟"

اُس کا احسان نہیں جھول سکتے بیٹی! لیکن تمہیں کسی وقت بھی یہ نہیں جھولنا چاہیے کہ تم سین کی بیٹی ہو۔"

ورعاصم....."

فلسطینہ نے بات کاٹ کر کہا "اور عاصم ایک مصیبت زدہ عرب ہے۔ یہی کہنا چاہتی تھیں نا آپ؟"

ماں نے کہا "بیٹی! اگر وہ پورے عرب کا بادشاہ ہوتا تو بھی میں یہی کہتی کہ تمہیں اُس کے متعلق اس سے

یادہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اُس نے مصیبت کے وقت ہماری مدد کی تھی۔ اور ہمارے فرض ہے کہ ساری عمر

اُس کے اس احسان کا بدلہ دیتے رہیں۔ تمہیں یہ شکایت نہیں ہو سکتی کہ تمہارے باپ نے اُس کے احسان کا بدلہ

دینے میں غل سے کام لیا ہے۔ ایک گناہ اور بے وطن عرب کو یا اسی اور بددلی کی دلدل سے نکال کر ایرانی لشکر

کے لڑنے بڑے سرداروں کے دوش بدوش کھڑا کر دینا معمولی بات نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب اُسے ہمارا خیال

بھی نہیں آتا ہوگا۔ ایرج کا مسئلہ بالکل مختلف ہے۔ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ایران کے بہت کم

اُس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اُس کا باپ تمہارے ابا جان کا دوست ہے اور اُس کی زندگی کی سب

سے بڑی خواہش یہ ہے کہ تمہارا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ اگر میرے بس کی بات ہوتی تو میں تمہارے

لئے اپنے کسی ہم مذہب رومی یا یونانی کو منتخب کرتی لیکن میں تمہارے باپ کی خاطر اپنی عزیز ترین خواہشوں کی

قربانی دینا سیکھ چکی ہوں۔ زمانے کے انقلاب نے اُسے میری قوم اور میرے مذہب کا دشمن بنا دیا ہے

وہ ظالم نہیں تھا لیکن شہنشاہ کے دربار میں اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے

سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ ایرج ان گنت خوبیوں کا مالک ہے۔ لیکن اگر اُس میں

کوئی خوبی نہ ہوتی۔ اگر وہ بد صورت ہوتا تو بھی شاہی خاندان سے نانا ہوڑنے کے لئے تمہارا باپ تمہاری قربانی

دینے کے لئے تیار ہو جاتا"

"نہیں، نہیں، امی جان! فلسطینہ نے آبدیدہ ہو کر کہا "میرے ابا جان ایران کا تخت حاصل کرنے

کے لئے میری آنکھوں میں آنسو دیکھنا گوارا نہیں کریں گے۔“

”بیٹی تمہارے ابا جان کو اس بات کا یقین ہے کہ ایسے کی بیوی بن کر تم اپنی قسمت پر ناز کرو گی اور ان کے اس یقین میں ذرہ بھر تبدیل نہیں آسکتی۔“

فسطینہ نے کرب انگیز لہجے میں کہا ”اے ابا جان، آپ کو میرے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے میں اپنے باپ کی عزت کے لئے اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔ میں جانتی ہوں کہ میرا راستہ ماصم کے راستے سے مختلف ہے لیکن اپنی ماں کے سامنے مجھے یہ کہتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی کہ آسے بھول جانا میرے بس کی بات نہیں کم از کم میں اُس کے متعلق اتنا ضرور سننا چاہتی ہوں کہ وہ زندہ ہے اور خوش ہے۔ کاش! میں صرف ایک بار اُسے دیکھ لوں۔“

فسطینہ کی آواز سسکیوں میں دب کر رہ گئی۔ یوسیانی نے اُسے کھینچ کر اپنے سینے سے چٹاپا لیا اور اُس کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”میری بیٹی! میری ننھی بیٹی! ماصم سے ہماری ملاقات ایک اتفاقی حادثہ تھا اور تمہیں اس حادثے کو اس قدر اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ تمہارے ابا جان کہتے تھے کہ وہ اپنے قبیلے سے کٹ چکا تھا لیکن اب کئی قبیلوں کے رضا کاروں کا سالار بننے کے بعد اُسے زندہ رہنے کے لئے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب شہرت اور ناموری کے سوا اُسے کوئی خواہش پریشان نہیں کرے گی بیٹی! مجھے یقین ہے کہ اب اُس کے دل میں تمہارا خیال بھی نہیں آتا ہوگا۔“

فسطینہ نے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”اے ابا جان اور ابا جان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شہرت اور ناموری کے لئے ایران کی فوج میں شامل ہوا تھا تو آپ غلطی نہیں ہیں، آپ کو یقین نہیں آئے گا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ میری باتوں سے متاثر ہو کر ایران کی فوج میں شامل ہوا تھا۔ دمشق سے روانہ ہوتے وقت اُس کے دل میں بس اس کے سوا کوئی اور خواہش ہی نہیں تھی کہ میں سے ایک بہادر سپاہی کی حیثیت میں دیکھ کر اُس کی فتوحات اور کامیابیوں پر فخر کر سکوں۔ اب اگر وہ کسی لڑائی میں ہلاک ہو جائے تو اس کا خون میری گردن پر ہے۔ اگر وہ زخمی ہو گیا ہے یا کہیں بیمار پڑا ہے تو مجھے یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی میری یاد ضرور آتی ہوگی۔ اسی لئے میں اُس کی عزت کو نہ اگساؤ تو وہ کسی کی بھیڑیں چرا کر بھی خوش رہ سکتا تھا۔ لیکن اُس وقت میں اب جان تھی مجھے اس بات کا ذوق تھا کہ میں شہنشاہ کے دوست کی بیٹی ہوں۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ جسے میں اپنے دل میں بلکہ

بچی ہوں، ساری دنیا کی آنکھوں کا تارا بن جائے۔ وہ بہادر اور نیک انسان جس نے مصیبت کے وقت راستہ دیا تھا۔ گنگامی سے نکل کر شہرت و ناموری کی اُن بلندیوں پر پہنچ جائے کہ ایران کے مغرور امراء، مہانک اور بے ابا جان بھی اُس سے ہاتھ ملانے پر فرح محسوس کریں۔ لیکن اب مجھے جنگ کے قصور سے وحشت محسوس ہوتی ہے۔ میں شہرت و ناموری کے الفاظ سے چٹتی ہوں۔ میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ وہ عظیم ترین فتوحات حاصل کرنے اور ہزاروں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد بھی شہرت و ناموری کے میدان میں ابا جان کی بھری یاد دہانی نہیں کر سکے گا۔ اور ابا جان کی یہ حالت ہے کہ جب سے انہیں ایرانی فوج میں سب سے بڑا بندہ ملا ہے، میں نے اُن کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ وہ صرف قسطنطنینہ کی فوج ہی سے نہیں بلکہ اپنے ضمیر مجھے لڑ رہے ہیں۔ پھر جب میں آپ کی طرف دیکھتی ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت ہم سے مذاق کر رہی ہے۔ اتنی جان بچ کیے، اگر ابا جان ایک عام آدمی کی طرح آزادی مابے فکری، امن اور سکون کی زندگی بسر کر سکتے تو آپ اس قلعے کی بجائے ایک چھوٹے سے گاؤں یا دیہے میں رہ کر زیادہ خوش محسوس نہ کرتیں؟“

یوسیانی نے جواب دیا ”میں یقیناً زیادہ خوش محسوس کرتی۔ کم از کم میرے دل پر یہ وجہ نہ تھی کہ میرا شوہر میری قوم اور میرے ہم مذہبوں کے قاتلوں کا سردار ہے۔ لیکن بیٹی! ہم اپنی تقدیر سے کیسے بھاگ سکتے ہیں؟ تم ماصم کے متعلق یہ کہہ سکتی ہو کہ وہ بھیڑیں چرا کر خوش رہ سکتا تھا لیکن سین کی بیٹی اور اُس کے درمیان جو سمندرِ حال ہیں انہیں کون پاٹ سکتا ہے؟۔ فسطینہ اگر میرے اختیار میں ہوتی تو میں دنیا کی تمام ستیڑیوں پر نچاؤ کر دوں لیکن میں بلے بس ہوں، ہم سب بلے بس ہیں۔ تمہیں یہ بھول جانا چاہیے کہ وہ کبھی تم سے ملا تھا۔ سونا باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنانی دے رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے ابا جان آگئے ہیں۔“

فسطینہ اپنے آنسو پونچنے کے بعد سنبھل کر بیٹھ گئی۔ صحن میں آدمیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ غوغائی اور بوجھل کر کے میں داخل ہوا، اور اُنڈھال ہو کر اپنی بیوی کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ آپ کی طبیعت خشک ہے؟ یوسیانی نے پوچھا۔

اُس نے جواب دیا ”میں بہت خشک گیا ہوں۔ دشمن نے اچانک حملہ کر کے بحیرہ ماروا میں ہمارے کئی بہانہ تباہ کر دیئے ہیں، اور ہمیں یہ نقصان پورا کرنے میں چند عینے اور لگ جائیں گے لیکن پرسوں شہنشاہ کا پلٹ

یہ حکم سے کر آیا تھا کہ ہم قسطنطنیہ فتح کرنے میں مزید تاخیر برداشت نہیں کریں گے۔ میں نے اپنی مشکلات بتانے کے لئے بذات خود شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت مانگی تھی لیکن میری درخواست یہ کہہ کر ٹھکرا دی گئی ہے کہ اگر تم ہمارے پاس آنا چاہتے ہو تو ہرقل کو پاہ زنجیر ساتھ لے کر آؤ۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ شہنشاہ کے دربار میں میرے مخالفین کا پلہ پھر بھاری ہو رہا ہے۔

یوسیبیائے کہا۔ ”آپ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ ایرانی لشکر کے لئے آبنائے باسنودس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود جب آپ کو قسطنطنیہ فتح کرنے کی ذمہ داری پہنی گئی تھی تو آپ بہت خوش ہوئے تھے۔“

سین نے کہا۔ ”اس وقت مجھے یہ امید تھی کہ ایک طویل عرصہ کے لئے قسطنطنیہ کے سامنے ہماری افواج کا اجتماع بالآخر دوسروں کو بھیجا رہا لے یا ہماری شرائط پر صلح کرنے کے لئے مجبور کر دے گا۔ اور چند ناکامیوں کے بعد شاید خسرو بھی جنگ کو طول دینا سود مند خیال نہ کرے۔ لیکن شہنشاہ کے اصرار پر ہم نے مکمل تیاریوں کے بغیر گزشتہ چند حملوں میں جو نقصانات اٹھائے ہیں ان کی وجہ سے دوسروں کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں اور اب مجھے بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ وہ ہماری شرائط پر صلح کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ ادھر ہمارے شہنشاہ کی یہ حالت ہے کہ وہ میری طرف سے قسطنطنیہ کی فتح کی اطلاع کے سوا، کوئی اور بات سننے کے لئے تیار نہیں کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ شہنشاہ کے خطاب سے بے پروا ہو کر ان کے پاس پہنچ جاؤں اور صاف صاف کہہ دوں کہ میرے اندازے غلط تھے میں اس ذمہ داری کا اہل نہ تھا لیکن پھر یہ سوچتا ہوں کہ دہاں مجھ پر درپردہ عیسائیوں کا طوفان دار ہونے کا الزام مانڈ گیا جائے گا۔“

یوسیبیائے مغموم لہجے میں کہا۔ ”میں جانتی ہوں یہ الزام آپ پر اس لئے مانڈ گیا ہے گا کہ آپ کی بیوی ادا بیٹی عیسائی ہیں۔ میں اس مسئلے پر ایک مدت سے سوچ رہی ہوں کہ آپ نے صرف ہمیں جو سی کاہنوں کے خطاب سے بچانے کے لئے اپنے ضمیر کے خلاف وہ کام کئے ہیں جن کی آپ سے توقع نہ تھی۔ اگر آپ کے سامنے ہمارے تحفظ کا مسئلہ نہ ہوتا تو آپ شاید اس جنگ میں شرکت کرنا بھی پسند نہ کرتے، کم از کم آپ کو اتنی آزادی ہوتی کہ آپ شہنشاہ کے سامنے صاف گوئی سے کام لے سکتے، اور اُسے اپنا نفع یا نقصان سمجھانے وقت آپ

دل میں یہ مذمت نہ ہوتا کہ آپ کو عیسائیوں سے ہمدردی رکھنے کا طعنہ دیا جائے گا۔ میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ آپ کے پاؤں کی زنجیریں گھٹیں، اب وقت آگیا ہے کہ آپ حقیقت پسندی سے کام لیں۔“

سین نے مضطرب ہو کر کہا۔ ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھتا تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“

”میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کے پاؤں کی زنجیریں ہٹا نہیں چاہتی۔ آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ میں آپ پر زور رکھوں کہ آپ اپنی طرفوں کو مطمئن کرنے کے لئے یہ کہہ سکیں کہ آپ نے ایک عیسائی بیوت اپنے شکر سے نکال دیا ہے۔ پھر آپ پر کوئی یہ اعتراض نہ کرے گا کہ آپ نے عیسائیوں کے ہمدرد ہونے کی وجہ سے قسطنطنیہ فتح نہیں کیا۔ فسطیہ نے دلوں میں آپ کا خون ہے اور اسے جو سی مذہب اختیار کرنے پر لئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

سین کی حالت اُس شخص کی سی تھی جس پر سبلی گر پڑی ہو وہ چند ثانیے سے کتے کے عالم میں اپنی بیوی کی رون دیکھتا رہا۔ پھر مضطرب ہو کر اچانک اٹھا اور کچھ دیر کمرے میں بیٹھنے کے بعد یوسیبیائے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”یوسیبیائے میری طرف دیکھو۔“ اُس نے عجلت سے کہا۔ ”یوسیبیائے آہستہ سے گردن اٹھائی اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ سین کچھ دیر خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتا رہا، بالآخر اُس نے کہا۔ ”یوسیبیائے تمہارے دل میں یہ خیال کیسے آیا کہ کوئی خواہش یا کوئی خوف مجھے تمہارا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اُن حکم دو تو میں اسی وقت شہنشاہ کو استعفاء بھیجنے کے لئے تیار ہوں۔ میں نتائج سے بے پروا ہو کر اس بات کا اعتراف کرنے کے لئے تیار ہوں کہ میں اس ذمہ داری کا اہل نہ تھا۔“

خسرو کے اولوالعزم سالار کے لہجے میں ایک خشکت خوردہ انسان کی بے بسی یوسیبیائے کو متاثر کرنے کے لئے کافی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ میری زندگی اور موت آپ کے ساتھ ہے۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی آپ سے جفا نہیں رہ سکتی۔“

سین نے قدرے مطمئن ہو کر دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”یوسیبیائے تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ایران کے امراء اور مذہبی پیشواؤں کی مخالفت کے باوجود قسطنطنیہ جانے کا خطرہ مول لیا تھا۔ اور قید کے بعد وہاں سے واپس آتے وقت مجھے یقین تھا کہ شہنشاہ ایران، ہرقل کی طرف سے صلح کی درخواست سنتے ہی خوشی سے اچھل

پڑے گا لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ ابتدائی فتوحات نے پروردگار کی ذہنیت تبدیل کر دی ہے۔ مجھے اس بات کا احترام ہے کہ پروردگار کے طرز عمل سے یابوس ہونے کے بعد اُس کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ جو شخص روم کی عظیم سلطنت کو تباہ کرنے کا عزم لے کر گھر سے نکلا ہے، اُس کے لئے اپنے ایک ساتھی کو موت کے گھاٹ اتارنا مشکل نہیں۔ خسرو اور اُس کے مصاحبوں کے تور دیکھنے کے بعد میرے سامنے اولین مسئلہ یہ تھا کہ میں ایرانی فوج میں اپنا کھویا بڑا مقام دوبارہ حاصل کروں۔ مجھے اُمید تھی کہ چند سال یا چند مہینے کے بعد جنگ کے نقصانات شہنشاہ کو امن اور صلح کی باتیں سننے پر مجبور کر دیں گے۔ اس لئے ایسے لوگوں کو اُس کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے جو وقت آنے پر اُسے خون آلود تلواروں کو نیام میں کرنے کا مشورہ دے سکتے ہوں۔ اگر مجھے یہ اُمید نہ ہوتی کہ میں شہنشاہ کا اہلکار حاصل کر کے کسی نہ کسی دن اُس سے اپنی بات منواسکوں گا تو بھی میری پرانی اور بیٹی کی حفاظت کا مسئلہ ایسا نہ تھا کہ میں اُسے نظر انداز کر سکتا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میری ہوا اٹھ گئی تو تمہیں ذلت و تامل کے جیسا تک لگے سے میں دھکیلنے کے لئے کسی جوسی کا ہن کا یہ کہہ دینا کافی ہو گا کہ تم عیسائی ہو۔ تمہاری طرح شہنشاہ کی محبوب ترین ملکہ بھی عیسائی ہے لیکن کوئی اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میری بھی یہ جرأت تھی کہ اگر کوئی متعصب جوسی میری بیوی کی طرف انگلی اٹھاتا چاہے تو اُس کے دل پر یہ خون سوار ہو کہ اُس کا ماتہ باند سے الگ کر دیا جائے گا۔ کمزوری اور بے بسی کے احساس کے تحت زندہ رہنا میرے نزدیک موت سے بدتر ہے۔ انسان کی ساری خواہشیں پوری نہیں ہوتیں۔ مجھے اس بات کا احترام ہے کہ میری بیشتر امیدیں ننگ میں مل چکی ہیں۔ خسرو پروردگار سے کسی میں اپنا بہترین دوست سمجھتا تھا وہ اب مجھ سے بہت دور جا چکا ہے میرا خلوص، میری وفاداری اور میری عظیم ترین خدمات اُس کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ قدرت نے اُسے طوائف سے نکال کر اُن بے رحم دیوتاؤں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے جو صرف حکم دینا جانتے ہیں۔ مجھے اگر کوئی اطمینان ہے تو یہ ہے کہ میں نے حتی المقدور آگ اور خون کے اس سیل رعد کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے مغرب علاقوں کے ان گنت عیسائیوں کو بلاوجہ قتل ہونے سے بچایا ہے۔ اگر اس حجاز پر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایشیائے کوچک کے ہر شہر اور ہر شہر کی حالت انطاکیہ اور دمشق سے بھی زیادہ خراب ہوتی۔ یوسیبیا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا کہ یہ جنگ جلد ختم ہو جائے۔ اور جنگ ختم کرنے کی آسان ترین صورت یہی ہے کہ یا تو ہم قسطنطنیہ

تار کرنے کے قابل ہو جائیں اور یا خسرو یہ محسوس کر لے کہ یہ شہر ناقابل تیسر ہے اور اُس کی جھلانی اسی میں ہے۔ یہ اپنی سابقہ فتوحات پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ موجودہ حالات میں مجھے یہ توقع نہیں کہ ہم آئندہ دوچار برس تک ہی قسطنطنیہ فتح کر سکیں گے۔ لیکن میں اس اُمید پر خسرو کے احکام کی تعمیل کرتا رہوں گا کہ کسی نہ کسی دن انسانی خون کے لئے اُس کی پیاس بجھ جائے گی۔ اور مجھے توقع ہے کہ جب تک ایسا وقت نہیں آتا میری شریک حیات بہت اور وصلے سے کام لے گی۔

یوسیبیا نے کہا۔ ”مجھے آپ کی پریشانیوں کا احساس ہے اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ اس مسئلے پر آپ سے بحث نہیں کروں گی۔“

”نہیں، یوسیبیا! یوں نہ کہو۔ آخر تمہارے سوا کون ہے جس سے باتیں کر کے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکوں۔ میری یہ حالت ہے کہ میں اپنی فوج کو باسغورس میں کودنے کا حکم دے سکتا ہوں لیکن انہیں یہ بتانے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ میرے حکم ماننے سے تم ڈوب جاؤ گے۔ کاش میرے افسروں میں چند آدمی ایسے ہوتے جن سے میں کھل کر باتیں کر سکتا۔ ان دنوں میں بڑی شدت سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ عاصم کو میرے پاس ہونا چاہیے تھا۔“

یوسیبیا نے کہا۔ ”آپ اُسے بلا کیوں نہیں لیتے؟“

سین نے جواب دیا۔ ”کل مجھے اطلاع ملی تھی کہ مصر سے ہماری فوج کے چند دستے مغرب میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔ اگر وہ اُن کے ساتھ نہ آیا تو میں مصر کے سپہ سالار کے پاس ایلمپی جمع دوں گا۔“

عاصم کا ذکر سن کر قسطنطنیہ کے دل میں خوشگوار دھڑکنیں بیدار ہونے لگیں۔

یوسیبیا نے پوچھا۔ ”ایرج کا کیا حال ہے؟“

سین نے جواب دیا۔ ”ایرج سے میں بہت زیادہ خوش نہیں ہوں۔ اپنے خاندانی اثر و سوارخ کے طفیل قبل از وقت ترقی کر کے وہ حدود رجب مغزود ہو گیا ہے۔ فوج کا کوئی افسر اُس سے خوش نہیں۔ چند دن بڑے اُس نے ایک گھر رسیدہ افسر کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ میں نے اُسے باز پرس کے لئے بلایا تو وہ شراب کے نشے میں چور تھا۔ اگر اُس کے باپ کا لحاظ نہ ہوتا تو میں اُسے ہدترین سزا دیتا۔ اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اُسے کچھ عرصے کے لئے رخصت پر بھیج دیا جائے۔ پچھلے دنوں اُس کے باپ نے بھی یہ پیغام بھیجا تھا کہ میں اپنے بیٹے کے لئے کسی

صوبے کی گورنری حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

یوسییانے کہا "لیکن اس عرصے اُسے اتنی بڑی ذمہ داری کیسے دی جاسکتی ہے؟"

"وہ ایک ایسے خوش نصیب خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس کے افراد کو کوئی عہدہ دیتے وقت یہ نہیں پوچھا جاتا کہ تمہاری عمر کیا ہے۔ اور اب وہ چھوٹا بھی نہیں۔ اُس کی عمر جو بیس سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اُس کے باپ نے ایک بار پھر اُس کی شادی کے متعلق لکھا ہے اور اب میں اُسے ٹالنے کے لئے یہ پہلے نہیں کر سکتا کہ فسطینہ کی عمر اسی چھوٹی ہے۔"

فسطینہ پہلی مرتبہ اپنے باپ کے منہ سے اپنی شادی کے متعلق سن رہی تھی اُس نے اضطراب اور بے بسی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھا اور فوراً اٹھ کر چلی گئی۔

یوسییانے پوچھا "آپ نے اُسے کیا جواب دیا ہے؟"

کوئی جواب دینے سے پہلے میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن فسطینہ چلی کیوں گئی۔ کیا وہ ایرج کو پسند نہیں کرتی؟"

یوسییانے جواب دیا "میں ابھی آپ کے آنے سے پہلے اُسے یہ سمجھا رہی تھی کہ ایرج سے شادی کے مسئلے میں تمہارے والد تمہاری پسند یا ناپسند کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔"

سین کچھ دیر پریشانی کی حالت میں یوسییانے کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اُس نے کہا "تمہیں میری بیٹی سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ میں بذاتِ خود ایرج سے مطمئن نہیں ہوں، میں کئی سال سے اُس کا مطالعہ کر رہا ہوں اور مجھے اُس کی سب سے بڑی خوبی یہی نظر آئی ہے کہ وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس سے نانا جوڑنے پڑھانے پر ایرانی فکر کر سکتا ہے۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ ایران کے چند خوش وضع نوجوانوں میں سے ایک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب فسطینہ سنجیدگی سے اپنے مستقبل کے متعلق سوچنا شروع کرے گی تو ایرج میں اُسے کئی خوبیاں نظر آئیں گی۔"

"مجھے یقین ہے کہ فسطینہ کو کوئی ایسی خواہش نہیں کرے گی جس کی تکمیل سے اُس کے باپ کے دوستوں کی تعداد میں کمی پادشہوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے۔ لیکن میں یہ درخواست کروں گی کہ آپ اس معاملے میں جلد بازی

کے کام نہ لیں اور مجھے اس بات کا موقع دیں کہ میں اُسے نفع اور نقصان سمجھا سکوں۔"

سین نے کہا "فسطینہ کی شادی کے مسئلے میں جلد بازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اب وہ اٹھارہ سال

کی ہو چکی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایرج کو پسند کرتی ہے۔ اور اگر اُس نے ابھی تک اپنی شادی کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع نہیں کیا تو تم اُسے برا آسانی یہ سمجھا سکتی ہو کہ ایرج کے خاندان سے نانا جوڑنے میں ہم سب کی جھلٹی ہے۔ موجودہ حالات میں ایرج کے سوا ایران کا کوئی اور نوجوان ایک عیسائی ماں کی بیٹی سے شادی کرنے کی جسارت نہیں کرے گا۔ اور اگر کوئی یہ جسارت کرے تو ہمیں یہ اطمینان نہیں ہوگا کہ وہ ایرج سے زیادہ اُس کے تحفظ کی ضمانت دے سکتا ہے۔ اُس سے شادی کرنے کے بعد اگر وہ اپنے گلے میں صلیب ڈال کر مدائن کے بازاروں میں گھومنا چاہے یا اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا گر جائے تو ہمیں ہمارا سب سے بڑا کاہن اُس پر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

یوسییانے کہا "مجھے معلوم ہے لیکن میں آپ سے یہ وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ آپ میری بیٹی کو سوچنے کا

موقع دیں گے۔"

سین نے برہم ہو کر کہا "میں نے یہ کب کہا ہے کہ آج ہی اُس کی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں؟" پھر وہ بلند

آواز میں چلایا "فسطینہ! فسطینہ! ادھر آؤ۔"

اور فسطینہ پورے کے چھپے کھڑی اُن کی باتیں سن رہی تھی۔ مگر سے کے اندر آگئی۔

"بیٹھ جاؤ، بیٹی! میں کل علی الصباح یہاں سے چلا جاؤں گا اور مجھے یہ بات قطعاً پسند نہیں کہ تم ایک لمحہ

کے لئے بھی میری آنکھوں سے اوجھل رہو۔ تم میرے لئے دعا کرتی رہتی ہو نا؟"

فسطینہ نے جواب دینے کی بجائے آگے جھک کر اپنا سر سین کے کشادہ سینے پر رکھ دیا۔

اپنے دل کی دھڑکنوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی ان دیکھی اور ان جانی مخلوق سحر کی خاموشی
انہیں ایک ہنگامہ بپا کرنے کے بعد اچانک گہری نیند سونگنی ہے۔ لیکن تھوڑی بہرحمد یہ طلسم ٹوٹ جاتا اور خاموشی
دنیا پھر ایک بار نقاروں کی صداؤں اور انسانوں کی چوڑوں سے لبریز ہوجاتی۔ فوج کے افسر اور سپاہی جودن کی مجلس
دینے والی دھوپ میں رات کا انتظار کرتے تھے، رات کی جھپانک اور پراسرار تاریکی میں طلوع سحر کا انتظار کرتے تھے۔
پھر کئی دن کے بعد ایک رات ایسی آتی تھی جب انہیں سحر میں مکمل سکوت ان ہنگاموں سے زیادہ

خوفناک لگتا تھا۔ سپاہی اور ان کے سپہبدار ایسا محسوس کرتے تھے کہ پڑاؤ کے آس پاس ہر جھاڑی اور ہر چٹان
کی اوٹ میں ان کے لاقعدا دشمن کھڑے ہیں۔ لمحات، ساعتیں اور سپر گزرتا ہے، یہاں تک کہ ان پر نیند کا قلبہ
ہونے لگتا۔ اچانک تاریکی میں دکھائی نہ دینے والے انسانوں کا کوئی گروہ جھاڑیوں یا چٹانوں کی آڑ سے نمودار ہوتا
اور پڑاؤ کے کسی حصے میں تباہی مچانے کے بعد دریا کے آس پاس گئی جھاڑیوں اور سرکینڈوں سے پٹی ہوئی ان وسیع
طہلوں میں مدپوش ہوجاتا جہاں ناداقت سپاہیوں کے لئے ان کا بیچا کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

اب دنوں کا سفر ہفتوں میں طے ہوجاتا تھا اور جوں جوں وہ آگے بڑھ رہے تھے ان کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا
ایران کے بہترین سپاہی سرد علاقوں سے آئے تھے اور ان پر گرمی اور مسلسل بے آرامی کے اثرات ظاہر ہورہے تھے
فوجات کا دلولہ بتدیج سرد ہورہا تھا۔ عرب قبائل کے رضا کار ان کے مقابلے میں گرمی برداشت کرنے کے زیادہ
عادی تھے لیکن وہ کسریٰ کی فوجات سے زیادہ لوٹ مار کے شوق میں اپنے گھروں سے نکلے تھے اور اب ان کے
منہ سے اس قسم کی شکایات سنی جا رہی تھیں ”ہم نے مصر فتح کرنے کے لئے ایرانیوں کا ساتھ دینا قبول کیا تھا
لیکن اب ہم مصر کی حدود سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ کسریٰ اگر یہ تمام براعظم فتح کر لے تو بھی اس پر تسلط قائم رکھنا
ممکن نہیں۔ ہمیں واپس جانا چاہیئے اور اس دن کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے جب یہ دیرانے ہمارے قبرستان ہی
بائیں گے۔ اگر کسریٰ کو ہماری خدمات کی ضرورت ہے تو ہم اس کے لئے مغرب کے زرخیز علاقے اور پُردوق
شہر فتح کر سکتے ہیں۔“

فوج کا سپہ سالار ان حالات سے بے خبر نہ تھا لیکن ضرور پرویز کے احکام کے بغیر اسے رکنے یا واپس
ہونے کی اجازت نہ تھی۔

باب

وادنی نیل کے جنوب کی طرف پیش قدمی کرنے والے ایرانی دستے کسی قابل ذکر مزاحمت کا سامنا نہیں
طیب کے قدیم شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ لیکن اس سے آگے مہرائے نوبہ ان سیاہ فام جنگجو قبائل کا مسکن تھا ہواؤند
قدیم میں فرانس کی افواج کا بہترین حصہ ہوتے تھے۔ چنانچہ ایران کا لشکر بائلیوں سے پیش قدمی کرنے کے بعد پہلا
غیر متوقع مشکلات کا سامنا کر رہا تھا۔

اہل نوبہ کی جنگ باقاعدہ افواج کی جنگ سے مختلف تھی۔ یہ لوگ کسی میدان میں جمع ہو کر بار اور جیت
کا فیصلہ کرنے کی بجائے آگ کا حملوں پر اکتفا کرتے تھے۔ فاتح لشکر آگے بڑھتا تو یہ لوگ راستے کی لمبیاں خالی کر کے
بھاگ جاتے۔ دن کے وقت آفتاب کی تمازت سے یہ خطہ ایک جہنم ناز بن جاتا تھا۔ سردیوں کے گھوڑے گر
گر گروم توڑ دیتے اور پیادہ سپاہی چلتے چلتے نیل کے پانی میں کود پڑتے۔ غروب آفتاب کے بعد اس تنگی باری
فوج کو آرام کے لئے چند گھنٹے ملتے لیکن رات کے سناٹے میں اچانک کہیں دور سے نقارے کی صدا بلند ہوتی
اور پھر ان کی ان میں ایسا محسوس ہونے لگتا کہ ساحل دریا کے آس پاس تمام جھاڑیاں اور تمام چٹانیں حرکت میں
آگئی ہیں۔ ہزاروں نقارے ایک ساتھ بجنے لگتے۔ پھر جھپانک تاریکی کے سیلنے سے ایک دل ہلا دینے والی چیخ بلند
ہوتی اور چاروں طرف سے اس کا جواب آنے لگتا۔ اس کے بعد نقاروں کی صدائیں اور انسانوں کی چیخیں اچانک
خاموش ہوجاتیں۔ گہری نیند سے بیدار ہونے والے سپاہی خوف و اضطراب کے عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے اور انہیں نیل کے کنارے میٹنگوں اور جھینگروں کی نہ ختم ہونے والی آگوں

اُس نے ہمیں اطلاع دینے کی ضرورت محسوس نہ کی ہو۔“

عرب نے کہا: ”جناب! عاصم کا مقصد اس علاقے میں دشمن کی صحیح قوت کا اندازہ لگانا تھا، اب اگر اُس کا ایک ساتھی بھی واپس نہ آیا تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ ہمارے لئے آگے بڑھنا کتنا خطرناک ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بڑے عظیم کے تمام باشندے ہمارا راستہ روکنے کے لئے جمع ہو گئے ہیں۔“

دوسرے عرب نے کہا: ”جناب! میں عاصم کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت دور اندیش ہے اور یہ یقین ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کی جانبیں خطرے میں نہیں ڈالے گا۔ ممکن ہے وہ زیادہ دور نکل گیا ہو۔ ہمارے ساتھیوں کو بیکار بیٹھ کر اُس کا انتظار کرنا تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے، اس لئے اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم ارا قیدیوں سے نپٹ لیں۔“

سپہ سالار نے کہا: ”نہیں! قیدیوں کے متعلق ہم نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“

عرب نے حیران ہو کر پوچھا: ”آپ انہیں زندہ رکھنا چاہتے ہیں؟“

سپہ سالار نے جواب دیا: ”میں نے عاصم سے وعدہ کیا تھا کہ قیدیوں کے ساتھ ہمارا سلوک اُس کے مشورے کے مطابق ہوگا۔“

عرب نے کہا: ”جناب! قیدیوں کے متعلق عاصم کا رویہ بہت نرم ہوتا ہے لیکن یہ لوگ اُس کے نزدیک بھی کسی رحم کے مستحق نہیں ہوں گے۔“

”بہر حال ہم اُس سے مشورہ کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔ کاش! ہمیں معلوم ہوتا کہ وہ لوگ اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ عاصم کا رویہ غلام کہاں ہے؟“

ایک افسر نے جواب دیا: ”وہ یہیں ہے جناب! میں نے اُسے پڑاؤ میں دیکھا تھا۔“

سپہ سالار نے مڑ کر اپنے ایک محافظ کی طرف دیکھا اور کہا: ”اُسے بلا لاؤ۔“

سیاہی جھانکتا ہوا عاصم کے خیمے کی طرف بڑھا اور تھوڑی دیر بعد کلاڈیوس کو اپنے ساتھ لے آیا۔ بہ دروازہ قامت و جوان اپنے گئے میں غلامی کا آہنی طوق پہننے کے باوجود مردانہ سن و وقار کا ایک بیکر عم دکھانی دیتا تھا۔ سپہ سالار نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا: ”تم عاصم کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟“

عاصم نے قبائلیوں کے طریق جنگ سے واقف ہوتے ہی سپہ سالار کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بھلائے لئے خیر محفوظ راستوں پر پیش قدمی جاری رکھنے کی بجائے کسی محفوظ مقام پر پڑاؤ ڈال کر ان لوگوں کے غلٹان ٹوڑنا زیادہ ضروری ہے۔ لیکن سپہ سالار کی منزل مقصود ہمیشہ کا دارالحکومت تھا اور وہ کسی تباہی خیز و بے یقینی شہنشاہ کی فتح کا پرچم نصب کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اُس نے عاصم کی تجویز یہ کہہ کر رد کر دی کہ جب ہم حبشہ کی فتح کے بعد حبشہ کے تیرے لوگوں کو سزا دینے کے لئے ہمارے پاس کافی وقت ہوگا۔ لیکن کچھ عرصہ شدید نقصانات اٹھانے کے بعد فوج کے کئی اور افسر عاصم کے ہم خیال بنتے جا رہے تھے۔ سپہ سالار نے مجبوراً فوج کو دریا کے کنارے سے کچھ دور ہٹ کر پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ اور دشمن کے خلاف جوابی کاروائی شروع کر دی۔ رات کے وقت دشمن کو دور رکھنے کے لئے تیرا انداز پڑاؤ کے گرد مورچوں میں بیٹھ جاتے اور صبح ہوتے ہی سواروں کے دستے دشمن کی کمپنیاں کی تلاش میں مختلف سمتوں کی طرف روانہ ہوجاتے۔ پہلے دن ہی کاروائی کے نتائج زیادہ حوصلہ افزانہ تھے۔ ایرانی سوار دریا کے کنارے جھاڑیوں اور سرکندوں سے ڈھکی ہوئی دلدل میں گھسنے یا دریا سے دوران سنگلاخ چٹانوں کا رخ کرنے سے گھبراتے تھے جو دشمن کے قدرتی قلعوں کا کام، دیتی تھیں۔ ان کی کارگزاری چند اڑھی ہوئی بستیوں کو آگ لگانے اور پندرہ بیس عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو گرفتار کرنے تک محدود تھی۔ ایک ٹولی کا یہ دعویٰ تھا کہ اس نے نیل کے کنارے جنگل میں چھپے ہوئے دشمن کے ایک گروہ پر حملہ کر کے کئی آدمی تہ تیغ کر دیئے ہیں۔

دوپہر سے قبل اُن عرب سواروں کے سوا، جو عاصم کی قیادت میں روانہ ہوئے تھے، باقی تمام دستے اپنا آپکے تھے اور فوج پریشانی اور اضطراب کی حالت میں اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ شام کے قریب سپہ سالار خیمے کے باہر اپنے افسروں کے درمیان کھڑا تھا۔ اور جوں جوں سامنے لے ہوتے جا رہے تھے اُس کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑانے کے بعد ایک عرب رئیس سے مخاطب ہو کر کہا: ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ یہ ممکن نہیں کہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا ہو۔ اگر وہ کمپنیاں گھر گئے ہیں تو عاصم اتنا نادان نہیں

یہ پیغام لے گئے ہیں کہ اگر وہ کل تک میاں آگرا اس بات کی ضمانت دیں کہ اس کے بعد راستے میں ہم پر کوئی حملہ نہیں ہوگا تو تمام قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔

”اور ہمیں یقین ہے کہ ان کے سردار تمہارا پیغام سن کر ہمارے پاس آجائیں گے؟“

عاصم نے جواب دیا ”ان لوگوں کا ایک بااثر سردار ہماری قیدی میں ہے اور میں نے اسی سے گفتگو کرنے کے بعد باقی سرداروں کو پیغام بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم اس علاقے پر قبضہ کرنے کی نیت سے آئے ہیں۔ لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوگا کہ ہماری منزل مقصود حبشہ ہے تو یہ راستے میں ہم سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔“

سپر سالار نے کہا ”مجھے یقین نہیں آتا کہ ہماری نرمی ان دشمنوں پر کوئی اچھا اثر ڈال سکتی ہے، بہر حال میں تمہاری رائے سے اختلاف نہیں کرتا۔ لیکن اب ہمیں تمہارے علاج کی فکر کرنی چاہیے۔ تمہارے زخم سے ابھی تک خون رس رہا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔“

”نہیں جناب! اب میرے لئے چند قدم پیہل چلانا زیادہ آسان ہوگا۔“ عاصم یہ کہہ کر اگے بڑھا لیکن چند قدم اٹھانے کے بعد اس کی ٹانگیں روکھڑانے لگیں۔ کلاڑیوں نے آگے بڑھ کر اُسے سہارا دینے کی کوشش کی۔ لیکن عاصم نے اُسے ایک طرف ہٹا دیا۔

تھوڑی دیر بعد طبیب عاصم کے زخم پر نئی پٹی باندھ رہا تھا اور چند افسر اُس کے گرد کھڑے تھے۔ سپر سالار نیچے میں داخل ہوا اور اُس نے طبیب سے مخاطب ہو کر پوچھا ”اسے کوئی خطرہ تو نہیں؟“

”نہیں، جناب! یہ بہت خوش نصیب ہیں۔ اگر دشمن کا نیزہ سپیلوں کے اوپر سے پھسلنے کی بجائے سیدھا لگتا تو ان کے بچنے کی کوئی امید نہ ہوتی۔“

سپر سالار نے عاصم سے کہا ”تمہارے ساتھی قیدیوں کو زندہ رکھنے کے سخت محالفت ہیں۔ ہم نے بڑی مشکل سے اُن کا جوش و خروش ٹھنڈا کیا ہے۔“

”جناب! انہیں یہ معلوم نہیں کہ قیدیوں کو کل تک زندہ رکھنا ہمارے لئے کتنا ضروری ہے۔ آپ فرج کو حکم دے دیجئے کہ انہیں ہر ممکن آرام پہنچانے کی کوشش کی جائے۔“

ساتھ ساتھ ہوں۔

تھوڑی دیر بعد سیکورٹس سپاہی اُن کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ سپر سالار مانتا ہنڑا اگے بڑھا۔ عاصم لے جیتے ہی گھوڑے سے اتر پڑا اور ادب سے سلام کرتے ہوئے بولا ”جناب اگر آپ کو میری وجہ سے کوئی پریشانی ہوئی ہے تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔“

سپر سالار نے کہا ”میں یقیناً بہت پریشان تھا۔ لیکن اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ تم زخمی ہو کر آئے ہو اور تمہیں طبیب کی ضرورت ہے۔“

عاصم نے کہا ”جناب میرا زخم بہت معمولی ہے۔“

سپر سالار نے کہا ”مجھے یقین تھا کہ تم کوئی اہم خبر لے کر واپس آؤ گے۔“

عاصم بولا ”جناب! اس جہم میں ہمارے سات آدمی کام آئے ہیں اور دس زخمی ہوئے ہیں۔ دشمن کے نقصانات ہم سے بہت زیادہ تھے۔“

سپر سالار نے پوچھا ”قیدیوں کی تعداد کتنی ہے؟“

عاصم نے جواب دیا ”ہم نے پچھن آدمی گرفتار کئے تھے لیکن راستے میں تین قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔“

سپر سالار نے کہا ”ہمارے پاس چند قیدی اور جرمی ہیں اور ہمیں سونے سے پہلے ان کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔“

عاصم نے کہا ”اگر میں ان کے متعلق کچھ کہنے کا حق رکھتا ہوں تو میری یہ درخواست ہے کہ ان کا فیصلہ کل پھر دیا جائے اور آج رات انہیں کوئی تکلیف نہ دی جائے۔“

سپر سالار نے کہا ”میں جانتا ہوں کہ تم قیدیوں کے معاملے میں بہت رحم دل ہو لیکن یہ لوگ کسی اچھے سلوک کے مستحق نہیں۔“

ایک عرب نے کہا ”ہمیں ان لوگوں کو پڑاؤ میں لے جانے کی بجائے یہیں قتل کر دینا چاہیے۔“

عاصم نے کہا ”اگر انہیں قتل کر کے ہمیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا تو میں آپ کو منع نہ کرتا لیکن ہمارا فائدہ اسی میں ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔ میں نے جن تین قیدیوں کو رہا کیا ہے وہ اپنے سرداروں کے پاس

”تم فکر نہ کرو میں اُن کے لئے بہترین کھانا بہتیا کرنے کا حکم دے چکا ہوں، لیکن اگر کل تک ان لوگوں کے سردار یہاں نہ پہنچے تو ہمارے لئے قیدیوں کو ٹھکانے لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔“

سپہ سالار یہ کہہ کر خیمے کے دروازے کی طرف بڑھا لیکن اچانک کچھ سوچ کر رک گیا اور عاصم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تمہارے گھوڑے کا سن کر بہت افسوس ہوا ہے اور میں تمہیں اس کے بدلے اپنا بہترین گھوڑا پیش کروں گا۔“

سپہ سالار خیمے سے باہر نکل گیا۔ طیب نے عاصم کی مرہم پٹی سے فارغ ہو کر اُس کے تیار دواؤں کی طرف دیکھا اور کہا ”میرے خیال میں اب انہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ وہ یکے بعد دیگرے باہر نکل گئے۔

مختوڑی دیر بعد کلاڈیوس نے کھانا لاکر عاصم کے سامنے رکھ دیا۔ عاصم نے چند نالے کھائے، پانی پیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

”کلاڈیوس! اُس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔“ مجھے زخمی ہونے کے بعد سب سے پہلے تمہارا خیال آیا تھا، اور راستے میں بھی یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں ہلاک ہو جاتا تو تم پر کیا گزرتی۔ اگر مجھے یہ اطمینان ہوتا کہ راتے میں تمہیں کوئی خطرہ پیش نہ آئے گا تو میں اسی دقت تمہیں آزا کر دیتا اور مجھے اس بات کی پروا نہ ہوتی کہ سپہ سالار میرے متعلق کیا خیال کرے گا۔“

کلاڈیوس نے کہا ”میں راستے میں کسی ایرانی کے ہاتھوں ہلاک ہونے کی بجائے آپ کے غلام کی کشتیت سے زندہ رہنا بہتر سمجھتا ہوں۔“

”تم میرے غلام نہیں ہو، کلاڈیوس!“

کلاڈیوس نے اسے امانندی سے عاصم کی طرف دیکھا اور کہا ”اگر میں اپنے دل کی بات کہوں تو آپ براؤ نہیں مانیں گے۔“

”ہرگز نہیں۔“

کلاڈیوس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا ”اگر میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی نہیں کی تو آپ اُن لوگوں سے مختلف ہیں، جنہیں صرف انسانی خون کی پیاس تلوار اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ آپ جس قدر بہادر

ہیں اسی قدر رحم دل ہیں۔ آج قیدیوں کے ساتھ آپ کا سلوک میرے لئے غیر متوقع نہ تھا۔ لیکن یہ بات میرے جہ میں نہیں آسکی کہ اس جنگ سے آپ کی دلچسپی کی وجہ کیا ہیں۔ آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہ بات پوچھنے کے لئے میں آپ کے زخمی ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ آج جب میں سرداروں کو آتے دیکھ رہا تھا تو آپ کا گھوڑا نائب تھا اور میرے دل میں یہ غم شہ پید ہو گیا تھا کہ شاید آپ واپس نہیں آئے۔ اور پھر جب طیب آپ کے زخم کا معائنہ کر رہا تھا تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان ہمیشہ کسی مقصد کے لئے جان دینا پسند کرتا ہے یا ناپول بمقصد دنیا میں اپنے شہنشاہ کی فتوحات کے پرچم لہرانا ہے۔ رومیوں کا مقصد دنیا میں اپنے اقتدار کی حفاظت ہے۔ یہودی یہ سمجھ کر ایرانیوں کا ساتھ دے رہے ہیں کہ شاید رومی سلطنت کے کسی کھنڈ پر انہیں اپنے لئے کوئی عمارت کھڑی کرنے کا موقع مل جائے۔ عرب سے جو رضا کار ایرانیوں کے حلیف بن کر آئے ہیں وہ کشت و خون اور لوٹ مار سے آگے نہیں سوچتے۔ لیکن آپ کے متعلق مجھے اس بات کا یقین ہے کہ آپ ظالم کے دوست اور مظلوم کے دشمن نہیں ہو سکتے۔ آپ کو لوٹ مار سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایرانی فوج جب کسی خطرے کا سامنا کرتی ہے تو آپ سب سے آگے ہوتے ہیں؟“

عاصم نے اضطراب کی حالت میں آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک خاموش پڑا رہا۔ بالآخر اُس نے کلاڈیوس کی طرف دیکھا اور کہا ”کلاڈیوس! میری زندگی دوستی اور دشمنی کے جذبات سے خالی ہے۔ چند سال پہلے میری تمام خواہشیں اپنے قبیلے کی عزت کے لئے لڑنے یا اپنے عزیزوں اور دوستوں کے قتل کا انتقام لینے تک محدود تھیں۔ پھر چند ایسے واقعات پیش آئے کہ میری دنیا یکسر بدل گئی۔ مجھے اپنے اسلاف کی روایات سے بغاوت کے جرم میں اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ تم میری تمام سرگزشت سُن چکے ہو۔ سین سے ملاقات کے بعد میری زندگی کا نیا دور شروع ہوا، اور میں نے ایک سپاہی کی حیثیت سے اپنے عمن کی بلند ترین توقعات پورا کرنا اپنا مقصد حیات بنالیا۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میں نے اپنے لئے جو نیا راستہ منتخب کیا ہے وہ غلط ہے لیکن میرے لئے اور کوئی راستہ نہیں۔“

کلاڈیوس نے کہا ”فرض کیجئے، اگر سین ایک ایرانی کی بجائے ایک شامی یا رومی ہوتا تو کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اس وقت آپ ایرانیوں کی بجائے رومیوں کے ساتھی ہوتے؟“

عاصم نے برم ہو کر کہا۔ "کلاڈیوس مجھے پریشان نہ کرو، جاؤ سو جاؤ!"

"میں معافی چاہتا ہوں۔ کلاڈیوس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ مجھے اپنے دل کی بات کہنے کی اجازت نہ دیتے تو مجھ سے یہ گستاخی نہ ہوتی۔"

عاصم نے قدر سے نرم ہو کر کہا۔ "نہیں، نہیں کلاڈیوس بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ لیکن تم جانتے ہو کہ اب اپنا راستہ تبدیل کرنا میرے بس کی بات نہیں۔"

کلاڈیوس بیٹھ گیا اور چند ثانیے خاموشی سے عاصم کی طرف دیکھتا رہا۔ بالاخر اُس نے کہا۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آپ اُن لوگوں سے مختلف ہیں جو ساری عمر تک بے بند کئی غلط راستے پر چل سکتے ہیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو آپ اپنی قبائلی روایات سے بناوٹ نہ کرتے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کسی دن آپ کو یہ جنگ عرب کی قبائلی جنگوں سے زیادہ بے مقصد محسوس ہوگی۔"

عاصم نے کہا۔ "میں ایرانی فوج کے ساتھ وفاداری کا عہد کر چکا ہوں اور تم مجھے خدا بننے کا مشورہ نہیں دے سکتے۔"

"کیا آپ نے اپنے قبیلے کے ساتھ وفاداری کا عہد نہیں کیا؟"

"کلاڈیوس تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایرانی فوج کے کارناموں سے آپ جیسے انسان کا ضمیر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آئے گا جب آپ کی بے مین مدح آپ کو کوئی نیا راستہ تلاش کرنے پر مجبور کرے گی۔ میں اکثر یہ سوچا کرتا ہوں کہ جو شخص کسی مقصد کے بغیر اس قدر بہادری سے لڑ سکتا ہے وہ کسی مقصد سے آشنا ہونے کے بعد کیا نہیں کر سکتا۔ آپ کو فتوحات کا شوق یہاں تک لے آیا ہے لیکن اگر انسان کا ضمیر مطمئن نہ ہو تو اُس کی فتوحات بے معنی ہیں۔ سین اس بات پر مطمئن ہو سکتا ہے کہ اُس نے بے یار و مددگار انسان کو شہرت و ناموری کے راستے پر ڈال کر اُس کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہے اور اُس کی بیٹی بھی اس بات پر خوش ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب آپ شاندار فتوحات حاصل کرنے کے بعد واپس جاپاؤ۔ سین آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنے پر آمادہ ہو جائے لیکن مجھے اس بات کا اندیشہ ہے

سب باتوں کے باوجود آپ کا ضمیر مطمئن نہیں ہوگا۔"

عاصم نے کہا۔ "تمہارے خیال میں میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟"

کلاڈیوس نے جواب دیا۔ "آپ کی سرگزشت سننے کے بعد میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ وہ کم سن لڑکی ہے آپ نے دمشق کے راستے میں دیکھا تھا آپ کی امیدوں کا مرکز بن چکی ہے اور میرے لئے یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں کہ آپ نے دل میں شہرت و ناموری کی تقاسیم سے کہیں زیادہ اُس کی بیٹی نے پیدا کی ہے۔"

عاصم نے کہا۔ "کلاڈیوس! میں تمہاری بات سے انکار نہیں کرتا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ جب میں اپنے مال اور مستقبل سے مایوس تھا تو فلسطین نے میرے دل میں زندگی کی دھڑکنیں بیدار کی تھیں۔ اُس نے مجھے احساس دلایا تھا کہ میں عام انسانوں سے مختلف ہوں۔ اور میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں اُس کی بلند ترین توقعات پوری کر سکتا ہوں، لیکن اگر میں یہ سمجھوں کہ عظیم ترین فتوحات حاصل کرنے کے بعد بھی میں سین کی بیٹی کے لئے ہاتھ پھیلا سکتا ہوں تو مجھ سے بڑا احمق کوئی نہیں ہو سکتا۔ رات کا مسافر چاند کی روشنی میں اپنا راستہ دیکھ سکتا ہے لیکن اُسے نوچنے کی کوشش حماقت کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ جب میں پہلی مرتبہ بس کے ہمراہ عازِ جنگ کی طرف روانہ ہوا تھا تو میرے خیالات یہی تھے کہ جب میں فتوحات کے پرچم لہراتا ہوا واپس آؤں گا، تو فلسطین میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ لیکن یہ ایک دیوانے کے خواب تھے۔ اب مجھے ان خیالات پر ہنسی آتی ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ سین نے مجھے اپنے گھر کی چار دیواری سے دور رکھنے کے لئے مصر کی طرف پیش قدمی کرنے والی فوج کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ کلاڈیوس! جب میں گھر سے نکلا تھا تو میری تمام خواہشیں صرف زندہ رہنے تک محدود تھیں، اُس وقت میں کسی کی بیٹریں پر اکر بھی مطمئن رہ سکتا تھا لیکن فلسطین کی دُنیا میں چند سانس لینے کے بعد میرے لئے گناہی اور بے چارگی کی زندگی پر قناعت کرنا ممکن نہ تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے جو راستہ اختیار کیا ہے اُس کی آخری منزل کیا ہوگی، لیکن اب میں اتنی دُور آچکا ہوں کہ میرے لئے یہ راستہ بلاناؤ دور کا رملرک پہنچے دیکھنا بھی ممکن نہیں۔"

کلاڈیوس نے کہا۔ "آپ چند عادات کے نتیجہ میں یہاں تک پہنچے ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک حادثہ آپ کی زندگی کا دھارا بدل دے۔ اس فوج کے حالات مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ آپ کے سپاہیوں کو گریز

کا شدت اور طرح طرح کی بیماریوں نے نڈھال کر دیا ہے۔ ایک عام سپاہی سے لے کر سپہ سالار تک ہر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ سب کچھ کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے کئی آپ کے لئے ایک تشریح ناکام سر بن چکی ہے اور اب آپ کے راستے میں وہ شہر نہیں ہوں گے جہاں لوٹ مار سے یہ لوگ اپنا پیٹ بھر سکیں۔

مجھے اندیشہ ہے کہ جب یہ بددوں اور مایوس لشکر ہمیشہ کی حدود میں داخل ہو گا تو اس کا مقابلہ ان غیر منظم قبائل کی بجائے اس منظم فوج سے ہو گا جس کا ہر سپاہی اپنے وطن کی آزادی کے لئے موت و حیات سے بے پروا ہو کر لڑنے کا۔ پھر آپ کو اگر کسی میدان سے پسپا ہونا پڑا تو ہمیشہ کے سپاہی طیبہ تک آپ کا پچھا کریں گے۔ کسریٰ کو اس بات کی پروا نہ ہوگی کہ اس لشکر کے بیشتر سپاہی اس کی ہوس ملک گیری کی نذر ہو چکے ہیں۔ اور ان کی لاشیں دیلینے نیل کے کنارے بکری ہوئی ہیں۔ بلکہ اس کے سامنے صرف یہ مسئلہ ہو گا کہ جو لوگ زندہ واپس آگئے ہیں ان کے لئے بدترین سزا کیا ہو سکتی ہے؟

فاسم کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا اور لڑا۔ کلاڈیوس! تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہو۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ میں تمہاری باتوں سے مرعوب ہو جاؤں گا تو کان کھول کر سن لو کہ ہمیشہ تک فتاح حفر قریب ہمارے قدموں میں ہو گا۔ ہم شکست کھا کر بھاگنے کی نیت سے اتنی دور نہیں آئے۔

کلاڈیوس نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا: اگر آپ کو شکست یا پسپائی کا لفظ اس قدر بڑا محسوس ہوتا ہے تو میں معافی نہ خواہتا ہوں۔ لیکن فرض کیجئے آپ ہمیشہ فرخ کر لیتے ہیں اور صرف ہمیشہ ہی نہیں بلکہ سارے براعظم میں بسنے والے انسانوں کو باندھ کر کسریٰ کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں تو بھی آپ کو اس سے کیا حاصل ہو گا؟ کیا وہ مجموعی حکمران جو ساری دنیا پر تسلط جمانے کے خواب دیکھ رہا ہے، آپ سے مزید فتوحات کا مطالبہ نہیں کرے گا؟ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کسریٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے آپ کب تک نسلوں کی لاشیں روندتے رہیں گے؟ آپ کو متوجہ حاکم میں ایرانیوں کے مظالم کا اعتراف ہے اور آپ یقیناً اس خوشنودی میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ جب ساری دنیا کسریٰ کی غلام بن جائے گی تو ظالم اور مظلوم کی یہ داستان ختم ہو جائے گی۔ آپ دو قبیلوں کی نہ ختم ہونے والی جنگ کی ہولناکیوں سے دل برداشتہ ہو کر وطن سے نکلے تھے۔ کیا ایران اور روم کی یہ جنگ اس سے کہیں زیادہ ہولناک نہیں۔ میں یہ کیسے یقین کر سکتا ہوں کہ وہ فرعون جس نے ایک ذہنی

دشمن کی فریاد سے متاثر ہو کر اپنے قبیلے کی تمام روایات کو ٹھکرا دیا تھا۔ کروڑوں انسانوں کو ایران کے آہنی استبداد کی جلی میں پستو دیکھ کر مطمئن نہ سکے گا۔ جس دن آپ اپنے میری جان بچانی تھی آپ میرے لئے ہمتا تھے۔ یہ بات میری بھی ہے۔ بالآخر تھی کہ کسریٰ کی فوج کے ایک سپاہی کے دل میں رحم اور موت کے جذبات بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایک نیک دل انسان اپنا راستہ معمول کر چھڑیوں کے گردہ میں شامل ہو گیا ہے اور میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی نہیں کی تو وہ وقت دور نہیں جب آپ اپنا راستہ تبدیل کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

عاصم نے کرب انگیز لہجے میں کہا: ”مجھے پریشان نہ کرو۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”مجھے معلوم نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آپ کا سپہ سالار کسی بڑی ملک کے بغیر اس جہم کی کامیابی پر یقین نہیں رکھتا۔ اُسے ابھی تک یہ اُمید ہے کہ شاید کسریٰ مزید پیش قدمی کے متعلق اپنا سابقہ حکم منسوخ کر دے اور وہ ایک شکست خوردہ جزیریل کے انجام سے بچ جائے۔ اُس کے افسر اور سپاہی اُس سے کہیں زیادہ پریشان ہیں۔ آپ کی بدولت عرب رضا کاروں کے حوصلے قائم ہیں لیکن ہمیشہ کے حالات سے اپنی ذاتی وابستگی کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے حوصلے زیادہ عرصہ قائم نہیں رہیں گے۔ ممکن ہے وہ آپ سے بناوٹ نہ کریں لیکن ایسا وقت آسکتا ہے کہ آپ کا آخری ساتھی دم توڑتے وقت آپ سے یہ پوچھے کہ ہماری جنگ کس مقصد کے لئے تھی۔ اور آج یہ سوچنا آپ کا کام ہے کہ آپ اُسے کیا جواب دے سکیں گے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔“

کلاڈیوس یہ کہہ کر اٹھا اور نیچے کے دروازے کے سامنے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا، لیکن عاصم کی آنکھوں میں نیند نہ تھی، اُس کے کانوں میں کلاڈیوس کے الفاظ گونج رہے تھے اور وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس پر اسرار نوجوان سے پہلی بار متعارف ہوا ہے۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت پڑا اور پھر اُسے سردی محسوس ہونے لگی اور ایک ساعت بعد وہ ایک اونچی چادر اوڑھ لینے کے باوجود بڑی طرح کانپ رہا تھا۔ اُس نے کلاڈیوس کو آوازیں دے کر جگایا اور پانی لانے کے لئے کہا۔ کلاڈیوس نے حکم کی تعمیل کی۔ عاصم نے پانی پینے کے بعد کہا: ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہاری نیند خراب کی ہے۔“

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟“ اُس نے پوچھا۔

عاصم نے بستر پر لیٹتے ہوئے جواب دیا ”مجھے سردی محسوس ہو رہی ہے“

کلاڈیوس نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”آپ کو بخار ہے“

”میرا سر بھاری ہو رہا ہے اور میں اپنے تمام پٹھوں میں درد محسوس کر رہا ہوں۔“

کلاڈیوس کے لئے یہ علامتیں نئی نہ تھیں اُس نے مضطرب ہو کر کہا ”میں طبیب کو بلاتا ہوں“

”نہیں اس وقت طبیب کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس بخار میں مبتلا ہونے والے

کسی سپاہی کو اُس کی دوا سے شفا یاب ہوتے نہیں دیکھا۔ تم پانی کا مشکیزہ میرے قریب رکھ دو اور آرام سے

سو جاؤ۔“

کلاڈیوس نے اُس کے قریب بیٹھے ہوئے کہا ”آپ میری فکر نہ کریں، میں دن میں کافی سوچا ہوں“

کلاڈیوس باقی رات عاصم کے قریب بیٹھا رہا۔ علی الصباح ایک عرب جھانگتا ہوا خیمے میں داخل ہوا اور اُس نے کہا ”عاصم آپ کا خیال درست نکلا۔ اس علاقے کے آٹھ سردار آگئے ہیں۔“ عاصم کا چہرہ بخار سے تھما رہا تھا، تاہم اُس نے جلدی سے اٹھ کر بیٹھے ہوئے سوال کیا ”کہاں ہیں وہ؟“

”پہریدار انہیں سپہ سالار کے خیمے کی طرف لے گئے ہیں۔“

عاصم نے مشکیزہ اٹھا کر پانی کے چند گھونٹ پیئے اور پھر چوتھا پہن کر کھڑا ہو گیا۔

کلاڈیوس نے کہا ”اس حالت میں آپ کو باہر نہیں جانا چاہیئے۔ اگر آپ اُن لوگوں سے بات کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو انہیں یہاں بلایا جاسکتا ہے۔“

”نہیں! اس ملاقات کے لئے سپہ سالار کا خیمہ زیادہ موزوں ہے۔“ عاصم یہ کہہ کر خیمے سے باہر نکل آیا اور عرب اور کلاڈیوس اُس کے ساتھ ہوئے۔ بخار کی شدت سے عاصم کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ کلاڈیوس نے اُسے بڑھ کر اُسے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن عاصم نے اُسے ایک طرف ہٹانے ہونے کہا ”نہیں، کلاڈیوس ابھی مجھے تمہارے سہارا سے کی ضرورت نہیں۔“

تھوڑی دیر بعد عاصم سپہ سالار کے خیمے کے قریب پہنچا تو باہر سپاہیوں کا جھوم کھڑا تھا۔ ایک ایرانی افسر نے کہا ”سپہ سالار کا خیال تھا کہ آپ کو تکلیف ندری جائے۔ لیکن یہ اچھا ہوا کہ آپ آگئے۔“

”آپ تمام قیدیوں کو یہاں لے آئیں اور انہیں خیمے کے باہر بٹھادیں۔“ عاصم یہ کہہ کر کشادہ خیمے میں داخل

باب ۲۵

ہوا۔ قبائلی سردار سپہ سالار کے سامنے ایک خوبصورت قاتلین پر بیٹھے تھے۔ اور وہ طیبہ کے ایک قیدی کی دسالت سے ان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ عاصم کو دیکھتے ہی سپہ سالار نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ آگے بڑھ کر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔

سپہ سالار نے کہا: ”عاصم! میرا خیال تھا کہ تمہیں تکلیف نہ دی جائے لیکن اب تم آبی گئے تو تمہیں ان لوگوں سے گفتگو کرنے کا اختیار دیتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ میں ان لوگوں سے طویل گفتگو کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“ یہ کہہ کر عاصم مترجم کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم ان لوگوں سے کہو کہ ہماری جنگ صرف حبشہ کے ساتھ ہے، اگر تم پر امن رہنے کا وعدہ کر دو تو ہمارا نظر راستے میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرے گا اور ہم کسی چھیڑ چھاڑ کے بغیر یہاں سے گزر جائیں گے۔ لیکن اگر تم نے ہمارے ساتھ الجھنے کی کوشش کی تو تمہاری تمام بستیاں تباہ کر دی جائیں گی۔ تمہیں ہماری قوت کا اندازہ نہیں، ایران کا شہنشاہ کئی ملک فتح کر چکا ہے۔ رومی سلطنت تباہ ہو چکی ہے اور ان کے دارالحکومت پر ہمارا قبضہ ہونے والا ہے۔ ہم نے حبشہ پر اس لئے چڑھائی کی ہے کہ وہاں کا حکمران رومیوں کا حلیف ہے۔ تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔“

مترجم کچھ دیر قبائلی سرداروں سے بحث کرتا رہا۔ بالآخر اُس نے عاصم سے کہا: ”جناب! یہ کہتے ہیں کہ ہمارے جو آدمی قیدی بنا کر یہاں لائے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ آپ نے کیا سلوک کیا ہے؟“

عاصم نے جواب دیا: ”اگر ہمیں یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ لوگ ہمیں دوبارہ پریشان نہیں کریں گے تو قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ اور ہمیں اطمینان دلانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ یہ اپنے چند قابل اعتماد آدمی ہمارے ساتھ روانہ کر دیں۔“

طیبہ کے قیدی نے عاصم کی ترجمانی کر دی اور اس کے بعد قبائلی سردار دیر تک ایک دوسرے سے بحث کرتے رہے۔ سپہ سالار ان کا جوش و خروش دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔ بالآخر ایک بوڑھے سردار نے مترجم کی دسالت سے کہا: ”ہمیں آپ کی شرط منظور ہے لیکن ہم صرف اپنے قبائل کو پر امن رکھنے کا ذمہ لے سکتے ہیں۔ اپنے علاقے سے آگے ہمارا کوئی آدمی آپ کے ساتھ دینے کو تیار نہ ہوگا۔ ہماری ایک شرط یہ بھی ہے:“

ہمیں مدد سے گزرتے ہوئے آپ کسی جگہ ایک دن سے زیادہ قیام نہیں کریں گے۔

سپہ سالار نے جواب دیا: ”ہماری خود اپنی یہ خواہش ہے کہ ہم کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے گزر جائیں۔ اس کے بعد فریقین کا لب و لہجہ انتہائی دوستانہ تھا، اور گفتگو کے اختتام پر سپہ سالار ان سرداروں میں ریشم کے کپڑوں، تلواروں اور چاندی کے ظروف کے تحائف تقسیم کر رہا تھا۔

جب یہ لوگ نیچے سے باہر نکلے تو قیدی اپنے سرداروں کی طرف دیکھ کر شور مچانے لگے۔ ایک درانقاہ جوان قیدیوں کی صف سے نکل کر جھانکا ہوا آگے بڑھا اور بے اختیار ایک سردار سے لپٹ گیا پھر اُس نے ہاتھ سے عاصم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا اور بوڑھے سردار نے اصمانندی سے عاصم کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”تم نے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے اور آج سے میرا راقیبہ تمہارا دوست ہے۔“

عاصم نے سپہ سالار سے مخاطب ہو کر کہا: ”مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ جوان ایک سردار کا بیٹا ہے۔ اس نے میرا گھوڑا ہلاک کیا تھا اور میں اسے بدترین سزا کا مستحق سمجھتا تھا لیکن جب یہ گرفتار ہوا تو اپنی ہم سے بہترین نتائج پیدا کرنے کی خواہش میرے تمام ارادوں پر غالب آگئی۔“

سپہ سالار نے کہا: ”تم نے بہت اچھا کیا اور میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“

”لیکن اب تم اپنے نیچے میں جا کر آرام کرو۔ تمہارا چہرہ تمہاری تکلیف کا پتا دے رہا ہے۔“

عاصم وہاں سے چل دیا۔ طیبہ اور گلاڈیوس جو تماشائیوں کے ہجوم سے ایک طرف ہٹ کر باتیں کر رہے تھے۔ جلدی سے آگے بڑھ کر اُس کے ساتھ ہوئے۔ عاصم طیبہ کی طرف متوجہ ہوا تو اُس نے شکایت کے لہجے میں کہا: ”آپ کا غلام کہتا ہے کہ آپ نے رات سخت تکلیف میں گزار دی ہے، آپ نے مجھے بلایا ہوتا۔“

”آدمی رات کے وقت آپ کو تکلیف دینا مناسب نہ تھا۔ پھر مجھے یہ بھی خیال تھا کہ چند زخمی کی حالت مجھ سے زیادہ خراب ہے اور وہ آپ کی توجہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ مجھے اپنے زخم سے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ صرف بخار سے نڈھال ہو گیا ہوں۔“

طیبہ نے عاصم کا ہاتھ پکڑ کر اُس کی نبض دیکھی اور کہا: ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کا بخار اتنا شدید ہے تو میں آپ کو بستر سے اٹھنے کی اجازت نہ دیتا، میں ابھی دوا لے کر آتا ہوں۔“

طیب یہ کہہ کر ایک طرف چلا گیا۔ عاصم نے اپنے نیچے کی طرف چند قدم اٹھائے لیکن اُس کی ہمت جواب دے رہی تھی اور جب کلاڈیوس نے آگے بڑھ کر اُسے سہارا دینے کی کوشش کی تو اُس نے احتجاج نہ کیا۔ اپنے نیچے کے اندر داخل ہوتے ہی وہ بستر پر لیٹ گیا۔

طیب کو عاصم کی اہمیت کا احساس تھا اور وہ عقورے عقورے وقفے کے بعد اُس کی خبر گیری کے لئے آتا رہا۔ لیکن اُس کی ساری کوششوں کے باوجود عاصم کے بخار میں کوئی افاق نہ ہوا۔ عاصم کے دوست بھی باری باری اُس کی تیمارداری کے لئے آتے رہے۔ سپرہر کے وقت طیب نے عاصم کو دوا پلانے کے بعد کہا: ”پلا نے تین مرتبہ مجھے بلا کر آپ کے متعلق پوچھا ہے اور اب وہ بذاتِ خود یہاں آ رہے ہیں“

عاصم نے کہا: ”انہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی“

”وہ کل صبح یہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور جب سے میں نے انہیں یہ بتایا ہے کہ کل آپ سفر کرنے کے قابل نہیں ہوں گے اس وقت سے وہ بہت پریشان ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی حالت دیکھنے کے بعد وہ اپنا ارادہ ملتوی کر دیں گے“

”نہیں میری خاطر انہیں اپنا ارادہ ملتوی نہیں کرنا چاہیے۔ فوج کو جلد از جلد کسی ایسے مقام پر پہنچنے کی ضرورت ہے۔ جہاں سپاہیوں کے لئے رسد اور گھوڑوں کے لئے چارے کا انتظام ہو سکے“

طیب نے کہا: ”سپہ سالار کے ساتھ وہ بڑھا سردار بھی آپ کی تیمارداری کے لئے آ رہا ہے جس کے بیٹے نے آپ کا قیمتی گھوڑا ہلاک کیا تھا“

”وہ لوگ ابھی تک گئے نہیں؟“

”دوسرے سردار قیدیوں کے ساتھ چلے گئے ہیں لیکن یہ باپ اور بیٹا چند منزل فوج کا ساتھ دیں گے۔ انہوں نے ایک دن کے لئے سپہ سالار کو اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی ہے۔ اور سپہ سالار نے اس شرط پر یہ دعوت قبول کر لی ہے کہ وہ ہمیں اس خطرناک علاقے سے گزرنے میں مدد دیں گے۔ ان جنگجو لوگوں کے طرز عمل میں تبدیلی کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ نے ایک بااثر سردار کے بیٹے کے ساتھ نیک سلوک کیا ہے“

سپہ سالار، عیشی سردار اور اُس کے بیٹے اور طیب کے اُس قیدی کے ساتھ جس نے صبح کی ملاقاتیں

مترجم کا فرض ادا کیا تھا۔ عیسیٰ کے اندر داخل ہوا اور عاصم اٹھ کر بیٹھا۔

”تم بیٹے ہو عاصم“ اُس نے کہا ”اب تمہارا کیا حال ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں“ عاصم نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

”تم ٹھیک نہیں ہو اور میں تمہارے متعلق بہت فکر مند ہوں۔ ہمیں کل یہاں سے کوچ کرنا ہے۔ لیکن تم شاید

چند دن اور سواری نہ کر سکو۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ تمہارے لئے کشتی کا انتظام کر دیا جائے۔ ان لوگوں نے ایک کشتی اور چند تجربہ کار ملاح فراہم کرنے کا انتظام کیا ہے“

عاصم نے جواب دیا: ”پانی کے بہاؤ کے خلاف کشتی کی رفتار بہت سست ہوگی اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو میری وجہ سے بار بار راستے میں رکنا پڑے پھر میری حالت ابھی ایسی نہیں کہ میں گھوڑے پر سواری نہ کر سکوں۔ اگر میں نے راستے میں زیادہ تکلیف محسوس کی تو میں ایک بیکار آدمی کی حیثیت سے آپ کا ساتھ دینے کی بجائے چند دن کے لئے کسی جگہ رک جاؤں گا۔ موجودہ حالات آپ کو مزید وقت ضائع کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر چند دن تک سیلاب کا موسم شروع ہو گیا تو یہ سارا علاقہ دلدل بن جائے گا۔ اور آپ کے لئے رسد کا مسئلہ اور زیادہ نازک صورت اختیار کر لے گا“

سپہ سالار نے عمر رسیدہ سردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”یہ اس علاقے کا سب سے زیادہ بااثر سردار ہے۔ اور تمہاری تیمارداری کے لئے آیا ہے“

عاصم نے سردار کی طرف دیکھا اور کہا: ”میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“ مترجم نے عاصم کے الفاظ کا مطلب بیان کیا تو اُس نے اپنے گلے سے مختلف رنگوں کے چکدار پتھروں کا تارا تارا اور آگے بڑھ کر عاصم کے گلے میں ڈال دیا۔

عاصم نے مترجم کی طرف دیکھا تو اُس نے کہا: ”یہ لوگ کسی کو اس سے بڑا انعام نہیں دے سکتے۔ آپ کو ہار پہنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس سردار نے آپ کو اپنے اقتدار میں حصہ دار بنا لیا ہے۔ آج سے آپ کے دوست اس کے قبیلے کے دوست اور آپ کے دشمن اس کے دشمن ہوں گے اور صرف یہی نہیں بلکہ جو قبائل ان کے حلیف ہیں وہ بھی یہ نشانی دیکھنے کے بعد آپ کو اپنا دوست سمجھیں گے“

عقورے دیویر بعد سپہ سالار اور اُس کے سامنے چلے گئے اور عاصم لیٹ گیا۔ سارے دن اُسے تیز بخار چاہا

سردار نے جواب دیا۔ ”میں اسے متوڑی دودھ دیا کے کنارے ایک بستی ہے اور وہاں سے ایک کشتی مل سکتی ہے لیکن اس فوجان کو ایسی حالت میں آگے لے جانا خشک نہیں۔ اگر آپ مجھ پر اعتماد کریں تو میں اسے اپنی بستی میں پہنچا دیتا ہوں۔ ہم اس موسمی بخار کا علاج جانتے ہیں۔ بخار اترنے کے بعد جب یہ سواری کے قابل ہو جائے گا تو میرے آدمی اسے آپ کے پاس پہنچا دیں گے۔“

طیب نے کہا۔ ”یہ درست کہتا ہے۔ عاصم سفر کے قابل نہیں اسے چند دن آرام کی سخت ضرورت ہے۔“ سپہ سالار نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”عاصم! تم ان لوگوں کے ساتھ رہ سکو گے؟“

عاصم نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ فکر نہ کریں مجھے ان پر پورا اعتماد ہے۔“

سپہ سالار ایک عرب رئیس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم جانتے ہو کہ اس ہم میں میرے لئے عاصم کو اپنے ساتھ رکھنا ضروری ہے لیکن اب یہ زخمی بھی ہے اور بیمار بھی اور میں ایسے بہادر آدمی کی زندگی خطرے میں ڈالنا مناسب خیال نہیں کرتا۔ موجودہ حالت میں ہمارے لئے اسے اپنے ساتھ لے جانے کی واحد صورت یہ ہے کہ اس کے لئے کشتی کا انتظام کیا جائے لیکن دریا کے بہاؤ کے خلاف کشتی کی رفتار اس قدر سست ہوگی کہ ہمیں بار بار روک کر اس کا انتظار کرنا پڑے گا۔ آگے چل کر جب پہاڑیوں میں دریا کا پاٹ تنگ اور پانی کا بہاؤ تیز ہو جائے گا، تو ہمارے لئے یہ مسئلہ زیادہ پریشان کن بن جائے گا۔ اس لئے اگر تم عاصم کی عدم موجودگی میں اپنے آدمیوں کی قیادت کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکو اور تمہارے آدمی مجھے یہ اطمینان دلا سکیں کہ وہ عاصم کی غیر حاضری میں ہمت نہیں ہاریں گے تو میں اسے چھپے چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔“

عرب رئیس نے کہا۔ ”عاصم کو ہمارے سرداروں نے اپنا راہنما تسلیم کیا تھا۔ اور ہمارا کوئی ساتھی ایسا نہیں جسے اس کی جان اپنی جان سے زیادہ عزیز نہ ہو۔ اگر آپ کو کوئی بے اطمینانی ہے تو آپ بذات خود ان سے اطمینان کر لیں۔“

”اگر تم مطمئن ہو تو مجھے اطمینان کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں عاصم کے فرائض تمہیں سونپتا ہوں۔“ سپہ سالار۔ یہ کہہ کر وہی طرف متوجہ ہوا۔ ”عاصم تندرست ہونے تک آپ کا ہمان ہوگا۔ آپ فوراً کشتی کا انتظام کریں۔“

اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ آپ بھی ہمارا ساتھ چھوڑ کر واپس چلے جائیں۔ آپ کو چند منزلوں تک ہی راہنمائی کا وعدہ بہر حال پورا کرنا پڑے گا۔

”آپ مطمئن رہیں۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ ان کی تیمارداری میرے بیٹے کے ذمے ہوگی۔ اسے بات کا افسوس تھا کہ یہ اپنے محسن کے لئے کچھ نہیں کر سکا۔ میں ابھی کشتی کا انتظام کرتا ہوں۔“ بوڑھا سردار بہرہ اپنے بیٹے اور قبیلے کے چند آدمیوں کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔

سپہ سالار نے عاصم سے کہا۔ ”تم اپنے آدمیوں میں سے کسی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو؟“

”نہیں، میری تیمارداری کے لئے کلاڈیوس کافی ہوگا۔“

”اگر تم کلاڈیوس کی دفا داری پر اعتماد کر سکتے ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“

عاصم نے جواب دیا۔ ”مجھے کلاڈیوس کی انسانیت پر پورا اعتماد ہے۔ لیکن ہم دونوں ان لوگوں کی زبان نہیں جانتے، اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ طیبہ کے قیدیوں میں سے ان لوگوں کی زبان جانتے والے بے آدمی کو میرے پاس چھوڑ جائیں۔“

سپہ سالار نے مترجم کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”مجھے یہ آدمی قابل اعتماد معلوم ہوتا ہے۔ تم اسے لے جاؤ۔“

کچھ دیر بعد عاصم نیم بے ہوشی کی حالت میں ایک کشتی میں لیٹا ہوا تھا اور کلاڈیوس کے علاوہ سردار کا بیٹا لیون اور طیبہ کا قیدی ارکوس اس کے ساتھ بیٹھے تھے۔ سردار کے قبیلے کا ایک اور فوجان عاصم کے گھوڑے کی باگ پکڑنے کے دریا کے کنارے چل رہا تھا۔



عاصم نے ہوش میں آکر اٹھ کھینے میں تو آسمان پر دن کے سورج کی بجائے رات کے ستارے جگمگا رہے تھے۔ ناکاہم پسینے میں شرابور تھا۔ اور حلق پیاس سے ٹخ زبا تھا، وہ کچھ دیر بے حس و حرکت پڑا رہا، پھر اچانک مضطرب سا ہو کر اٹھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اُسے یہ معلوم کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ وہ ابھی تک کشتی پر سوار ہے۔ دریا کے کنارے جیسے بانسوں سے کشتی کھینے میں مصروف تھے۔ چند آدمی گہری نیند سو رہے تھے۔ یہ کشتی اس کشتی

یہ بڑی صلح ہوتی تھی۔ جس پر وہ دن کے وقت سواری بڑا تھا۔ میں کہاں ہوں۔ سردار کی بستی زیادہ دُور نہ تھی اور ہمیں غزب آفتاب سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا، کچھ دیر اس قسم کے خیالات اُسے پریشان کرتے رہے پھر وہ کلاڈیوس کو آوازیں دینے لگا۔

کلاڈیوس جو اُس کے قریب پڑا ہوا تھا، چونک کر اٹھا۔

عاصم نے کہا: "کلاڈیوس ابھی تک ہم اُس بستی میں نہیں پہنچے اب تو رات ہو گئی ہے۔"

کلاڈیوس نے قدم سے توقف کے بعد جواب دیا: "میں! اب تو صبح ہونے والی ہے اور ہم اُس بستی سے کئی میل اگے اچکے ہیں۔"

عاصم پر غور ٹھی دیر کے لئے سکتے طاری ہو گیا۔ بالآخر اُس نے کہا: "کلاڈیوس! تم مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟ کلاڈیوس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "آپ پریشان نہ ہوں، میں صرف ایک دوست کا فرض ادا کر رہا ہوں۔ جب ہم بستی کے قریب پہنچے تھے تو آپ بخار سے بے ہوش تھے۔ اور اگر کوس مارے راستے مجھ سے یہ کہنا آیا تھا کہ آپ کے علاج کے لئے ہمیں طیبہ کے سوا کسی اور جگہ اچھا طیبہ نہیں مل سکتا۔ خوش قسمتی سے وہاں ایک کشادہ کشتی موجود تھی اور سردار کا بیٹا میرے اصرار پر آپ کو طیبہ پہنچانے پر رضامند ہو گیا۔"

عاصم نے کہا: "تم سردار کے بیٹے کو جگاؤ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"سردار کا بیٹا یہاں نہیں ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"جناب وہ آپ کو اپنے پاس ٹھہرانے پر مصر تھا اور مجھے خاصی دیر اُس سے جھگڑنا پڑا تھا۔ یہ کشتی اور

ملاح حاصل کرنے کے لئے میں نے اُسے آپ کا گھوڑا پیش کیا تھا۔"

"کلاڈیوس اتم نے اچھا نہیں کیا۔ ملاحوں سے کہو کہ وہ کشتی واپس لے چلیں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

عاصم کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا وہ دیر تک تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کلاڈیوس کی طرف دیکھتا رہا۔

بالآخر اُس نے کہا: "مجھے پانی دو۔"

کلاڈیوس نے کشتی سے لڑھی کا پیالہ اٹھا یا امدد دیا کے پانی سے بھر کر عاصم کو پیش کر دیا۔ عاصم نے پانی پینے کے بعد اُسے پیالہ واپس دیتے ہوئے کہا: "کلاڈیوس تم نے شاید میری تلوار بھی کہیں غائب کر دی ہے؟"

"نہیں! آپ کی تلوار یہیں ہے۔ میں نے صرف آپ کی تکلیف کے احساس سے اتار دی تھی، لیجئے!"

کلاڈیوس نے یہ کہہ کر نیام سمیٹ تلوار اٹھائی اور اُسے پیش کر دی۔ لیکن عاصم نے نیام کی بجائے اچانک تلوار کا دستہ پکڑ کر تلوار کھینچ لی اور پیشتر اس کے کہ کلاڈیوس کوئی مزاحمت کر سکتا، تلوار کی نوک اُس کے سینے سے پورہی تھی۔

عاصم نے کہا: "کلاڈیوس! میں بیمار ہوں، لیکن اتنا بے بس نہیں ہوں کہ تم میرے گلے میں دسی ڈال کر

یہاں جاؤ، لے جاؤ۔"

کلاڈیوس نے اطمینان سے جواب دیا: "اگر ایک بہادر آدمی کی جان بچانا جرم ہے تو تم مجھے قتل کر سکتے ہو۔"

"ملاحوں سے کہو کہ وہ یا تو کشتی واپس لے چلیں ورنہ کنارے پر لگا دیں۔"

"یہ ملاح میری زبان نہیں سمجھتے۔"

"تو پھر ارکوس کو جگاؤ۔"

"میں جاگ رہا ہوں، ارکوس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا: "اور اگر آپ اُس بستی میں دفن ہونے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو میں کلاڈیوس کو یہ مشورہ دوں گا کہ اُسے آپ کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔"

"آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" عاصم نے مذہذب ہو کر پوچھا۔

ارکوس نے کہا: "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے گھر پہنچ جاؤں اور مرنے سے پہلے اُس شہر کی ایک جھلک دیکھ لوں جہاں میری بیوی اور بچے میرا انتظار کر رہے ہیں اور آپ میرا راستہ نہیں روک سکتے۔ اپنی زندگی کی اس آخری خواہش کی تکمیل کے لئے میں دیر میں کودنے کے لئے بھی تیار ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ مجھے لگ بھگ نکل جائے لیکن آپ کا ہاتھ مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ کلاڈیوس کی خواہش مجھ سے مختلف نہیں ہو سکتی، لیکن یہ آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر جگانے کا اصول نہیں کر سکتا۔ ورنہ سردار کے بیٹے نے ہم سے یہ بھی

کے پاس تہمدی موت یا تمہارے دوپوش ہو جانے کی خبر لے جانے تو اُس کی انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ یہ عجب رضا کاروں پر ظاہر نہ ہو۔ پھر اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ فوج کا ساتھ چھوڑنے کے بعد تمہاری زندگی میں نہایت بڑا انقلاب پیدا ہو جائے گا تو یہ ایک غلط فہمی ہے۔ آج میں تمہاری یہ خود فریبی دُور کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم کو کوئی مقصد تھا۔ تمہارا سپہ سالار یہ جانتا ہے کہ اس فوج کے ساتھ اُس کے لئے جتنی فوج کرنا ناممکن ہے صرف اس لئے پیش قدمی کر رہا ہے کہ اپنے حکمران کے سامنے اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے کی جرات نہیں رکھتا۔ جس سپہ سالار کی آخری اُمید یہ ہو کہ کسی نہ کسی دن اُسے واپسی کے لئے بلاوا آجائے گا اور وہ شکست یا پائی کی ذلت سے بچ جائے گا۔ میں اُس کے جھنڈے تلے کسی عظیم مقصد کے حصول کے لئے جان دینا بھی ہانت خیال کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کسریٰ اب اپنی ساری قوتِ قسطنطنیہ پر عمل کرنے کے لئے جمع کر رہا ہوگا اور اس عہد کی کامیابی یا ناکامی اُس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ کبھی مجھے میں اس قدر تساہل سے کام نہ لیتا۔ عاصم! تم اب آرام سے لیٹ جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ جب زمانے کے حالات بدلیں گے تو تم مجھے اپنا دشمن نہیں سمجھو گے۔“

عاصم نے لیٹتے ہوئے کہا: ”کلاڈیوس! تم مجھے پھر اُس ویرانے کی طرف دھکیل رہے ہو، جہاں میرے لئے بے نشان راستے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔“

کہا تھا تم طیبہ جا کر کسی اچھے طبیب کو لے آؤ۔ آپ کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جب آپ بے ہوش تھے تو آپ کی تلوار کلاڈیوس کے ہاتھ میں تھی۔“

عاصم نے تلوار ایک طرف پھینک دی اور کرب انگیز لہجے میں کہا: ”کلاڈیوس! تم جانتے ہو کہ میں آپہیں قتل نہیں کر سکتا۔“

اُس نے جواب دیا: ”میں جانتا ہوں اور اگر مجھے یہ اطمینان نہ ہوتا تو میں یہ تلوار آپ کے حوالے نہ کرتا۔ ابھی میں آپ کی طرح زندگی سے مایوس نہیں ہوا۔“

”تم مجھے طیبہ لے جانا چاہتے ہو؟“

”نہیں میں آپ کو بہت دُور لے جانا چاہتا ہوں۔ کسی ایسی جگہ جہاں آپ اپنا کھویا بڑا سکون تلاش کر سکیں۔ لیکن میرے سامنے پہلا مسئلہ آپ کو اس بیماری سے نجات دلانا ہے۔ اگر طیبہ میں آپ کی صحت ٹھیک نہ ہوئی تو ہم آپ کو با بلیرن لے جائیں گے۔ جب آپ تندرست ہو جائیں گے تو اس بات کا فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہوگا کہ آپ جس چیز کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے وہ آپ کو کہاں مل سکتی ہے۔ لیکن یہ کسی منزل پر ہمارے راستے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں لیکن مجھے اتنا اطمینان ضرور ہوگا کہ میں اپنی بہت کے مطابق اُس شریف دشمن کے احسان کا بدلہ دے چکا ہوں، جس نے مجھے موت کے منہ سے نکالا تھا۔“

عاصم نے کہا: ”لیکن میرے سامنے کیا کہیں گے؟ سپہ سالار میرے متعلق کیا خیال کرے گا۔ اور میں اپنی زندگی کی رہی سہی دلچسپیوں سے کنارہ کش ہو کر کیا کروں گا۔ کلاڈیوس! مجھے کنارے پر اتار دو۔ اس کے بعد تم آزاد ہو گے۔“

کلاڈیوس نے ایک فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا: ”اُس وقت مجھے اپنی آزادی سے زیادہ تمہاری زندگی عزیز ہے۔ اور میں تمہاری یہ غلط فہمی دُور کر دینا چاہتا ہوں کہ سپہ سالار تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ اُسے صرف یہ خدشہ تھا کہ اگر تم راستے میں چل بیسے تو عرب رضا کاروں میں بددلی پھیل جائے گی لیکن اُس کا یہ خدشہ دُور ہو چکا ہے۔ اور چند منزلیں اور طے کرنے کے بعد تمہارے سامنے اگر ایرانیوں کی فتوحات کے لئے نہیں تو کم از کم اپنی بقا کے لئے ہی اُس کا حکم ملنے پر مجبور ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سردار کی بسنت کا کوئی آدمی

کلاڈیوس کے طرز عمل میں یہ تبدیلی عاصم کے لئے ناقابل فہم تھی، اُس نے پوچھا۔ کیا تم اُس منزل سے منہ پھیرو گے، جہاں زندگی کی تمام راحتیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں؟“

کلاڈیوس نے جواب دیا۔ میرے لئے یہ ایک مجبوری ہوگی۔ میں یہ جانتا ہوں کہ آپ کا ساتھ چھوڑ کر میرے لئے بابلین پہنچنا ناممکن ہے۔ ایرانی مجھے طیبہ سے آگے نہیں جانے دیں گے۔ لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہوگا کہ آپ کسی مجبوری کے بغیر زندگی سے اپنا رشتہ توڑ رہے ہیں۔“

عاصم نے کہا۔ کلاڈیوس! زندگی سے میرے سارے رشتے اُس دن ٹوٹ گئے تھے جب میں اپنے وطن سے نکلا تھا۔ اس کے بعد مجھے اپنی تمام خواہشیں اور دلچسپیاں ایک مذاق معلوم ہوتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات مجھے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ میں کبھی زندہ تھا۔ میرا معنی ایک خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ میں نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر جنگ کے ہنگاموں میں پناہ لینے کی کوشش کی تھی لیکن اب مجھے اپنے عظیم ترین کارنامے بھی ایک مذاق معلوم ہوتے ہیں۔ میرے دوست! تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ میں اب واپس نہیں جاؤں گا۔ اور شاید طیبہ میں قیام کرنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ رات تم سے باتیں کرنے کے بعد میں زندگی کی بجائے موت کے متعلق سوچ رہا تھا اور میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ اب اگر میں ایک ایسے انسان کے کام آسکوں جس کے مستقبل کا راستہ سدا بہار غلستانوں کی طرف جاتا ہے۔ تو اس کے بعد میرے لئے موت کا چہرہ شاید اس قدر بھیانک نہ ہوگا۔ میں تمہارے ساتھ حاضر کا کلاڈیوس! اور اگر بابلین پہنچ کر میری کوئی تدبیر کارگر ہو سکی تو تم بہت جلد اپنے وطن کی ہوا میں سانس لے سکو گے۔ لیکن میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں۔“

”کہیئے! کلاڈیوس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔“

”کیا مجھے تمہارے وطن میں اپنی بیکاری کے لمحات کاٹنے کے لئے ایک چھوٹی سی چراگاہ اور چند میڑیں مل جائیں گی؟“

”ہاں“ کلاڈیوس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر ایرانی وہاں پہنچ گئے تو آپ کو وہاں بھی اپنی چھوٹی سی چراگاہ اور چند میڑوں کی حفاظت کے لئے تلوار اٹھانی پڑے گی۔“

عاصم گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کشتی کنارے سے ہو کر تڑپا گیا۔ کشتی کنارے سے اتر کر جھاگتا بڑا آگے بڑھا

باب ۲۶

طلوع صبح کے وقت، رات بھر کشتی کھینے والے ملاحوں نے اپنے ساتھیوں کو جگایا اور کشتی اُن کے سپرد کر کے سو گئے۔ صبح کی تازہ ہوا میں عاصم کا بخار ہلکا ہو چکا تھا اور وہ فضا میں اڑنے والے اور دریا کے کناروں پر ادھر ادھر جھانکنے والے عجیب و غریب جانوروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دریا کے ایک موڑ کے قریب پہنچتے ہی اُسے لپٹا لپٹا نکاروں کی صدائیں سنائی دینے لگیں، عاصم اور اُس کے ساتھی اضطراب کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اراکوس نے ملاحوں سے چند باتیں کرنے کے بعد عاصم کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں، یہ نکارے آپ کو دوستی کا پیغام دے رہے ہیں۔ گل ہماری روانگی سے قبل سردار کے بیٹے نے راستے کی بستریوں کو تہ دار کرنے کے لئے اپنے ایلچی روانہ کر دیئے تھے۔“

دریا کے موڑ سے آگے کنارے کے ایک ٹیلے پر انہیں سیاہ فام انسانوں کا جھوم دکھائی دیا۔ ایک آدمی گھوڑے کی باگ تھامے اُن کے درمیان کھڑا تھا۔ اشارے سے گھبراہٹا۔

کلاڈیوس نے کہا۔ ”وہ سردار کا بیٹا ہے۔ لیکن وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟“

عاصم بولا۔ ”ممکن ہے وہ مجھے واپس لے جانا چاہتا ہو۔“

کلاڈیوس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”مجھے یقین نہیں کہ وہ آپ کے ساتھ اس قدر دشمنی کرے گا۔“

عاصم نے کہا۔ ”کلاڈیوس! اگر میں اُس کے ساتھ جہاز چاہوں تو مجھے روکنے کی کوشش کرو گے؟“

”نہیں! اب میں آپ کو روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ بلکہ خود ہی آپ کے ساتھ واپس چلا جاؤں گا۔“

اور اُس نے عاصم سے مخاطب ہو کر کہا: آپ کی طبیعت کیسی ہے مجھے ساری رات یہ خیال پریشان کرتا رہا کہ دن کی تیز دھوپ میں کسی چتر کے بغیر کشتی پر سفر کرتے ہوئے آپ کو بہت تکلیف ہوگی۔ یہ لوگ چار سالے دوست ہیں اور میرا پیغام سُن کر آپ کو الوداع کہنے آئے ہیں۔ یہ آپ کے لئے ہرن، پرنسوں اور چھیلوں کا تازہ شکار بھی لائے ہیں۔ آپ کشتی سے اتر کر تھوڑی دیر آرام کر لیں، میں کشتی پر چھتر ڈال دیتا ہوں۔

مترجم نے سردار کے بیٹے کا مفہوم بیان کیا اور عاصم اُس کا شکر یہ ادا کرنے کے بعد کشتی سے اتر کر دیا کہ گنارے ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

سردار کا بیٹا اور مقامی معززین اُس کے گرد بیٹھ گئے اور چند آدمی کشتی پر گھاس چھونس کا پتھر ڈالنے میں مصروف ہو گئے۔

ایک ساعت بعد یہ کام ختم ہو چکا تھا اور کشتی پر شکار لادا جا رہا تھا۔ عاصم نے اٹھ کر سردار کے بیٹے سے مصافحہ کرتے ہوئے دوبارہ اُس کا شکر یہ ادا کیا اور کشتی پر سوار ہو گیا۔ جب کشتی روانہ ہونے لگی تو سردار کے بیٹے نے گنارے سے بلند آواز میں کہا: ”میں اب واپس جا رہا ہوں۔ آپ کو اگلی منزلوں پر میری ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہم نے راستے کے دوسرے قبائل کو خبردار کرنے کے لئے ایلچی بھیج دیئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی ہر ممکن اعانت کریں گے۔ اس گھوڑے کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے اس جالور پر سواری کرنے کا بہت شوق تھا۔“

عاصم نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے سلام کیا اور کشتی وہاں سے چل پڑی۔

○

ایک دن طیبہ کا ایرانی حاکم انتہائی پریشانی کی حالت میں قدیم شاہی محل کے ایک کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ایک سپاہی کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے جھک کر سلام کرتے ہوئے کہا: ”جنو! اسکندر یہ کا ایلچی حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔“

طیبہ کے حاکم نے غصے کی حالت میں سپاہی کی طرف دیکھا اور کہا: ”اُسے لے آؤ۔“

سپاہی سلام کرتے واپس چلا گیا اور وہ مدد حاصل سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مختصری دیر بعد ایک فوجان ہوا اپنے ہاس سے، ایک معزز ایرانی معلوم ہوتا تھا، کمرے میں داخل ہوا، اور انتہائی بے تکلفی کے ساتھ طیبہ کے حاکم کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا: ”میں صبح سے آپ کے حکم کا انتظار کر رہا ہوں، آپ نے کیا انتظام کیا ہے؟“

طیبہ کے حاکم نے جواب دیا: ”میں کل علی الصباح آپ کے ساتھ سواروں کا ایک دستہ روانہ کر سکتا ہوں لیکن اس بات کا ذمہ نہیں لے سکتا کہ آپ بخریت وہاں پہنچ جائیں گے۔“

ایلچی نے کہا: ”اسکندر یہ کے گورنر کے نام شہنشاہ کا فرمان یہ تھا کہ حبشہ کی طرف پیش قدمی کرنے والے لشکر کو کسی تاخیر کے بغیر آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔ اور نصف فوج ایشیائے کوچک کے محاذ کی طرف روانہ کر دی جائے۔ آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس حکم کی تعمیل میں ذرا سی کوتاہی کے نتائج ہمارے لئے کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں۔“

”میرے سٹے یہ سمجھنا مشکل نہیں لیکن ہمارے گورنر نے یہ کیسے فرض کر لیا ہے کہ آپ کسی روک ٹوک کے بغیر وہاں پہنچ جائیں گے۔ اب میں یہ بھی معلوم نہیں کہ فوج کتنی دور جا چکی ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ذمہ میں ہمارے سینکڑوں آدمی ہلاک ہو چکے ہیں اور جب سپہ سالار نے یہ پیغام بھیجا تھا کہ ایک زبردست لگ کے بغیر اس جہم کی کامیابی کی کوئی امید نہیں تو اُن کے ایلچی کو بابلینوں سے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا گیا تھا کہ شہنشاہ تمہاری طرف سے حبشہ کی فتح کے سوا کوئی اور خبر سننا پسند نہیں کریں گے۔“

ایلچی نے جواب دیا: ”شہنشاہ نے حبشہ فتح کرنے کا ارادہ ترک نہیں کیا۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ کسی اور محاذ پر توجہ دینے سے پہلے قسطنطنیہ فتح کر لیا جائے۔ آپ اگر مجھے کل ہی یہاں سے روانہ کر دیتے تو بہتر ہوتا۔“

”ایک دن میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں سپاہیوں کو تیار رہنے کا حکم دے چکا ہوں، آپ رات کے پچھلے پہر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

ایک ایرانی افسر ہنستا ہنستا اکر سے میں داخل ہوا: ”جناب! سپہ سالاروں نے ایک رومی کو گرفتار کیا ہے

لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ میں حبشہ کی طرف پیش قدمی کرنے والی فوج کے عرب دستوں کے سالار کا غلام ہوں اور انہوں
سے کشتی پر سوار ہو کر یہاں پہنچا ہوں۔ میں نے سپاہیوں کو کشتی کی تلاشی لینے کے لئے بھیج دیا ہے۔
طیبہ کے حاکم نے پوچھا۔ وہ غلام کہاں ہے؟

”جناب! ہم نے اُسے قید خانے میں بند کر دیا ہے۔ لیکن وہ آپ سے ملنے پر مصر ہے۔“

”اُسے یہاں لے آؤ۔ نہیں! میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ طیبہ کا حاکم یہ کہہ کر افسر کے ساتھ کمرے سے
باہر نکل گیا، اسکندریہ کا ایچی چند تانے تذبذب کی حالت میں بیٹھا رہا پھر وہ اچانک اٹھا اور جھاگتا ہوا ان کے
پچھے ہولیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ قید خانے کی ایک کوٹھڑی کے دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ اس کا اشارہ
پاکر میرے داروں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ کلاڈیوس لپک کر باہر نکلا اور اُس نے طیبہ کے حاکم کی
طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ عاصم کو جانتے ہیں۔ وہ حبشہ کی ہم پر جانے والی فوج میں عرب رضا کاروں کا
سالار تھا۔“

”میں اُسے جانتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ اُس کے ساتھ میں نہیں بھی دیکھ چکا ہوں۔“

کلاڈیوس نے کہا۔ ”عاصم دریا کے کنارے کشتی میں پڑا ہوا ہے، وہ بیمار ہے اور سپہ سالار کا یہ حکم
ہے کہ اُسے بابلین یا اسکندریہ پہنچا دیا جائے۔ اگر یہاں کوئی اچھا طبیب ہے تو آپ اُسے ہمارے
ساتھ روانہ کریں۔“

طیبہ کے حاکم نے سوال کیا۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟“

”ہم کشتی پر آئے ہیں، اُن کے لئے گھوڑے پر سوار ہونا ممکن نہ تھا۔“

”تمہیں راستے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی؟“

”نہیں بلکہ راستے کے تمام قبائل نے ہمیں ہر ممکن مدد دی ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمیں تو یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ قدم قدم پر مزاحمت کر رہے ہیں۔“

یہ اطلاع درست تھی لیکن اب ایک لڑائی میں نقصان اٹھانے کے بعد وہ آپ کی فوج کے ساتھ

تعداد کر رہے ہیں۔ اگر اُن کے ایک یا انتر قبیلے کا سردار ہمارے حال پر ہریان ہو کر ہمیں کشتی اور ملاح ہتیا کرنا

تو ہمارے لئے یہاں تک پہنچانا ناممکن تھا۔

طیبہ کے حاکم نے کہا۔ ”چلو تم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد طیبہ کا حاکم، شہر کا ایک مشہور طبیب اور اسکندریہ کا ایچی پنچ چکے تھے۔ عاصم انہیں دیکھتے ہی

اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیکن طیبہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس کی نیند دیکھی۔ اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اُسے
کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تم آرام سے لیٹے رہو ہم تمہارے لئے ڈولی منگوا رہے ہیں۔“

عاصم نے طیبہ کے حاکم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اگر آپ مجھے کشتی سے اتارنے کی بجائے ہمیں کھانے پینے کا
سامان ہتیا کریں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ مجھے اس حالت میں کشتی سے اتارنا پسند نہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں
کہ میرے لئے بابلین یا اُس سے آگے سمندر کے کنارے کسی شہر کی آب و ہوا بہتر ہوگی۔“

طیبہ نے کہا۔ ”لیکن تمہیں صحت بخار سے اور میں اس حالت میں سفر جاری رکھنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔
تمہارے لئے چند دن یہاں ٹھہرنا بہتر ہوگا۔“

”نہیں! اس علاقے کی گرمی کی شدت مجھے تندرست نہ ہونے دے گی۔“

طیبہ کے حاکم نے کہا۔ ”ہم تمہاری مرضی کے خلاف تمہیں یہاں روکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔
لیکن پہلے تم ہمیں یہ بتاؤ کہ ہمارے لئے سپہ سالار تک کوئی پیغام پہنچانے کی آسان ترین صورت کیا ہے؟
یہ ایچی شہنشاہ کی طرف سے فرمان لے کر آیا ہے کہ فوج کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے اور سواروں کے
دستے قسطنطنیہ کے محاذ پر بھیج دیئے جائیں۔“

عاصم نے جواب دیا۔ ”اگر آپ میرے لئے نئے آدمیوں کا انتظام کر سکیں تو یہ ملاح کسی وقت کا سامنا
کئے بغیر آپ کے ایچی کو سپہ سالار کے پاس پہنچا سکتے ہیں۔“

”ہم تمہیں اس سے زیادہ کشادہ اور آرام دہ کشتی اور انتہائی قابل اعتماد ملاح دے سکیں گے لیکن
تم کو اس بات کی ذمہ داری یعنی پڑے گی کہ یہ لوگ راستے میں ہمارے آدمیوں کو دھوکا نہیں دیں گے۔“

عاصم نے جواب دیا۔ ”ان کا سردار ہمارا دوست بن چکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان کی رفاقت

کلی بنا پر آتے گا کوئی قبیلہ آپ کو پریشان نہیں کرے گا۔ میرے ساتھ راستے کے تمام قبائل کا صلہ گوارا

طیبہ کے حاکم نے کہا۔ "نوب میں فوج کی مشکلات کی اطلاعات سننے کے بعد میں یہ محسوس کروا ہوا کہ سپہ سالار کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کے لئے بھی ہمیں ایک اچھی خاصی فوج روانہ کرنا پڑے گی۔ لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ قدرت نے ہمیں ہماری اعانت کے لئے یہاں بھیجا ہے۔"

لٹی نے کہا۔ "میں جلد از جلد سپہ سالار کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں اور آپ ان لوگوں کو یہ سمجھائیں کہ ان کی خدمات فراموش نہیں کی جائیں گی۔ اور سپہ سالار انہیں بڑے سے بڑے انعام کا حق دار سمجھے گا۔"

عاصم نے جواب دیا۔ "یہ لوگ آپ سے کوئی معاوضہ نہیں چاہیں گے لیکن اگر آپ ان کو توشہ کرنا چاہتے ہیں تو انہیں ایک ایک گھوڑا عنایت کر دیجئے، اس کے بعد یہ آپ پر اپنی جائیں بچاؤ کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ گھوڑا ان کے لئے نایاب چیز ہے۔"

لٹی نے طیبہ کے حاکم کی طرف دیکھا اور اُس نے کہا۔ "میں انہیں اپنے اصطبل کے بہترین گھوڑے دینے کے لئے تیار ہوں۔"

عاصم کچھ دیر اراکووس کے ذریعے ملاحتوں سے باتیں کرتا رہا اور پھر طیبہ کے حاکم کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "یہ آپ کے اچھے دوستوں کے پاس پہنچانے کا ذمہ لینے کو تیار ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ کسی ایسے آدمی کو بھیجا ضروری ہے جو ان لوگوں کی زبان جانتا ہو۔"

طیبہ کے حاکم نے اراکووس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

عاصم نے جواب دیا۔ "یہ ایک قیدی ہے اور میں اسے بابل میں بھیجتے ہی آزاد کرنا کا وعدہ کر چکا ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کو طیبہ میں ایسے لوگ مل جائیں گے جو ان لوگوں کی زبان جانتے ہوں۔"

اراکووس نے کہا۔ "نوب کے سینکڑوں باشندے مقامی لوگوں کے ہاں ملازمت کرتے ہیں۔ آپ ان میں سے کسی کمان کے ساتھ بھیج سکتے ہیں۔"

طیبہ کا حاکم اراکووس کو حنظرب دیکھ کر سرکرایا۔ "تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر عاصم تمہیں آزاد کرنے کا وعدہ کر چکا ہے تو تم نہیں واپس نہیں بھیجیں گے۔ پھر وہ عاصم سے مخاطب ہوا۔ "تم مجھے سفر کے قابل نظر نہیں

تے۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ چند دن یہاں قیام کرو؟"

"نہیں! آپ مجھے جانے دیں۔ میں اس علاقے کی گرمی میں صحت یابی جو سکوں گا۔"

طیبہ کے حاکم نے طیب سے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا تو یہی مشورہ ہے کہ انہیں آرام کرنا چاہیے لیکن اگر یہ جانے پر بھنڈ ہیں تو میں انہیں چند دن کے لئے روانہ کر سکتا ہوں۔"

طیبہ کے حاکم نے عاصم سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بہت اچھا! اگر تمہارا یہی ارادہ ہے تو ہم انہی تمہارے

سفر کا بندوبست کئے دیتے ہیں۔"

ایک ساعت بعد عاصم، کلاڈیوس اور اراکووس ایک خوبصورت بادبانی کشتی میں بابل میں کانٹرخ کر رہے تھے۔



ایک روز آدھی رات کے قریب انطونیا اور فرمس اپنے مکان کے صحن میں سو رہے تھے۔ اچانک انطونیا

کو ایسا محسوس ہوا کہ باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

جب رات کے سناٹے میں اُسے فرمس کے خراٹوں کے سوا کوئی اور آواز نہ سنائی دی تو وہ دوبارہ لیٹ گئی لیکن

چند ثانیے کے بعد کسی نے پھر دستک دی اور اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ فرمس کو جگانے کی نیت سے اٹھی لیکن

اچانک کچھ سوچ کر رک گئی اور پھر دبے پاؤں دروازے کی طرف چل پڑی۔ ایک نوکر دروازے کے قریب سو رہا

تھا۔ انطونیا دروازے سے دو قدم کے فاصلے پر چند ثانیے تذبذب کی حالت میں کھڑی رہی اور پھر اچانک

اُس کے بڑھ کر نجی آواز میں بولی۔ "کون ہے؟"

"میں کلاڈیوس ہوں۔ انطونیا دروازہ کھولو۔" اور انطونیا کو ایسا محسوس ہوا کہ آسمان کے تمام ستارے اچانک

اُس کے قدموں میں اُگرے ہیں۔ ایک ثانیے کے لئے وہ مسرت کے بے پایاں سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔

باہر سے پھر آواز آئی۔ "انطونیا دروازہ کھولو! جلدی کرو!" اُس کے لرزے ہوئے ہاتھ دروازے کی کھڑکی کی

طرف بڑھے اور ایک ثانیے بعد کلاڈیوس اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس کی توت گویا

کے بعد ہمیں کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ ہم ایک ایسی کشتی پر سفر کر رہے ہیں، جس پر ایرانی جھنڈا لگا ہوا ہے۔ طیبہ کے ملک کا قاتنی خط میرے پاس ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود اگر راستے میں کوئی مشکل پیش آئی تو ہم یہ یہیں گے کہ ہم عاصم کو شام کے ساحل کے کسی صحت افزا مقام پر پہنچانا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بحرِ روم میں داخل ہونے کے بعد ہمیں کوئی رومی جہاز مل جائے گا۔ ہماری کشتی شتر سے آگے کچھ حاصل پر کھڑی ہے۔ مجھے صرف اس بات کا اندیشہ تھا کہ رات کے وقت شاید میں آپ کے گھر تک نہ پہنچ سکوں۔

فرس نے کہا: اب رات کے وقت ایرانی سپاہیوں کی ٹولیاں بابلون کی گلیوں میں گشت نہیں کرتیں ان کی بیشتر فوج قسطنطنیہ کے حماد کی طرف روانہ ہو چکی ہے۔ اب وہ صرف ایرانی حاکم کے محل یا فوجی مستقر پر پہرہ دیتے ہیں۔ شہر کا نظم و نسق اب مقامی لوگوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

کلاڈیوس نے قدرے تامل کے بعد کہا: اگر آپ یہاں رہنے میں کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتے تو میں آپ کو اپنے ساتھ جانے پر مجبور نہیں کروں گا۔

فرس نے کہا: نہیں، بیٹا! ہم تمہارے ساتھ جائیں گے۔ اگر ہمیں تمہارا انتظار نہ ہوتا تو اب تک ہم یہاں نہ رہتے۔ بابلون کے سینکڑوں آدمی فراہ ہو چکے ہیں۔ اور سمندر میں رومی جہاز ان کی مدد کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ عاصم نے تمہارے ساتھ فرار ہونے کا فیصلہ کیسے کر لیا؟

”عاصم کی یہ حالت ہے کہ اب وہ اپنے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن آپ جلدی کریں۔ مزید باتوں کے لئے ہمیں کشتی پر کافی وقت مل جائے گا۔ صرف ضروری سامان اور کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لے لیجئے۔“

فرس نے انطونیا سے کہا: ”بیٹی! تم جلدی سے نوکر کو جگاؤ۔“

انطونیا نے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور وہ سفر کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ مختصری دور بعد کلاڈیوس، فرس، انطونیا اور ان کا نوکر سامان کی گھڑیاں اٹھائے، ایک سنسان گلی جو روم کے بعد، دریا کے کنارے گھنے درختوں میں سے گزر رہے تھے۔

فرس نے کہا: ”اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ ذرا ٹھہر جاؤ! میں بہت تھکا گیا ہوں۔ تمہاری کشتی کئی روز پہلے کلاڈیوس سے رک کر جواب دیا۔“ آپ کو مختصری دور اور چلنا پڑے گا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر ہم نے کشتی

سلب ہو چکی تھی۔

”یہ خواب نہیں، انطونیا! میں سچ آگیا ہوں۔“ کلاڈیوس نے یہ کہہ کر اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور وہ اُس سے پلٹ گئی۔ ”کلاڈیوس! کلاڈیوس!“ اُس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: ”کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ میں نے کتنی بار یہ خواب دیکھا ہے کہ تم دفاعہ کھٹکھا ہے ہو اور میں یہ سمجھ رہی ہوں کہ میرے کان پھر ایک بار مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔ میں اس گلی میں ہر آہٹ کو تمہارے قدموں کی آہٹ سمجھا کرتی تھی۔ لیکن تم آدھی رات کے وقت یہاں آئے ہو، سچ کہو تمہیں کوئی خطرہ تو نہیں؟“

”نہیں مجھے کوئی خطرہ نہیں انطونیا! تمہارے ابا جان کہاں ہیں؟“

”وہ سو رہے ہیں، میں انہیں جگا رہی ہوں۔“ انطونیا کلاڈیوس کی گرفت سے آزاد ہو کر بھاگتی ہوئی فرس کے بستر کے قریب پہنچی اور اُس کا بازو پکڑ کر جھجھوڑتے ہوئے بولی: ”ابا جان! ابا جان! وہ آگئے ہیں۔“ فرس نے ہلکا ہلکا اٹھتے ہوئے سوال کیا: ”کیا بڑا؟ کون آگیا؟“

”کلاڈیوس آگیا ہے ابا جان۔“ اُس نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

فرس اٹھا۔ کلاڈیوس آگے بڑھا اور وہ ایک دوسرے سے پلٹ گئے۔

”بیٹا! تم یہاں کیسے پہنچے؟ تم فرج سے بھاگ کر تو نہیں آئے؟ سچ کہو، تمہیں کوئی خطرہ تو نہیں؟“ فرس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

اُس نے اطمینان سے جواب دیا: ”آپ پریشان نہ ہوں، جب تک عاصم میرے ساتھ ہے۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ اُس کا نام لے کر میں بابلون کے حاکم کے محل میں بھی داخل ہو سکتا ہوں۔“

”عاصم کہاں ہے؟“

”عاصم کشتی میں پڑا ہوا ہے۔ وہ بیمار ہے۔ لیکن اب باتوں کا وقت نہیں۔ آپ فوراً سفر کے لئے تیار ہو جائیں۔ ہم قسطنطنیہ جا رہے ہیں۔“

”قسطنطنیہ؟“ فرس اور اُس کی بیٹی نے ایک زبان ہو کر پوچھا۔

”ہاں! ہمارے لئے صرف نیل کے دہانے تک پہنچنا قدر سے مشکل ہے۔ بحیرہ روم میں داخل ہونے

شہر کے قریب کھڑی کی تو دہاں کئی آدمی جمع ہو جائیں گے اور اگر کسی ایرانی پہریدار نے دیکھ لیا تو ہم سے طرح طرح کے سوالات کئے جائیں گے، اس لئے میں کشتی کو شہر سے آگے لے گیا تھا۔
فرس نے پوچھا "تم کشتی کے ملاحوں پر اعتماد کر سکتے ہو؟"

"ہاں وہ سب قبلی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ دریا ئے نیل کے دہانے تک وہ کسی پس دیش کے بغیر ہمارے حکم کی تعمیل کریں گے اور اس کے بعد انہیں یہ بتا دینے میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا کہ ہم شام کے ماحل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ سمندر میں داخل ہونے کے بعد ہمارے لئے کشتی کا رخ بدلنا مشکل نہ ہوگا۔"

نہ آیا تو بابلینوں میں میرا گھر اور سرائے تمہاری خدمات کا صلہ ہوگا۔
"کاش! آپ مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔"

فرس نے پیار سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے کہ ہم دوبارہ ملیں گے۔"
ارکوس نے قدر سے بے چین ہو کر کہا "جناب! آپ کو دیر ہو رہی ہے۔ جلدی کیجئے!"
کلاڈیوس، انطونینہ اور فرس کسی توقف کے بغیر کشتی میں سوار ہو گئے۔



طلوح سحر کے وقت کشتی بابلینوں سے چند میل دُور آچکی تھی، کلاڈیوس اور انطونینہ گہری نیند سو رہے تھے۔
فرس عاصم کے قریب بیٹھا تھا، اُس کی نگاہیں عاصم کے نحیف و لاغر چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ بار بار عاصم کی نیند پر ہاتھ رکھتا اور اُس کے چہرے پر اضطراب کے آثار ظاہر ہونے لگتے۔
طلوح آفتاب کے غمگین دیر بعد عاصم نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور فرس نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اب آپ کا بخار کم ہو رہا ہے۔"

"آپ کب آئے؟ میں کہاں ہوں؟" عاصم نے نحیت آواز میں پوچھا۔
"ہم پچھلے پہر کشتی میں سوار ہوئے تھے۔ اُس وقت آپ کا بخار بہت تیز تھا۔ ہم بابلینوں سے چند میل دُور آپ کے پاس آئے۔"
"کلاڈیوس کہاں ہے؟"
"وہ سو رہا ہے۔"

عاصم نے کہا "میں اس حال میں زیادہ دُور آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ اگر کلاڈیوس مجھے بابلینوں میں پہنچا دیتا تو اچھا ہوتا۔"

فرس نے کہا "آپ جانتے ہیں کہ کلاڈیوس آپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ اور میں بھی آپ کو اس حالت میں چھوڑنا گوارا نہ کرتا۔ آپ کو فکر مند نہیں ہونا چاہیئے۔ شام کے ماحل کی خوشگوار ہوا آپ کو صحت مند کر دے گی۔
عاصم کے چہرے پر ایک مغموم مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس نے کہا "کلاڈیوس کے عزائم مجھ سے پوشیدہ نہیں



کلاڈیوس اور اُس کے ساتھی کشتی کے قریب پہنچے تو ارکوس جلدی سے نیچے اتر کر آگے بڑھا اور بولا:
"آپ نے بہت دیر لگائی، اب جلدی کریں، صبح ہونے والی ہے۔"
کلاڈیوس نے پوچھا "عاصم کا کیا حال ہے؟"

ارکوس نے جواب دیا "اُن کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تھوڑی دیر ہوئی انہوں نے پانی مانگا تھا اور مجھ سے کچھ دیر باتیں بھی کی تھیں لیکن ابھی تک انہیں پوری طرح ہوش نہیں آیا۔"
کلاڈیوس نے کہا "اب تم آزاد ہو۔ اور اگر تم سے کوئی ہمارے متعلق پوچھے تو تمہیں اس سے زیادہ نہیں بتانا چاہیئے کہ ہم نے تمہیں رات کے وقت بابلینوں کے قریب اتار دیا تھا۔"

"آپ فکر کریں یہ اگر بابلینوں سے چند میل دُور ہے اور وہاں پہنچ کر میں ایرانیوں کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکوں گا۔"
فرس کو انوکھا سامان کی گٹھریاں لادنے کے بعد فارخ ہوا تو کلاڈیوس نے اُس کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اگر بابلینوں میں میری تلاش شروع ہوتی تو ممکن ہے کہ سب سے پہلے تمہارے آقا کے گھر کی تلاشی لی جائے۔ اس صورت میں انطونینہ اور ان کے والد کے متعلق تم سے پوچھا جائے گا اور تمہارا یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ اسکندریہ جا چکے ہیں۔"

فرس نے کہا "اگر مصر کے حالات بدل گئے تو میں بعد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اگر میں

میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے اپنے وطن لے جا رہا ہے اور آپ کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ میں اب صرف مجبوری اور بے بسی کی حالت میں اُس کا ساتھ دے رہا ہوں۔ میرا شروع سے یہ ارادہ تھا کہ کلاڈیوس کسی دن اپنے گھر پہنچ جائے۔“

”مجھے اس بخار کا خاصا تجربہ ہے۔ کلاڈیوس سے آپ کی کیفیت معلوم کرنے کے بعد میں اپنے گھر سے آپ کے لئے ایک دوا لے آیا ہوں۔ آپ اسے آزما کر دیکھیں! فرمس نے چڑھے کے تھیلے سے پانڈی کی ایک ڈبیا نکال کر کھولی اور اُس میں سے محمودا سا سفوف نکال کر عاصم کی تھیلی پر رکھ دیا، پھر بلدی سے اٹھ کر پیلا پانی سے بھرا اور عاصم کو پیش کرتے ہوئے کہا: ”آپ یہ دوا کھا کر پانی پی لیں۔“

عاصم نے اٹھ کر دوا منہ میں ڈال لی اور پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد دوبارہ لیٹ گیا۔

کچھ دیر دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ بالآخر فرمس نے کہا: ”اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کا زخم دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے زخم سے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی وہ قریباً منڈل ہو چکا ہے لیکن اس بخار نے مجھے زندگی سے یاس کر دیا ہے۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ میں مرنے سے پہلے زندگی کی تمام خواہشوں سے کناکش ہو جاؤں۔“

”نہیں، نہیں، آپ کو یاس نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ قدرت آپ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے اب دہرا کی تبدیلی سے آپ کی صحت ٹھیک ہو جائے گی۔“

عاصم نے کہا: ”جب میں اپنے ماضی کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے اپنے عزائم اور اپنی خواہشوں پر ہنسی آتی ہے۔ میں نے ہر موڑ پر اپنے لئے وہ راستہ اختیار کیا تھا جو پہلے راستے سے زیادہ غلط تھا۔“

فرمس نے کہا: ”اگر ہر انسان صرف اپنی آنکھوں سے صحیح راستہ دیکھ سکتا تو آج دنیا کی یہ حالت نہ ہوتی ظلم و وحشت اور بربریت کے اس دور میں ہمیں کسی ایسے راہنما کی ضرورت ہے جس کی نگاہیں ہمارے فہم و ادراک کی چٹروں سے اگے دیکھ سکتی ہوں۔ اس ظلمت کے مسافر سلامتی کا راستہ دیکھنے کے لئے ایک نئے آفتاب کے منتظر ہیں۔ اور جب وہ آفتاب نمودار ہوگا تو آپ جیسے لوگ جن کے سینوں میں کسی بُرائی سے اجتناب کرنے کی برأت اور اسی اچھائی کو قبول کرنے کی خواہش موجود ہے، ایک نئے دور کے مشعل بردار بن جائیں گے۔“

عاصم نے اپنے خشک ہونٹوں پر ایک معزوم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا: ”آپ کو یہ خیال کیسے آیا کہ میرے دل میں کسی اچھائی کو قبول کرنے کی خواہش موجود ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں حوادث کے طوفان میں لگ تکتے نا طرح بہا جا رہا ہوں، یا ایک پیاسے آدمی کی طرح سراب کے پیچھے دوڑ رہا ہوں۔“

فرمس نے جواب دیا: ”آپ میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ اور ایک ایسے آدمی کو آپ کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی جس کی گردن آپ کے احسانات کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہے۔ آپ نے دو مرتبہ میری جان اور عزت بچائی ہے اور تیسری مرتبہ آپ نے میں اُس جہنم سے باہر نکالا ہے، جہاں ہم زندگی کی بجائے موت سے زیادہ تیب تھے۔ آج اگر آپ انطونیا اور اُس کے شوہر کے دل کا حال جان سکیں تو آپ کو اپنا یہ کارنامہ کسریٰ کی ساری نجات سے زیادہ شاندار معلوم ہوگا۔“

عاصم نے کہا: ”مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کلاڈیوس اپنے وطن جا رہا ہے۔ میں میرا یہ کارنامہ نہیں۔ بلکہ میں کلاڈیوس کا احسان مند ہوں کہ وہ ایک بیمار اور بے بس آدمی کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو مجھے کشتی سے اٹھا کر دریا میں پھینک سکتا تھا۔“

”عاصم، آپ کیا کہہ رہے ہیں، اگر میں ایک درندہ ہوتا تو بھی آپ کی رفاقت مجھے انسان بنانے کے لئے کافی تھی۔“

عاصم نے چونک کر دوسری طرف دیکھا۔ کلاڈیوس اور انطونیا اس کے قریب کھڑے تھے۔ وہ بیٹھ گئے اور انطونیا نے کہا: ”آبا جان! آپ آرام کریں اب میں ان کا خیال رکھوں گی۔ پھر وہ عاصم کی طرف متوجہ ہوئی: ”آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ رات کے وقت آپ کو سونٹ بخار تھا۔“

عاصم نے جواب دیا: ”اب میں کچھ ٹھیک ہوں۔“

انطونیا کچھ دیر خاموشی سے عاصم کی طرف دیکھتی رہی اور پھر جب اُس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چھپکنے لگے تو اُس نے کہا: ”میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ ہم سب آپ کے شکر گزار ہیں۔“

کنارے کے گھنے درختوں کے پیچھے ایک بستی دکھائی دے رہی تھی، فرمس نے کلاڈیوس سے مخاطب ہو کر کہا: ”اگر آپ کشتی کو محمودی دیر کے لئے کنارے پر لگا سکیں تو میں عاصم کے لئے تازہ دودھ لے آؤں۔“

عاصم نے کہا: ”نہیں، نہیں، آپ کو میری خاطر بستی میں جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔“

فرس نے اُسے تسی دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ ایران کے سپاہی اب ان بستیوں کا رخ نہیں کرتے۔ اب وہ لگان کی دھولی کا کام بھی متاعی کارندوں کے سپرد کر چکے ہیں۔“

کلاڈیوس نے جو راستے میں قطعی ملاحق کی زبان کے چند جملے سیکھ چکا تھا، ملاحق کو کشتی کنارے لگانے کا حکم دیا اور محفوظی دیر بعد فرس لکڑی کا ایک ڈول ہاتھ میں لئے کشتی سے اترا اور بستی کی طرف چل دیا۔ ایک ساعت بعد وہ واپس آیا تو اُس کے ساتھ بستی کا ایک نوجوان دودھ سے بھرا بڑا ڈول اٹھائے ہوئے تھا۔

شام کے وقت عاصم کا چہرہ قدرے بنشاش نظر آتا تھا۔ انطونیر جس نے سارے دن اُس کی تیمارداری کی تھی، اب کشتی کے ایک کونے میں گہری نیند سو رہی تھی اور کلاڈیوس اور فرس اُس کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔

عاصم نے کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں کہ آپ کی لڑائی کا کال ہے یا تازہ دودھ کا اثر بہر حال میں ایک مدت کے بعد کچھ تازگی محسوس کر رہا ہوں۔“

فرس نے جواب دیا۔ ”آپ کو دونوں چیزوں سے فائدہ ہوا ہے۔“



ایک دن عاصم کی کشتی اسکندریہ سے پچاس میل مشرق کی طرف دریا کی ایک شاخ سے نکل کر سمندریں داخل ہو چکی تھی۔ طیبہ کے پانچ ملاحقوں میں سے چار ایسے تھے جنہوں نے ابھی تک بابلینوں سے آگے سفر نہیں کیا تھا، اور وہ آگے بڑھنے میں پس دیش کر رہے تھے۔ پانچواں ملاحق چند مرتبہ اسکندریہ تک سفر کر چکا تھا، لیکن کشتی کو ساحل سے دُور لے جانے کے لئے وہ بھی تیار نہ تھا۔ قطعی زبان کے جو چند الفاظ کلاڈیوس نے سیکھے تھے وہ ان پر بے اثر ثابت ہو رہے تھے، فرس نے انہیں بغاوت پر آمادہ دیکھ کر انتہائی ملامت سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب اُسے بھی مایوسی ہونے لگی تو کلاڈیوس نے اپناک عاصم کی تلوار اٹھالی اور گرتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اگر تم صرف حکم ماننے کے عادی ہو تو کان کھول کر سن لو کہ میرے لئے تمہیں تلوار سے ہانکن مشکل نہیں۔“

کلاڈیوس کے طرز عمل میں اپناک یہ تبدیلی اُن کے لئے غیر متوقع تھی، اور وہ کچھ دیر پریشانی و اضطراب کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے، بالآخر اُن میں سے ایک معمر آدمی نے قدرے جرات سے

کہتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے آپ کو ساحل تک پہنچانے کا ذمہ لیا تھا۔ اگر آپ سمندر عبور کرنا چاہتے ہیں تو اُس کی یہ صورت یہ ہے کہ ہم آپ کو اسکندریہ پہنچادیں، وہاں سے آپ کو شام کی بندگاہوں کے جہاز مل جائیں گے۔“

کلاڈیوس نے جواب دیا۔ ”ہم شام کی بجائے قبرص یا یونان کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ اور ابکل اسکندریہ جہاز اُس طرف کا رخ نہیں کرتے۔“

ملاح نے اور زیادہ پریشان ہو کر کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ قبرص یا یونان کے راستے میں آپ کو قدم قدم پر دم کے جھگی جہازوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

کلاڈیوس نے کہا۔ ”ہمارا مقصد ہی کسی رومی جہاز کو تلاش کرنا ہے۔ اور جب ہماری یہ خواہش پوری ہو جائے گی تو تمہیں اس کشتی سمیت واپس بھیج دیا جائے گا۔“ اب میرا وقت ضائع مت کرو۔ اگر میرا ہمیں کوئی

فخر پیش آیا تو میں اُس کا مقابلہ کرنے سے پہلے تمہارے ساتھ بیٹھے کی کوشش کروں گا۔“

”جناب جب تک اس کشتی پر ایرانی جھنڈا نصب ہے آپ کو مصر کے ساحل کے اُس پاس کوئی خطرہ پیش نہیں آسکتا۔“

کلاڈیوس نے کہا۔ ”تم میرے رومی ہونے پر شک کرتے ہو؟“

”نہیں، جناب! ہم آپ کے رومی ہونے پر شک نہیں کرتے لیکن آپ کے اتحاد رومی نہیں ہیں اور ہمیں طیبہ کے حاکم نے صرف ان کا کہنا ماننے کا حکم دیا تھا۔“

”تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں اپنے آقا کی خواہش کے خلاف تمہیں اپنا ساتھ دینے پر مجبور کر رہا ہوں۔ تم ان سے پوچھ سکتے ہو کہ یہ کہاں جانا چاہتے ہیں۔“

ملاح پریشان ہو کر عاصم کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس کی حالت پہلے سے کہیں بہتر معلوم ہوتی تھی، اور فرس اُسے اس گفتگو کا مطلب سمجھا رہا تھا۔

کلاڈیوس نے کہا۔ ”عاصم! انہیں تسلی دیجئے، ان کا خیال ہے کہ میں آپ کو زبردستی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

عاصم نے مسکرتے ہوئے جواب دیا۔ ”انہیں تسلی دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک رومی کے ہاتھ

دو دن ان مہورم اُمیدوں سے بھی خالی تھا جو ایک لٹے ہوئے مسافر کے لئے آخری سہارے کا کام دیتی ہیں۔ اُسے منزل اور راستے کے الفاظ بے معنی معلوم ہوتے تھے۔ اُسے صرف اس بات کا احساس تھا کہ وہ زندہ ہے اور زندہ رہنا چاہتا ہے۔ ایک مدت کے بعد یہ پہلی شام تھی جب وہ بخار سے نڈھال ہو کر لیٹنے بیچائے بیٹھا ہوا تھا۔ سمندر کی خوشگوار ہوا کے جھونکوں سے اُسے تازگی محسوس ہو رہی تھی۔

کلاڈیوس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”میرے خیال میں اب تمہیں لیٹ جانا چاہیے۔ عاصم نے کہا ”میں اپنے سامنے کا انتظار کر رہا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اب اُس نے مستقل طور پر میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔“

انطونین نے چونک کر پوچھا ”کون سا سامنے؟“

”بخار۔“ عاصم نے جواب دیا۔

انطونین ہنس پڑی۔

عاصم نے قدرے توقف کے بعد کلاڈیوس سے سوال کیا ”آپ کو یقین ہے کہ ہمیں راستے میں کوئی جہاز مل جائے گا۔“

”مجھے یقین ہے، لیکن اگر قدرت نے ہماری مدد نہ کی تو بھی ہمارے پاس کھانے پینے کا اتنا سامان ہے کہ ہم باسانی قبرص تک پہنچ سکیں۔ وہاں ہمیں کئی جہاز مل جائیں گے۔ مجھے صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ یہ کشتی کسی طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔“

آٹھ دن بعد طلوعِ صبح کے ساتھ عاصم اور اُس کے سامنے شمال مشرق کی طرف تین جہاز دیکھ رہے تھے۔ سمندر کی ہوا جس نے سات دن اُن کا ساتھ دیا تھا اچانک تھم چکی تھی اور کشتی کی رفتار بہت سست ہو چکی تھی۔ کلاڈیوس جہازوں کا رخ پہچانتے ہی ملاحوں کی طرف متوجہ ہو کر چلایا ”اب تم لوگ فرائگشتی کے چہرے سنبھال لو۔ اگر ہم ان جہازوں کے راستے سے دوڑ رہے تو اُن کے ملاح ہماری طرف توجہ دیتے بغیر آگے نکل جائیں گے۔“

ملاحوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی، لیکن حیب کشتی کی رفتار ذرا تیز ہونے لگی تو فرمس نے کہا ”مجھے ڈر

میں تلوار دیکھ چکے ہیں۔“ پھر اُس نے ملاحوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں ان کے ساتھ اپنی خوشی سے جا رہا ہوں اور تمہیں اگر اپنی مرضی سے نہیں تو بحالتِ مجبوری ہمارا ساتھ دینا پڑے گا۔ تمہیں اس بات کا ڈر ہو سکتا ہے کہ جب تم واپس جاؤ گے تو طیبہ میں تم سے باز پرس کی جائے گی، لیکن تم وہاں کے حاکمِ ملوکوں کو اُن کے لئے یہ کہہ سکتے ہو کہ ایک بیمار آدمی نے راستے میں اپنا سفر ختم کر دیا تھا۔ اور اُس کا سامنے، بزدل شمشیر تمہیں نیل کے دانے تک لے گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کشتی سے اُتر کر ہمیں روپوش ہو گیا تھا۔ تم سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر راستے میں ہمیں کوئی رُوم کا جہاز مل گیا تو تمہیں واپس بھیج دیا جائے گا۔ اور یہی یہ کوشش بھی ہوگی کہ تمہیں اس خدمت کا اتنا معاوضہ مل جائے کہ تم اپنی باقی زندگی آرام سے گزار سکو۔ ممکن ہے کہ ایک معقول انعام حاصل کرنے کے بعد تمہیں طیبہ واپس جانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔“

فرمس نے ملاحوں سے عاصم کا مفہوم بیان کرنے کے بعد اپنی حیب سے سونے کے چند سکے نکال کر ایک ملاح کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا ”یہ تمہارا انعام ہے۔ کاش! میں تمہیں اس سے زیادہ دے سکتا۔“

ملاح نے یہ سکتے اپنے ساتھیوں کو دکھادیئے اور انہوں نے اس مسئلے پر مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہ کی۔

چند گھنٹے بعد عاصم مصر کے ساحل کی آخری جھلک دیکھ رہا تھا۔ ہوا موافق تھی اور کشتی سمندر کی لہروں کے تھپیڑے کھاتی ہوئی کسی دُور اقلادہ ساحل کا رخ کر رہی تھی۔ غروبِ آفتاب کے قریب جنوبی افق پر ایک سرسئی لکیر اُس کی نگاہوں سے روپوش ہو چکی تھی اور آسمان کی چھت کے جھکے ہوئے کلبے چادروں طرف نیلگوں سمندر کی سطح سے مل چکے تھے۔ آفتاب مغرب کی سمت بادل کے چند ٹکڑوں پر سُرخ اور سنہری رنگوں کے خزانے ٹٹانے کے بعد روپوش ہو گیا اور کائنات کے سیاہ آئینے پر ستاروں کی موتی جھلکانے لگے۔ یہ ستارے وہی تھے جو اُس نے عرب اور شام کے آسمان پر دیکھے تھے اور جن کے ساتھ اُس کے ماضی کی ناقابل فراموش داستانیں وابستہ تھیں۔ ان حوصلوں اور دلوں کی داستانیں جو اُس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے اور اُن مسکراہٹوں اور آنسوؤں کی داستانیں، جن کے خزانے ایک اندہ بناگ ماضی کے آغوش میں دفن ہو چکے تھے۔ عاصم اپنی کتابِ زندگی کا ایک اور ورق الٹ چکا تھا۔ لیکن اب

ہے کہ کہیں یہ جہاز ایرانی نہ ہو، اس لئے تمہیں آگے بڑھنے سے پہلے ابھی طرح اطمینان کر لینا چاہیے۔
کلاڈیوس نے جلدی سے ایرانی پرچم آتے ہوئے کہا ”مجھے یقین ہے کہ وہ جہاز رومی ہیں، ایرانی
جہاز ساحل سے اتنی دُور نہیں آتے“ کچھ دیر بعد اُسے جہازوں پر رومی پرچم دکھائی دینے لگے اور اُس نے
خوشی سے اُچھلے ہوئے کہا ”میرا خیال درست نکلا، وہ رومی ہیں، وہ رومی ہیں۔ انہوں نے ہمیں
دیکھ لیا ہے۔ دیکھیے اُن کا رخ ہماری طرف تبدیل ہو رہا ہے“

(۱۸) ایک ساعت بعد تینوں جہاز لنگر انداز ہو چکے تھے، اور اُن کے ملاح کلاڈیوس کے اشاروں کا
جواب دے رہے تھے۔ کشتی سب سے اگلے جہاز کے ساتھ لگی۔ اور اُس کے کپتان نے اُدھر سے جھک
کر کلاڈیوس کی طرف دیکھا اور بلند آواز میں پوچھا ”تم کون ہو؟“ کلاڈیوس نے صرف اپنا نام بتا دینا کافی
سمجھتے ہوئے مختصراً اپنے باپ اور چچا کا ذکر کر دیا۔ کپتان کلاڈیوس سے ناواقف تھا، لیکن اُس کے لئے روم
کی سنیٹ کے ایک معزز رُکن اور اسکندریہ کے سابق گورنر کی شخصیتیں اجنبی نہ تھیں۔ چنانچہ اُس نے کسی توقف
کے بغیر ملاحوں کو رستوں کی سیڑھی پھینکنے کا حکم دیا۔ کلاڈیوس اور اُس کے ساتھی یکے بعد دیگرے سیڑھی کی در
سے جہاز پر پہنچے اور ملاح اُن کے گرد جمع ہو گئے۔ کپتان کے سوالات کے جواب میں کلاڈیوس اپنی سرگزشت
سنارہ تھا کہ باقی دو جہازوں کے کپتان بھی دُور پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک ولیرس تھا۔ وہ کلاڈیوس کو
دیکھتے ہی جھانکا ہوا آگے بڑھا اور اُس سے لپٹ گیا۔

”ہم تمہارے متعلق مایوس ہو چکے تھے کلاڈیوس، تم اتنی مدت کہاں رہے؟“

”ہم ایرانیوں کی قید میں تھا“ کلاڈیوس نے جواب دیا

”اور یہ کون ہیں؟“

یہ میری بیوی ہے، یہ ان کے والد ہیں اور یہ وہ دوست ہے جس کی بددلت میں آج تباہی
سانے زندہ کھڑا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج تم مل گئے ورنہ تمہارے ساتھی مجھے شاید دشمن کا جاسوس
سمجھ رہے تھے۔ عاصم! یہ میرا بچپن کا دوست ہے۔ ولیرس نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ عاصم سے
مصافحہ کیا اور کہا ”اگر آپ نے کلاڈیوس کی مدد کی ہے تو ہم سب آپ کے شکرگزار ہیں“ پھر وہ

ولیرس سے مخاطب ہو کر بولا ”آپ کی سرگزشت سننے سے پہلے میں آپ کے گلے سے یہ طوق
زدانا چاہتا ہوں“

کلاڈیوس مسکرایا۔ ”نہیں اب یہ مجھے تکلیف نہیں دیتا، میں اس کا عادی ہو چکا ہوں، پہلے
بے یہ بتاؤ کہ تم کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟“

”ہم قبرص سے آئے ہیں اور قرطاجنہ جا رہے ہیں“

”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہمارے لئے تمہاری مدد سے قسطنطنیہ پہنچنے کے امکانات کیا ہیں؟“

”ہمیں قبرص کے لئے قرطاجنہ سے اناج ہتیا کرنے کی خدمت سونپی گئی ہے“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب مجھے آپ کے ساتھ قرطاجنہ جانا پڑے گا۔ میرا خیال تھا کہ اگر
قبرص کے راستے میں کوئی جہاز مل گیا تو میں کسی تاخیر کے بغیر قسطنطنیہ پہنچ سکوں گا۔“

ولیرس نے کہا ”ہمارے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ آپ کا قسطنطنیہ پہنچنا کتنا ضروری ہے۔ دُور آپ
کا پتہ دینے والے کے لئے ہماری انعام کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ اگر آپ مجھے حکم دیں تو میں یہ خدمت اپنے
ذمے لینے کو تیار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ واپسی پر میں یونان کی کسی بندرگاہ سے غلہ حاصل کر سکوں گا جو وہ
مالات میں قسطنطنیہ کو آپ کی بخت ضرورت ہے۔“

کلاڈیوس نے جھکتے ہوئے سوال کیا ”جنگ کی کیا حالت ہے؟“

تینوں کپتان پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، اُن کی مغموم نگاہوں سے ظاہر
ہو رہا تھا کہ کلاڈیوس نے کوئی ناخوشگوار موصوع پھیز دیا ہے۔ بالآخر ولیرس نے کہا ”جنگ کے متعلق شاید ہم
آپ کو کوئی اچھی خبر نہ سنا سکیں۔ جب آپ قسطنطنیہ کے قریب پہنچیں گے تو آپ کو آبنائے باسفورس کے
مشرقی کنارے پر حدنگاہ جنگ ایرانی لشکر کے نیچے دکھائی دیں گے۔“

کلاڈیوس نے کہا ”یہ خبر میرے لئے غیر متوقع نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ روم کے جنگی جہاز بڑوں
تک دشمن کو قسطنطنیہ کے قریب نہیں گئے۔“

ولیرس نے کہا ”ان دنوں قسطنطنیہ پر ایرانیوں کے حملوں کی بہ نسبت ہمارے لئے اپنے مغربی

علاقوں پر سینیمن قبائل کی پے در پے یلغار زیادہ تشویشناک بن چکی ہے۔ ہم چکی کے دو پاؤں کے درمیان پس رہے ہیں۔ لیکن یہ وقت جنگ کی تفصیلات پر بحث کرنے کے لئے موزوں نہیں۔ اس وقت آپ اور آپ کے ساتھیوں کو آرام کی ضرورت ہے۔“

عاصم جو نقابنت کے باعث انتہائی تکلیف کی حالت میں کھڑا تھا، ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا۔ انطونیہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“

”مجھے ذرا چکر آگیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

ولیرس نے اپنے ساتھیوں کی طرف منوجہ ہو کر کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا، لیکن کلاڈیوس کو قسطنطنیہ پہنچانا ضروری ہے۔“

ایک جہاز کے کپتان نے کہا۔ ”ہمیں صرف اس بات کا افسوس ہے کہ انہیں صرف ایک جہاز کی ضرورت ہے اور ہم سب ان کے ساتھ نہیں جا سکتے۔ بہر حال اب ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“

کلاڈیوس نے کہا۔ ”میں جانے سے پہلے آپ کو بھی ایک خدمت سونپنا چاہتا ہوں میں نے کشتی کے ملازموں سے وعدہ کیا تھا کہ انہیں بحفاظت واپس پہنچا دیا جائے گا۔ آپ انہیں ساتھ لے جائیں اور مصر کے ساحل کے آس پاس کسی محفوظ مقام پر اتار دیں۔ ان لوگوں کو بحری سفر کا کوئی تجربہ نہیں اور یوں بھی اس کشتی کو واپس لے جانا ان کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

ایک کپتان نے کہا۔ ”وہ کشتی بہت خوبصورت ہے، اور میں اسے ضائع کرنا پسند نہیں کروں گا۔ ہمیں قرطاجنہ میں اس کی معقول قیمت مل سکے گی۔“

”بہت اچھا، تم کشتی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔ ان ملازموں کے ساتھ میں تم سے

انتہائی فیاضانہ سلوک کی توقع رکھتا ہوں۔“

”آپ ان کی فکر نہ کریں۔“

نقوڑی دیر بعد کلاڈیوس، اس کی بیوی، فرمس اور عاصم اس جہاز سے اتر کر، دیریں کے جہاز میں سوار ہو چکے تھے۔

اور ایک لوہار کلاڈیوس کے گلے کا آہنی طوق اتار رہا تھا۔

ولیرس بولا: "آپ کو یہ پسند نہیں کہ برا عقلم جاملے تو تمہی ہمارے سینے دوڑتے رہیں۔"

عاصم نے جواب دیا: "میری پسند یا ناپسند سے کیا ہوتا ہے؟"

فرس نے کہا: "ولیرس یہ قسم اسکے ہاتھ میں اور صرف اونٹوں یا گھوڑوں سے کام لیا جانتے ہیں"

عاصم بولا: "لیکن ہم اپنے اونٹوں اور گھوڑوں کو بھوکا اور پیاسا نہیں رکھتے۔ میں نے آج ایک گھوڑا

ذبح کر دیکھا۔ وہ بھوک۔ پیاس اور تھکاوٹ سے نڈھال تھا اور اس پر لے کر نماز ادا کر کے برساتے جا رہے

تھے۔ اگر یہ آپ کے قانون کی خلاف ورزی نہ ہوتی تو میں چاہتا ہوں کہ آج سے میرے حصے کا کھانا اور پانی اسے پہنچا دیا جائے"

کلاڈیوس نے کہا: "نہیں، نہیں، اگر آپ اس بات سے خوش ہو سکتے ہیں تو میں بذات خود اس کا خیال

لکوں گا، آپ کو اس کے لئے قربانی دینے کی ضرورت نہیں۔ ولیرس تم میرے ساتھ آؤ، میں اس ذبح کو

دیکھنا چاہتا ہوں"

وہ چلے گئے۔ فرس کچھ دیر خاموشی سے عاصم کی طرف دیکھتا رہا، بالآخر اس نے کہا: "عاصم ہم دنیا

کے ساتھ چلنے سے انکار کر سکتے ہیں لیکن اسے بدل دینا ہمارے اختیار میں نہیں۔ اگر تم یہ امید لے کر جا رہے

ہو کہ روم کے عیسائی ایران کے مجوسیوں سے بہت زیادہ تم دل ثابت ہوں گے تو تمہیں مایوسی ہوگی۔

یہ دنیا فرمانرواؤں اور محکوموں کی دنیا ہے۔ اور تمہیں ہر جگہ ظالم اور مظلوم کے رشتے میں یکسانیت نظر

آئے گی۔"

"لیکن آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ عیسائیت اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی رحم اور محبت کی تعلیم

دیتی ہے۔"

"میرا یہ دعویٰ غلط نہیں۔ لیکن میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ اس مذہب نے شہنشاہیت کا مزاج

بدل دیا ہے۔ آج عیسائیت کے علم بردار مظلوموں اور بے بسوں کے لئے ڈھال کا کام نہیں دیتے

بلکہ انہیں اپنی مظلومیت پر تالچ رہنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور موجودہ دور کے حکمران انہیں اپنے دشمن

نہیں بلکہ حلیف سمجھتے ہیں۔ آج اس جہاز پر تم نے ہمارے شہنشاہ کے غلاموں کی بے بسی کا مشاہدہ کیا

باب ۲۷

عاصم کے لئے جہاز کا سفر کشتی کی نسبت زیادہ آرام دہ تھا۔ اس کی صحت بتدیج بہتر ہو رہی تھی

ایک شام فرس، انطونیا اور کلاڈیوس سمندر کی خوشگوار ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ عاصم اور ولیرس تازہ کے نچلے حصے سے نمودار ہوئے اور آگے بڑھ کر ان کے قریب کھڑے ہو گئے۔

فرس نے عاصم کو دیکھتے ہی سوال کیا: "آپ کہاں تھے؟"

عاصم نے مخموم لہجے میں جواب دیا: "میں ولیرس کے ساتھ جہاز کے نچلے حصے کی سیر کر رہا تھا"

ولیرس نے معذرت طلب نگاہوں سے فرس، کلاڈیوس اور انطونیا کی طرف دیکھا اور پھر عاصم سے مخاطب ہو کر کہا: "مجھ سے غلطی ہوئی لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ چپ چلائے والے غلاموں کو دیکھ کر اس قدر مضطرب ہو جائیں گے"

عاصم نے جواب دیا: "میں ایران کے جنگی قیدیوں اور غلاموں کو اس سے بھی زیادہ بری حالت

میں دیکھ چکا ہوں، لیکن میرا خیال تھا کہ۔۔۔"

"آپ کا کیا خیال تھا؟" ولیرس نے سوال کیا۔

"میرا خیال تھا کہ آپ اپنے دشمنوں کے ساتھ بہتر سلوک کرتے ہوں گے"

ولیرس نے کہا: "وہ ہمارے غلام ہیں اور ہم اپنے غلاموں کو دو دنوں یا دشمنوں کی حیثیت

سے نہیں دیکھتے۔ اور ان سے کام لینے کا بہترین طریقہ وہی ہے جو آپ دیکھ چکے ہیں"

"میں نے صرف یہ دیکھا ہے کہ وہ بھوکے اور پیاسے تھے اور ان پر کورے برسائے جا رہے تھے"

ہے۔ لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ جب اقتدار کی خواہش رہبانیت کے چروں میں خود راہ ہوتی ہے تو وہ انسانیت کی تزیل کے کتنے اسباب پیدا کر لیتی ہے۔ ہماری بیشتر خالقا میں ان راہوں کی سلطنتیں ہیں جن کی ہر قدر قیصر سے کم نہیں۔ آج مجھے کلیسا کی عظیم الشان عمارتوں میں وہ چراغ نظر نہیں آتے جن سے کبھی عزیزوں کے بھونپڑے روشن ہوئے تھے۔ آج فرزند ان آدم کو ایسے دین کی ضرورت ہے جو ان کے سینوں میں ظلم اور وحشت کی طغیانوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کی جرات پیدا کر سکے۔ جو طاقتوں کے ماتم سے ظلم کی تیز چھین لے، جو نسلوں اور قبیلوں اور قوموں کے درمیان منافرت کی دیواریں توڑ ڈالے اور کالے اور گورے ادنیٰ اور اعلیٰ، امیر اور غریب کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دے۔ میں جنگ سے نفرت کرتا ہوں، لیکن اگر کوئی ایسا دین ہو جو اس دنیا کو عدل و مساوات کی تعلیم دے سکتا تو میں اس کی فتح کے لئے تلوار اٹھانے سے دریغ نہ کرتا۔ سچ کہو عاصم! اگر اس دنیا میں کوئی ایسا حکمران آجائے جس کا دل انسانیت کے درد سے لبریز ہو۔ جس کا مقصد اس دنیا کو عدل و انصاف کی نعمتوں سے مالا مال کرنا ہو۔ جس کے دشمن بھی اس کی نیکی اور شرافت کی گواہی دیں، جس میں ان جاہل و مغرور شہنشاہوں کے تاج نوچنے کی ہمت ہو جو اپنی قبیل قوتوں کے بل بوتے پر اس دنیا میں خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں تو کیا تم اس کے اشاروں پر جان دینے میں یکسویت محسوس نہیں کرو گے؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”اگر کوئی ایسا انسان ہوتا تو اس کی طاقت میں صرف ایک بار جان دینے سے میری تسلی نہ ہوتی، لیکن یہ ایک خواب ہے۔“

فرس نے کہا۔ ”میں یہ ایک خواب نہیں، رات جتنی تاریک ہو اسی قدر روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم جس رات کے مسلخ میں اس کی بھیانک تاریکیاں ہمیں ایک نئے آفتاب کی آمد کی بشارت دے رہی ہیں۔ وہ آئے گا اور زمانے کے ٹھکرائے ہوئے انسان اس کے راستے میں آنکھیں پھمائیں گے اس کا دین دنیا کی ہر گراہی کے خلاف اعلان جنگ ہوگا۔ اس کے غلام قیصر اور کسریٰ کے اقتدار کی مسندیں اٹ دیں گے۔ اور اس کی فتح انسانیت کی فتح ہوگی۔ میں گئی ایسے خدار و بیہودہ لوگوں سے مل چکا ہوں جو زمانے کی نگاہوں سے چھپ کر اس کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ تم شاید اسے ایک خود فریبی سمجھو لیکن میں یہ ماننے

نے تیار نہیں کہ وہ پروردگار جس نے زمیں اور آسمان بنائے ہیں۔ جس کے حکم سے جھستے ہوئے صحرانوں، پائس بھانے کے لئے بادوں کو کہتے ہیں۔ جس نے ایک ادنیٰ جاندار کو بھی رحمت اور تعلیمت کا روح عطا کیا ہے۔ اپنے بندوں کے حال سے غافل ہو سکتا ہے۔ عاصم مجھے یقین ہے کہ اس کی بارگاہ سے تم رسیدہ انسانیت کی چیزوں کا جواب آنے والا ہے۔“

عاصم کے پاس فرس کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے کہا۔ ”اگر آپ ان حالات میں بھی انسانیت کے مستقبل کے متعلق پرامید ہیں تو آپ مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہیں۔ لیکن مجھے اپنے متعلق صرف یہ احساس ہے کہ میں زندگی کی تمام اُمیدوں سے کنارہ کش ہونے کے باوجود زندہ ہوں۔ میری نگاہوں سے ماضی کے سراب رُپوش ہو چکے ہیں اور اب مجھ میں کسی نئے سراب کے پھچھے بھانکنے کی ہمت نہیں۔ اس وقت مجھے یہ صرف احساس ہے کہ میں قسطنطنیہ جا رہا ہوں اور مجھے یہ خیال پریشان نہیں کرتا کہ وہاں میرے لئے کیا ہوگا۔ شاید میری نجات اسی میں ہو کہ میں زندگی کی ہر خواہش سے بے نیاز ہو جاؤں۔“

فرس نے کہا۔ ”میں کلاڈیوس سے تمہاری سرگزشت سن چکا ہوں اور میرے لئے تمہاری مایوسی اور بددلی کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں۔ لیکن تمہیں یاد ہے، جب تم اپنا وطن چھوڑنے کے بعد رات کے وقت ہالے پاس پہنچے تھے تو تمہاری مایوسی کا کیا عالم تھا؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جس طرح اس رات سین کی بیوی اور بیٹی کی مصیبت نے تمہیں ایک نئے راستے پر ڈال دیا تھا، اسی طرح قسطنطنیہ میں کوئی خوشگوار حادثہ تمہاری زندگی کا رخ بدل دے؟“

عاصم نے سراپا احتجاج بن کر کہا۔ ”آپ کا یہ مطلب ہے کہ میں اب ایران کی بجائے روم کی فوج میں شامل ہو جاؤں گا؟“

”میں میرا یہ مطلب نہیں۔ وہاں آپ کے لئے زندگی کی اور دلچسپیاں بھی ہو سکتی ہیں۔“
عاصم کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن کلاڈیوس اور ولیرس کو واپس آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

جہاز درہ دانیال کے پُرسکون پانی سے گزرنے کے بعد بحیرہ مارمورا میں داخل ہوا اور پھر ایک دن پھام اور اُس کے ساتھی آبنائے باسفورس کے مغربی کنارے قسطنطنیہ کا نظریہ منظر دیکھ رہے تھے۔ باطلین دار الحکومت کے قریب مارمورا اور باسفورس میں رومیوں کے جہاز اس بات کی گواہی دے رہے تھے۔ ملندریں ابھی تک اُن کا پتہ بھاری ہے۔ لیکن مشرقی کنارے پر حدنگاہ تک ٹیلوں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑوں کے دامن ایرانی لشکر کے خیوں سے اٹے بڑے تھے۔

دیلریس نے کلاڈیوس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اب ایرانیوں کا کوئی جہاز باسفورس میں داخل ہونے کی جرات نہیں کرتا۔ ہم سمندر میں اُن سے اپنی برتری کا لوہا منوا چکے ہیں۔ لیکن ہم پر ایک وقت ایسا بھی آیا تھا، جب دشمن کے جہاز شہر کی مشرقی فیصل تک جا پہنچے تھے۔ ایرانیوں نے پے درپے ناکامیوں کے بعد اپنا جنگی بیڑا یہاں سے ہٹا لیا ہے، لیکن میں نے سنا ہے کہ وہ ایک طرف بحیرہ اسود اور دوسری طرف بحیرہ مارمورا کی بعض مشرقی بندگاہوں میں نئے جنگی جہاز تیار کر رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اُن کا نیا حملہ چلے حملوں سے زیادہ شدید ہوگا۔ ادھر دیکھئے اُس ٹیلے سے آگے ایک پہاڑی پر ایرانیوں کے سپہ سالار کا ٹرنڈ خیمہ نصب ہے۔ پہلے اُس کا خیمہ باسفورس کے کنارے سے آنا قریب تھا کہ ہم قسطنطنیہ کی فیصل پر کھڑے ہو کر اُسے دیکھ سکتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اُس کی بیوی عیسانی ہے اور ایک معزز رومی افسر کی بیٹی ہے۔ اناطولیہ سے جو پناہ گزین فرار ہو کر قسطنطنیہ پہنچے ہیں، اُن کا خیال ہے کہ اگر سپہ سالار اپنی عیسانی بیوی کے زیر اثر نہ ہوتا تو اناطولیہ کے مفتوحہ شہروں میں ایک عیسانی بھی زندہ نہ چتا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ کسریٰ ایک عیسانی خاتون کے شوہر کو قسطنطنیہ فتح کرنے کی ہم کیسے سوچ سکتا ہے۔“

عاصم نے مضطرب سا ہو کر دیلریس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اگر ایرانی سپہ سالار کا نام سین ہے تو آپ کو تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ میں اُس کی بیوی کو جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اُس کا باپ ایک رومی افسر تھا۔ جسے دمشق کے عیساویوں نے دشمن کا جاسوس سمجھ کر زندہ جلادیا تھا۔“

”ہاں، ہاں۔ اُس کا نام یہی ہے۔“

کلاڈیوس نے کہا۔ ”دیلریس اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ یہ ایرانی سپہ سالار عاصم کو اپنا بیٹا سمجھتا تھا تو یقین کر لو گے؟“

دیلریس نے عاصم کے چہرے پر نظریں گاڑیں، اور قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”اگر یہ ایرانی سپہ سالار سے اس قدر قریب تھے تو آپ کے ساتھ ان کی دوستی میری سمجھ میں نہیں آسکتی اور مجھے ڈر ہے کہ قسطنطنیہ کا کوئی باشعور آدمی یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا کہ یہ صرف آپ کی خاطر ایرانیوں سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔“

کلاڈیوس نے کہا۔ ”تم درست کہتے ہو قسطنطنیہ میں کسی کو اس بات پر یقین نہیں آئے گا کہ ایرانی فرج کے ایک نامور سالار نے صرف ایک رومی کی جان بچانے کے لئے اپنے ماضی کے ساتھ سارے رشتے منقطع کر لئے ہیں۔ قسطنطنیہ کے لوگوں نے ایرانیوں کو ہمیشہ بے رحم دشمنوں کی حیثیت سے دیکھا ہے، اور مجھے ڈر ہے کہ میری گواہی کے باوجود وہ انہیں اپنا دوست سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ اس لئے قسطنطنیہ پہنچ کر عام لوگوں کے سامنے ایرانیوں کے ساتھ ان کا تعلق ثابت کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“

دیلریس نے کہا۔ ”میرے دوست ایرانیوں کے خلاف ہمارے خواص اور عوام کے جذبات بہت نازک ہیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ آپ کے والد بھی یہ پسند نہیں کریں گے کہ آپ ایرانی فرج کے کسی جہادار کو درست بنا کر اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔“

”نہیں دیلریس اپنے والد کو ان کے متعلق مطمئن کرنا میرے لئے مشکل مزین ہوگا۔ لیکن موجودہ حالات میں عام لوگوں پر ان کا ماضی ظاہر نہیں ہونا چاہیے۔“ یہ کہہ کر کلاڈیوس عاصم کی طرف متوجہ ہوا۔ ”میرے دوست تمہیں ہماری باتوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے پہلے اس مسئلہ پر تسبیحی سے غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر ہم نے احتیاط نہ کی تو ہوسکتا ہے کہ قسطنطنیہ کے لوگ میری وفاداری پر بھی شک کرنے لگے۔ جاہلیں۔“

عاصم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کے خاموش چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کلاڈیوس اور دیلریس

کی باتوں نے اُس پر کوئی اثر نہیں کیا۔ وہ بے خیالی کے عالم میں باسفورس کے مشرقی کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اُس کی نگاہوں کے سامنے ایک ایسا فانی تھا جہاں ماضی اور حال کی سرحدیں ایک ہو جاتی ہیں۔ وقت کی گزرگاہوں پر چند مٹے ہوئے نقوش چھرا جا کر ہو رہے تھے۔ ماضی کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی صدائیں پھر اُن کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اُس کی لٹی ہوئی دنیا قسطنطنیہ کی مسکراہٹوں سے آباد ہو رہی تھیں۔

وہ دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر کھاڈوس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "عالم! تم کیا سوچ رہے ہو، ادھر دیکھو، ہم بندرگاہ پر پہنچ چکے ہیں۔"

عالم نے مڑ کر دیکھا، اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔



سہ پہر کے وقت مرقس اپنے عالی شان محل کے سامنے ایک خوبصورت باغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ مرقس کے سر کے سانسے بال سفید ہو چکے تھے، تاہم اپنے سرخ و سپید چہرے سے وہ ایک تندرست اور نونالائی معلوم ہوتا تھا۔ ایک قد آور گتا اُس کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا۔

مرقس کی نوجوان بیٹی جولیا محل سے نکل کر باغ میں داخل ہوئی اور اُس کے قریب آکر بولی "اباجان! آپ نے ابھی تک چچا جان کے خط کا جواب نہیں دیا۔"

وہ بولا "بیٹی میں نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ مجھے کیا جواب دینا چاہیے۔"

جولیا اُس کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گئی اور کچھ دیر باپ اور بیٹی خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے، بالآخر مرقس نے کہا "بیٹی کل میں تمہارے چچا کو یہ لکھنا چاہتا تھا کہ تم ایک بزدل آدمی ہو۔ اگر قیصر تمہیں قرقاطجنہ کا حاکم بنا کر روانہ کرنے سے قبل میرا مشورہ لیتا تو میں بھرے دربار میں اس غلط انتخاب کی مخالفت کرتا۔ اب تمہیں واپس بلانا میرے اختیار میں نہیں مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ تمہاری بزدلی کی داستانیں ایک ایسے خاندان کی تاریخ کا حصہ بن جائیں گی، جس کی جرات اور بہادری پر ہر رومی فخر کرتا ہے۔"

جولیا نے کہا "اباجان! میں اپنے چچا کی حمایت نہیں کروں گی، مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ انہوں نے آپ کو قسطنطنیہ چھوڑ کر قرقاطجنہ پناہ لینے کا مشورہ دیا ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنا نیا ہڈی زخمی سے قبول نہیں کیا۔ بلکہ آپ کے کئی دوستوں نے انہیں مجبور کیا تھا کہ وہ قیصر کے حکم کی تعمیل کریں۔"

پ کو یاد ہے کہ جب وہ اسکندریہ سے واپس آئے تھے اور آپ نے سینیٹ میں ان کے خلاف تقریر کی لائی تو وہ رہبانیت اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔"

مرقس نے جواب دیا "اگر ایسے تمام لوگ راہب بن جاتے اور سلطنت کا کاروبار چند جرات مند آدمیوں کے ہاتھ میں سونپ دیتے تو شاید آج ہم یہ دن نہ دیکھتے۔ میرے جن دوستوں نے تمہارے چچا کو قرقاطجنہ کی گورنری کا عہدہ قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بزدل قرقاطجنہ کو قسطنطنیہ سے زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ گر میر جانی تیسر کو دارالحکومت کی تبدیلی پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ان کے لئے بھی قرقاطجنہ کا راستہ کھل جائے گا۔"

جولیا نے کہا "اباجان! یہ افواہ میں کئی دنوں سے سن رہی ہوں کہ اگر حالات زیادہ نازک ہو گئے تو شاید قیصر کو قسطنطنیہ چھوڑ کر قرقاطجنہ کو اپنا دارالسلطنت بنانا پڑے لیکن مجھے یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے۔ ہر قل جس نے ہمیں فوکاس کے مظالم سے نجات دلائی تھی، بدترین حالات میں بھی قسطنطنیہ سے بھاگنا پسند نہیں کرے گا۔"

مرقس نے قدرے جوش میں آکر کہا۔ وہ ہر قل جس نے ہمیں فوکاس سے نجات دلائی تھی، مرچکا ہے وہ اُس دن مر گیا تھا جب اُس نے سینیٹ اور کلیسا کے احتجاج کے باوجود اپنی جمعیتی سے شادی کر لی تھی۔ اب ملکی سلطنت کی تقدیر ایک عیاش، کاہل اور بزدل حکمران کے ہاتھ میں ہے۔ آج ہم اپنی تاریخ کے نازک ترین لمحے سے گزر رہے ہیں۔ آبنائے باسفورس کے پار ایرانی کئی مہینوں سے فیصلہ کن حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور ہمارے شمال مغربی علاقے اُن وحشی قبائل کی شکار گاہ بنے ہوئے ہیں جو ایرانیوں سے زیادہ توغور ہیں۔ مجھے اُسے کہ ہم کسی دن نیند سے بیدار ہوں گے تو ہمیں یہ خبر سنانی جائے گی کہ قیصر اپنی نئی ملکہ کے ساتھیوں کے قوت اور جنگی طرف فراد ہو چکا ہے اور دشمن کی افواج قسطنطنیہ کے دروازوں پر دستک دے رہی ہیں۔ بیٹی! اگر

میرے سامنے تمہارا مسئلہ نہ ہوتا تو میں تمہارے چمکے خط کا ایسا جواب لکھتا کہ اُس کے ہوش ٹھکانے آجاتے لیکن موجودہ حالات میں، میں تمہارے مستقبل سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم فرطِ جہد چلی جاؤ۔“

”اور آپ؟ جولیانے سوال کیا

”تمہیں معلوم ہے کہ میرے لئے قسطنطنیہ چھوڑنا ممکن نہیں۔ میں سینیٹ کا رکن ہوں۔ میرے مخالف کے کئی افراد رومی سلطنت کی حفاظت کے لئے جان دے چکے ہیں۔ میں قسطنطنیہ کے عوام کے سامنے ایک بڑی مثال پیش نہیں کر سکتا۔“

جولیانے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ”اور میں آپ کی بیٹی ہوں۔ اگر قسطنطنیہ پر کوئی نازک وقت آیا تو میں قرطاجنہ کی طرف بھاگنے کی بجائے آپ کے ساتھ اس شہر کی خاک میں دفن ہونا زیادہ پسند کروں گی۔“

”بیٹی ایک لڑکی کے لئے جنگ کے آلام و مصائب موت سے زیادہ بھیانک ہو سکتے ہیں۔“

”اباجان! میں مصائب کے طوفانوں کے سامنے تنہا نہیں ہوں گی، بلکہ روم کی لاکھوں سٹیاں میرے ساتھ ہوں گی۔“

کچھ دیر، باپ اور بیٹی خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اچانک جولیا کو کسی کے پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی، اس نے دائیں طرف دیکھا چند قدم کے فاصلے پر کلاڈیوس کھڑا تھا۔ جولیا چند ثانیے سکتے کے عالم میں اُس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اچانک اُٹھ کر کلاڈیوس، کلاڈیوس، کہتی ہوئی آگے بڑھی اور بے اختیار اپنے بھائی کے ساتھ لپٹ گئی۔

مرقس کی ساری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں اپنی تھیں۔ جولیا، کلاڈیوس کو اپنی گرفت سے آزاد کرنے کے بعد اپنے باپ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”اباجان! بھائی جان آگے ہیں۔ آپ نے انہیں نہیں پہچانا، اباجان یہ کلاڈیوس ہیں۔“ بوڑھا باپ لڑکھاتا ہوا اٹھا اور کلاڈیوس بھاگ کر اُس کے ساتھ لپٹ گیا۔ جولیا کو بیرونی دروازے کی طرف چند اجنبی صورتیں دکھائی دیں اور اس نے کلاڈیوس کو بازو سے

مخزن متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ کون ہیں؟“

”وہ ہمارے جہان ہیں جولیا۔ کلاڈیوس نے جواب دیا۔“

مرقس جس کی زبان تھوڑی دیر کے لئے گنگ ہو چکی تھی، اب اپنے بیٹے پر سوالات کی بوچھاڑ کر تم کہاں تھے؟ تم نے اپنے متعلق کوئی اطلاع کیوں نہ دی؟ یہاں کیسے پہنچے؟ اور تمہارے دل میں؟ تم انہیں دروازے پر کیوں چھوڑ آئے ہو؟“

جولیا بولی۔ ”وہ لڑکی کون ہے بھائی جان؟“

”اباجان! کلاڈیوس نے اپنے باپ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میری شادی ہو چکی ہے۔ اور آپ اس مکان میں داخل ہونے کے لئے اجازت کی طلبگار ہے۔“

جولیا دروازے کی طرف بڑھی اور چند قدم چلنے کے بعد بھاگنے لگی، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں اُس میں آنسو تھے۔ انطونینہ کے قریب پہنچ کر وہ لڑکی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی، ”میں کلاڈیوس کی ہوں، آپ یہاں رُک کیوں گئیں، آئیے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ سب مکان کے ایک کشادہ کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور کلاڈیوس اپنے باپ کی بہن کے ساتھ اپنے ساتھیوں کا تعارف کروا رہا تھا۔ جب حاصم کی باری آئی تو اس نے کہا۔ ”جان، یہ میرے عمن ہیں، ان کی بدولت مجھے ایک باری زندگی عطا ہوئی ہے اور دوسری باری اپنی نذر ہوئی آزادی واپس ملی ہے۔“

اگلی رات مرقس کے گھر میں شہر کے معززین، حکومت کے عمال اور کلیسا کے اکابر کی ایک انتہائی محنت دعوت کا اہتمام ہو رہا تھا۔

کیا جائے گا۔ عمر کے ساتھ انسان کے خیالات بدلتے رہتے ہیں، ممکن ہے کہ کل ایرج کے متعلق تمہاری
س جانے۔ اب چلو جلدی کرو۔“

فسطینہ اپنی ماں کے ساتھ میٹرھیوں سے نیچے اتری۔ تھوڑی دیر بعد یہ دونوں اپنے رہائشی مکان
سے اسی وقت آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ آٹا اُس کے ساتھ تشریف نہیں لائے اس لئے میں پوچھنا چاہتا
ہے کہ آپ کا کیا حکم ہے؟

یوسیا نے جواب دیا۔ ”ایرج ہمارے لئے اجنبی نہیں اُسے لے آؤ، لیکن پہلے یہاں مشعل لے آؤ۔“
نوکراس حکم کی تعمیل کے بعد واپس چلا گیا اور کچھ دیر بعد ایرج کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بیٹھ قیمت لباس
برنے تھا اور اُس کے موٹاپے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ عمارت جنگ پر بھی اُس کا وقت انتہائی عیش و آرام میں
ہے۔ فسطینہ کے قریب ایک کرسی پر بیٹھنے کے بعد اُس نے یوسیا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں رخصت پر
ساتھ ہوں اور اگر فسطینہ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو آج رات میں آپ کا جہان ہوں۔“

”فسطینہ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے تم جتنے دن چاہو، یہاں ٹھہر سکتے ہو۔“
”شکر یہ لیکن فسطینہ کی صورت بتا رہی ہے کہ یہ مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوئی۔ کیوں فسطینہ میں یہاں
برسکتا ہوں؟“

فسطینہ نے جواب دیا۔ ”میرے خیال میں یہ قطعاً کافی کشادہ ہے اور اگر میں چاہوں تو بھی آپ کو یہاں ٹھہرنے
پر رض نہیں کر سکتی۔“

ایرج نے کہا۔ ”دیکھا چھی جان فسطینہ ابھی تک مجھ سے ناراض ہے؟“
یوسیا نے جواب دیا۔ ”فسطینہ تم سے ناراض نہیں۔ اور اگر تم بچوں کی طرح لڑنے نہ لگ جاؤ تو میں
سارے کھانے کا انتظام کرنا چاہتی ہوں۔“

”میں نے اپنے ساتھیوں کے کھانے کا انتظام کرنے کے لئے قلعے کے محافظ سے کہہ دیا ہے۔ اور
اسے لئے اس وقت کسی خاص تکلف کی ضرورت نہیں۔“

باب ۲۸

ایک شام فسطینہ اور اُس کی ماں غلقدون کے قلعے کی فصیل پر کھڑی خوشگوار ہوا کا لطف اٹھا رہی تھیں
اچانک مغرب کی سمت سے سوراہوں کا ایک دستہ قلعے کا رخ کرتا ہوا دکھائی دیا اور یوسیا نے کہا۔ ”یہی شاید
تمہارے آبا جانا آگئے ہیں۔“

فسطینہ کچھ دیر ٹھکی باندھ کر مغرب کی طرف دیکھتی رہی، بالآخر اُس نے کہا۔ ”نہیں امی جان اور وہ
ہے اور آبا جانا اُس کے ساتھ نہیں ہیں۔“

یوسیا نے کہا۔ ”تمہارے آبا جانا کہتے تھے کہ ایرج رخصت پر گھر جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ اُسے کسی
صوبے کی گورنری یا کوئی اور بڑا عہدہ مل جائے اور وہ اس عمارت پر واپس نہ آئے۔ اس لئے تمہیں اُس کے ساتھ
تفنی یا بے رنجی سے پیش نہیں آنا چاہیے۔ اُسے بلاوجہ چڑانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ
کسی دن تم اُس کی ضرورت محسوس کرو گی۔ اب نیچے چلو، میں اُس کے سامنے تمہارے پیرے پر مسکراہٹ
دیکھنا چاہتی ہوں۔“

فسطینہ نے کہا۔ ”امی جان، میں ایسا طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہتی، جس سے وہ میرے ساتھ غلط
اُمیدیں قائم کرے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں اُس کے سامنے صاف گوئی سے کام لوں۔ اور اگر اُس کے
دل میں کوئی غلط فہمی ہے تو وہ ابھی سے دُور کر دی جائے۔“

نہیں بیٹی، تمہیں یہ مسئلہ اپنے باپ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وقت آنے پر وہ ایرج اور اُس کے باپ
کو مناسب جواب دے سکیں گے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تمہاری شادی کا مسئلہ تمہاری رضامندی

فسطینہ نے کہا۔ ”امی آپ بیٹھیں کمانے کا انتظام میں کرتی ہوں۔“

”نہیں فسطینہ میں تمہارے ساتھ چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ ایرج نے یہ کہتے ہوئے فسطینہ کا ہاتھ پکڑا اور وہ بے بس سی ہو کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

یوسیدا کر سے سے نکل گئی تو ایرج نے قدرے توقف کے بعد کہا ”فسطینہ میں رخصت پر جا رہا ہوں۔ دل ہے کہ وہاں مجھے کوئی نیا عہدہ پیش کر دیا جائے اور میں واپس نہ آسکوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ میرے والد نے تمہارے آبا جان کو ایک پیغام بھیجا تھا، ایک ابھی تک وہ تسلی بخش جواب نہیں دے سکے۔ عمارت جنگ سے رخصت ہوتے وقت میں نے پہلی مرتبہ ان سے مل کر بات کرنے کی جرأت کی تھی، لیکن انہوں نے مجھے یہ کہہ کر ٹانے کی کوشش کی تھی کہ ابھی میری بیٹی اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے کے قابل نہیں ہوئی۔ اب میں ان سے تمہارے ساتھ براہ راست گفتگو کرنے کی اجازت لے کر آیا ہوں۔ اور تمہیں صبح سے پہلے مجھے کوئی تسلی بخش جواب دینا پڑے گا۔“

فسطینہ نے کہا۔ ”میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے ایک رات سوچنے کے لئے دی ہے، ورنہ تم بھی کہہ سکتے تھے کہ میرا وقت بہت قیمتی ہے، اس لئے میں شادی کی رسومات ادا کرنے والے کاہن کو اپنے مائے لے آیا ہوں۔“

ایرج نے تلخ ہو کر کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ جب میں دوبارہ تمہارے پاس آؤں گا تو کاہن میرے ساتھ ہوگا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ میں اتنا طویل سفر کرنا پسند نہ کروں اور تم خود میرے پاس آنے پر مجبور ہو جائو۔ تمہیں یہ بات ہر وقت ذہن میں رکھنی چاہئے کہ تمہاری ماں عیسائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔“

فسطینہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن ایرج نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”ہماری گفتگو ابھی ختم نہیں ہوئی، آج میں تمہاری زندگی کی سب سے بڑی الجھن دُور کر دینا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے تذبذب کی وجہ وہ مفلس عرب تھا۔ لیکن اب وہ تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔“

فسطینہ کے چہرے پر اچانک زردی چھا گئی۔ اور ایرج اس سانپ کی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اپنے شکار کو ڈسنے کے بعد اس کے گرنے کا انتظار کر رہا ہو۔

اس نے کہا۔ ”تمہارا عاصم اب تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ مصر سے اطلاع آئی ہے کہ اُسے سخت بیمار حالت میں علاج کے لئے بابلون بھیجا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ کہیں روپوش ہو چکا ہے۔ ایک رومی طبیب سے اُس کے ساتھ کشتی پر سوار ہوا تھا۔ اور وہ بھی لاپتہ ہے۔ اس غلام کی مصری بیوی اور اُس کا باپ سین میں رہتے تھے۔ اور وہ بھی کہیں روپوش ہو چکے ہیں۔ بابلون کے عالم کا خیال ہے کہ ان لوگوں نے عاصم دس کر کے دریائے نیل میں چھینک دیا ہوگا۔ ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جنگ کی کھفتوں سے تنگ آگیا ہو اور عمت یاب ہونے کے بعد چھپتا چھپاتا اپنے وطن پہنچ گیا ہو۔ اگر تمہیں مجھ پر یقین نہیں آتا تو اپنے آبا جان سے تبدیل کر لینا وہ دو چار دن تک یہاں آجائیں گے۔“

فسطینہ کچھ دیر سکتے کے عالم میں کھڑی رہی۔ پھر اُس کے بھینچے ہوئے اونٹ لڑزنے لگے اور پتھرائی ہوئی ٹھوکوں سے آسٹروں کا سیلاب اٹھ پڑا۔ ایرج نے اُس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے قریب بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ ایک بجلے کے ساتھ ہاتھ پھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔

ایرج نے کہا۔ ”فسطینہ تمہارے آسٹرو اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ میرے شبہات غلط نہ تھے۔ لیکن اب بھی اگر تم اپنے دل سے اُس کا خیال نکال دو تو میں تمہارے ماضی کی ہر لغزش فراموش کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

فسطینہ کی رگوں کا سارا خون سمٹ کر اُس کے چہرے میں آگیا اور اُس نے کہا۔ ”مجھ سے کوئی لغزش نہیں ہوئی اور مجھے تمہارے رحم کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم ایک شریف اور بہادر آدمی کے ساتھ اس قدر نفرت کر سکتے ہو۔ تم شاید اپنے دل میں یہ خیال لے کر آئے تھے کہ عاصم کے روپوش ہونے کی اطلاع سن کر میں تم سے یہ کہوں گی کہ اب میرے دل میں تمہارے لئے جگہ خالی ہو چکی ہے۔ لیکن تمہاری یہ خوشی مجھے ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو تم مجھے اس کا انتظار کرنے سے نہیں روک سکتے۔ اور اگر وہ مر چکا ہے تو تم میرے دل سے اُس کی یاد نہیں جھلا سکتے۔ ایرج اگر تمہیں اپنی برتری کا غور ہے تو سنو، اگر آسمان کے ستارے تمہارے پاؤں چھونے کے لئے زمین پر اترائیں، تو بھی میری نگاہوں میں تم عاصم نہیں بن سکتے۔“

ایرج نے کہا۔ ”مجھے معلوم نہ تھا کہ ایک وحشی عرب کی موت کی خبر سن کر تم اپنے ہوش و حواس

اُس نے جواب دیا "میں جن لوگوں کو جانتی ہوں، وہ اُن سب سے زیادہ بہادر نیک اور رحمدل متاثر اگر اُسے دیکھنا، جاننا اور پرستش کے قابل سمجھنا ایک لغزش تھی تو میں مرتے دم تک اپنی اس لغزش پر فخر کروں گی۔" ایرج نے زخم خوردہ ہو کر کہا۔ فلسطین میں تمہیں چرانے کے لئے نہیں آیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک سنا شناس لڑکی ہو، اور تمہارے دل میں ایک ایسے شخص کے لئے احسانندی کے جذبات کا سیدار ہونا ایک قدرتی بات ہے جس نے مصیبت کے وقت تمہاری اعانت کی تھی۔ تمہاری وجہ سے اُسے میں بھی اپنا عمن سمجھنا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک عرب ہمارے درمیان کھڑا ہو جائے۔ میں نے اگر تمہاری دل آزاری کی ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم بارہا اُس کا نام لے کر مجھے چرانے کی کوشش کر چکی ہو لیکن ان سب باتوں کے باوجود اگر میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہے جس سے تمہاری عبرت کو ٹھیس پہنچی ہو تو میں صدق دل سے معافی کا طلبگار ہوں۔ فلسطین آؤ، میرے پاس بیٹھ جاؤ، میں آئندہ کبھی تم سے یہ نہیں کہوں گا کہ تمہیں عاصم کو بھول جانا چاہیے۔"

ایرج اٹھ کر آگے بڑھا لیکن فلسطین بھاگ کر برابر کے کمرے میں چلی گئی۔ اور جلدی سے دروازہ بند کر کے بستر پر منہ کے بل گر پڑی۔

ایرج نے دروازے کو دھکے دینے کے بعد کہا "فلسطین دروازہ کھولو، فلسطین پاگل نہ بنو۔" یوسبیا کمرے میں داخل ہوئی، اور ایرج پریشان ہو کر پچھے بٹ گیا۔ یوسبیا نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری لڑائی شروع ہو چکی ہے۔"

ایرج نے جواب دیا "میں اسے ایک بڑی خبر سنانے کی غلطی کر چکا ہوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ مجھ اس قدر خفا ہو جائے گی۔"

"کیسی خبر؟" یوسبیا نے بدحواس ہو کر سوال کیا۔

ایرج نے جواب دیا "مصر سے اطلاع آئی ہے کہ عاصم لاپتہ ہو چکا ہے۔"

یوسبیا کے استفسار پر ایرج نے اس اطلاع کی تفصیلات بیان کر دیں اور وہ نڈھال سی ہو کر کرسی

ایرج نے کہا "میں اپنے ساتھیوں کے پاس جا رہا ہوں، اگر مجھے وہاں دیر لگ جائے تو آپ کھانے کے لئے میرا انتظار نہ کریں۔"

یوسبیا نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا، لیکن اُسے کچھ کہنے کا موقع دینے بغیر جلدی سے باہر نکل گیا۔ یوسبیا کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھی رہی، پھر وہ اٹھ کر آگے بڑھی اور برابر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد فلسطین کو آوازیں دینے لگی۔ "فلسطین دروازہ کھولو۔ فلسطین! فلسطین!"

کچھ دیر اُسے اندر سے کسی جواب کے بجائے دبی دبی سسکیاں سنائی دیتی رہیں، پھر فلسطین نے دروازہ کھول دیا اور روتی ہوئی اپنی ماں کے ساتھ پلٹ گئی۔

ماں نے بھرائی ہوئی آوازیں کہا "بیٹی میں کئی دن سے یہ محسوس کر رہی تھی کہ مصر سے کوئی بڑی خبر آنے والی ہے۔ اب تمہیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔"

وہ بولی "امی جان! عاصم کا خون میری گردن پر ہے۔" میں نے ہی اُسے میدانِ جنگ کا راستہ دکھایا تھا۔"

"اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں بیٹی۔ کم از کم ایرج کے سامنے تمہیں جوصلے سے کام لینا چاہیے۔" فلسطین نے جواب دیا "آج ایرج کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مسکرانا میرے بس کی بات نہیں۔ اس دنیا میں میرے سوا عاصم کے لئے آنسو بہانے والا کون ہے؟"

یوسبیا نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "بیٹی! اگر وہ مر چکا ہے تو تمہارے آنسو اُسے واپس نہیں لاسکتے۔"

"امی جان! میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اُسے زندہ رہنا چاہیے۔"

"بیٹی خدا کرے اُس کی موت کی خبر غلط ہو۔"

"امی جان! سچ کہیے، اگر وہ زندہ ہو اور یہاں پہنچ جائے تو آپ اپنے پر ایک بوجھ محسوس نہیں کریں گی؟"

”میں یہ محسوس کر دوں گی کہ قدرت نے اُسے میری بیٹی کے آنسو پونچھنے کے لئے بھیجا ہے۔ میں تمہاری ماں ہوں فلسطینہ۔ اور ایک ماں کی اس سے بڑی خواہش اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی تمام نعمتیں اور زندگی کی ساری خوشیاں اُس کی بیٹی کے قدموں میں ڈھیر کر دی جائیں“

”اتنی ابرج، یہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کے راستے سے پہاڑ ہٹ گیا ہے۔ وہ آج بہت خوش تھا۔ لیکن آپ میرے ساتھ وعدہ کریں کہ آپ اُس کی حوصلہ افزائی نہیں کریں گی۔ ایسے سنگدل انسان کے ساتھ زندگی گزارنے کی بجائے میرے لئے ایک راہبر بن جانا زیادہ آسان ہوگا۔ وہ آپ کا ممان ہے، لیکن میرے پاس اُس کی ضیافت کے لئے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اُس نے کئی بار مجھ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ ایران کا کوئی خاندان اُسے ناراض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا اور اُس کے نزدیک میری یا میرے والدین کی پسند یا ناپسند بے معنی ہے۔ اگر میرے آبا جابان اُس کے سامنے اس قدر بے بس ہیں تو میرا مانا بہتر ہے“

”تمہارے آبا جابان، ابرج کے خاندان سے بگاڑنا پسند نہیں کریں گے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں کوئی مرعوب کر سکتا ہے۔ اگر ابرج نہیں ناپسند ہے تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں اُس کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی“

”آپ کو معلوم ہے کہ مجھے مرعوب کرنے کے لئے اُس کا آخری حربہ کیا تھا؟ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم ایک عیسائی ماں کی بیٹی ہو۔ اس لئے میں جب چاہوں اپنی لونڈی بنا سکتا ہوں“

یوسیبیانے کہا۔ مجھے یہ اُمید نہ تھی کہ وہ اس حد تک کیلنگی پر اتر آئے گا، لیکن تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اگر عیسائیت کے ساتھ ہمارا رشتہ تمہارے آبا جابان کو کوئی نقصان پہنچا سکتا تو شہنشاہ ایران کے قلم سرداروں کو نظر انداز کر کے قسطنطنیہ فتح کرنے کی ہم اُن کے سپرد نہ کرتا۔ شہنشاہ کے دربار میں تمہارے آبا جابان کے حاسدوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ میں تھینوڈوسیوس کی بیٹی ہوں، لیکن جب تک شہنشاہ کو ہماری مذلت کی ضرورت ہے کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ابرج ہماری برائی سوچ سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اُس نے کسی بات سے چڑھ کر تمہیں پریشان کرنے کی کوشش کی ہو۔ بہر حال اب وہ رخصت پر جا رہا ہے، شاید وہیں اسے کوئی عہدہ مل جائے، اس لئے تمہیں غصے یا نفرت کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ گھر جا کر

تدارا خیال ہی چھوڑ دے اور ہمیں اُس کے خاندان کے ساتھ بگاڑنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔“

ماں اور بیٹی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ نوکر لھانا تیار کر چکے تھے۔ لیکن ابرج ابھی تک غیر حاضر تھا۔ یوسیبیانے کہا۔ ”اب بہت دیر ہو گئی ہے، میں نوکر کو بھیج کر اُسے بلاتی ہوں۔“

فلسطینہ نے اٹھ کر کہا۔ ”اتنی مجھے بھوک نہیں، میں اپنے کمرے میں جاتی ہوں۔“

”بیٹی بھوک تو مجھے بھی نہیں، لیکن وہ بڑا مانے گا۔“

”اسی، اگر آپ کو اُس کی ناراضگی کا اس قدر خوف ہے تو آپ اُسے کہہ دیں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں“ فلسطینہ یہ کہہ کر برابر کے کمرے میں چلی گئی۔ یوسیبیا چند تانیسے پریشانی کی حالت میں کھڑی رہی، پھر اُس نے ایک نوکر کو آواز دے کر بلایا اور کہا۔ ”تم ابرج کو بلا لاؤ۔“

نوکر باہر چلا گیا اور یوسیبیا دروازے میں کھڑی ہو کر صحن کی طرف جھانکنے لگی۔ محفوضی دیر بعد نوکر واپس آیا تو اُس کے ساتھ ابرج کی بجائے قلعے کا محافظ تھا۔ اُس نے جھک کر یوسیبیا کو سلام کیا اور کہا۔ ”جناب وہ شہر کی طرف نکل گیا ہے۔ اُس کی حالت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔“ یوسیبیانے پریشان ہو کر کہا۔

”جناب وہ بہت زیادہ شراب پی چکا تھا اور میں نے اُسے آپ کے پاس بھیجنا نامناسب سمجھ کر واپس اُس کے کھانے کا انتظام کر دیا تھا“

یوسیبیانے کہا۔ ”اور اب وہ تہر میں کسی مکان کا دروازہ توڑ رہا ہوگا۔“

قلعے کے محافظ نے کہا۔ ”اُسے روکنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ اُس کے سامنے بھی میری بات سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لئے میری آخری کوشش یہی تھی کہ وہ قلعے کے اندر کوئی بد مزگی پیدا نہ کریں۔“

فلسطینہ کمرے سے باہر نکلی اور اُس نے کہا۔ ”کیا ہوا اتنی جان؟“

”کچھ نہیں بیٹی، ابرج شراب پی کر شہر کی طرف نکل گیا ہے۔“

فلسطینہ نے قلعے کے محافظ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ تم اس شہر کے حاکم ہو؟“

”مجھے معلوم ہے لیکن ابرج جیسے لوگوں پر میرا حکم نہیں چلتا۔ اُس کے ساتھ گیارہ مسلح آدمی

”اور تم نے اس شہر کے بے بس انسانوں کو ان گیارہ بیڑوں کے دم دم پر چھڑ دیا ہے۔ تمہارا پاس کتنے آدمی ہیں۔“

”جناب میرے پاس ڈیڑھ سو آدمی ہیں، لیکن میں ایرج کے خلاف کسی کارروائی کی جرأت نہیں کر سکتا۔“
 فلسطینہ نے چلا کر کہا ”میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ تم اپنے سپاہی لے کر ان کا پھینچا کرو۔“ اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ رات کے وقت اس شہر کی کسی بے بس لڑکی کی چنجیں سنی گئی ہیں تو تم اس قلعے کے محافظ نہیں ہو گے۔“
 ”جناب! اگر وہ مزاحمت کریں تو؟“

”اگر وہ مزاحمت کریں تو انہیں باندھ کر یہاں لے آؤ۔“

”مجھے آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں، لیکن آپ کو نناج کی ذمہ داری لینی پڑے گی۔“

فلسطینہ نے چلا کر کہا ”تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ جاؤ۔“

قلعے کا محافظ یوسیدیا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”جناب! آپ کا بھی یہی حکم ہے؟“

یوسیدیا نے جواب دیا ”سین کی بیٹی کا حکم سننے کے بعد تمہیں مجھ سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔“

اور میں یہ نہیں سمجھتی کہ چند شراب سے بدست آدمیوں کو قابو میں رکھنے کے لئے تمہیں کسی لشکر کی ضرورت ہے۔“

قلعے کا محافظ کچھ اور کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا اور یوسیدیا نے نڈھال سی ہو کر کرسی پر بیٹھنے ہوئے کہا

”فلسطینہ یہ معاملہ بہت خطرناک ہے، مجھے! اب! ایرج گھ جا کر جمارے خلاف طوفان مچا کر دے گا۔ کاش!

تمہارے آبا جاجان آج یہاں ہوتے۔“

”اتنی، اگر آبا جاجان یہاں ہوتے تو ایرج شراب سے مددوش ہو کر شہر کا رخ کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ مجھے یقین

ہے کہ وہ قلعے کے محافظ پر یہ اعتراض نہیں کریں گے کہ تم نے ایرج اور اُس کے ساتھیوں کو رات کے وقت

لوگوں کے گروں میں گھسنے سے کیوں روکا تھا۔ فرض کیجئے اگر شہر میں کوئی سر بھرا ایرج کو قتل کر دے تو قلعے کے

محافظ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم نے ایک بیوقوف انسانوں کو خطرے سے بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟

کیا اس سے قبل کئی بستیوں میں اس قسم کے واقعات پیش نہیں آئے؟“

فلسطینہ ہوش بہت حد تک کم ہو چکا تھا اور وہ اپنی ماں سے زیادہ اپنے آپ کو تسلی دینے کی

کوشش کر رہی تھی۔

ایک ساعت پریشانی اور اضطراب کی حالت میں انتظار کرنے کے بعد انہیں قلعے کے دروازے کی طرف آدمیوں کا شور سنائی دیا۔ اور وہ اٹھ کر اپنے کمرے سے باہر نکلتے گئیں۔ ایک نوکر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا ”قلعے کے سپاہی ایرج اور اُس کے ساتھیوں کو پکڑ کر لے آئے ہیں۔“

یوسیدیا نے پوچھا ”شہر میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟“

”نہیں سپاہی کہتے ہیں کہ جب ہم شہر میں داخل ہوئے تھے، تو یہ لوگ ایک گلی سے چند پتھر کھانے کے

بعد چپختے چلاتے واپس آ رہے تھے۔ ایرج کے ایک ساتھی کا سر مٹھا ہوا ہے اور میرے خیال میں وہ چند دن

سفر کے قابل نہیں ہوگا۔“

صحن میں کسی کے جھاری قدروں کی آہٹ سنائی دی اور نوکر نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا ”شاید قلعے کے

محافظ آ رہے ہیں۔“

یوسیدیا نے کہا ”اچھا تم جاؤ۔“

نوکر چلا گیا اور قلعے کے محافظ نے دروازے کے قریب پہنچ کر کسی تمہید کے بغیر کہا ”جناب میں انہیں

لے آیا ہوں اور مجھے خوش قسمتی سے ان کے ساتھ جھگڑا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔“

یوسیدیا نے کہا ”ہمارا نوکر کہتا ہے کہ شہر کے لوگوں نے ان پر پتھر برسائے تھے؟“

جی ہاں، اور یہ اٹھ پاؤں واپس آ رہے تھے۔ ایرج نے ہمیں دیکھا تو اُسے یہ غلط فہمی ہوئی کہ ہم اُس کی

مدد کے لئے آئے ہیں۔ اُس نے مجھے کسی تالیف کے بغیر حملہ کرنے کا حکم دیا، لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں

سپہ سالار کے حکم کے بغیر اس شہر کے باشندوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔ سچ پوچھئے تو مجھے شہر کے

باشندوں سے قطعاً یہ توقع نہ تھی کہ وہ کسی ایرانی پر پتھر برسائے کی جرأت کریں گے، لیکن قدرت کو شاید میری

عزت رکھنا منظور تھی میرے خیال میں انہوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ ڈاکوؤں کی کوئی ٹولی آگئی ہے۔ ایرج مجھ سے

سخت خفا ہے۔ اور اُس نے مجھے بہت دھمکیاں دی ہیں۔ لیکن میں اُسے سمجھا بھجا کر واپس لے آیا ہوں۔

اب وہ میری شکایت لے کر آپ کے پاس آنا چاہتا تھا، لیکن میں نے اُسے یہ کہہ کر روک دیا ہے کہ آپ آرام

کر رہی ہیں۔ اُس کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علی الصباح یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔
 قسطنطنیہ نے کہا۔ ”امی جان، اُس کے ساتھ بات کرنا پسند نہیں کریں گی۔ اور مجھے یہ بھی امید نہیں کہ شراب
 کا نشتر آنے کے بعد وہ ہمارے سامنے آنے کی جرأت کرے گا۔“

باب ۲۹

قلعے کا محافظ ادب سے سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ اور یسیدیا نے دروازہ بند کرنے کے بعد قسطنطنیہ کا بازو پکڑ
 کہا۔ ”چلو، بیٹی اب آرام کرو۔“

قسطنطنیہ کچھ بے غیر اُس کے ساتھ دوسرے کمرے میں داخل ہوئی اور وہ دونوں اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔
 یسیدیا کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد سو گئی، لیکن قسطنطنیہ پچھلے پہر تک کروٹیں بدلتی رہی۔ بالآخر اُسے نیند آگئی۔ رات
 دن وہ بیدار ہوئی تو کمرے کے موزن سے سورج کی شعائیں اُس کی آنکھیں، اور یسیدیا اُس کے بستر کے قریب
 کھڑی تھی۔ یسیدیا نے کہا۔ ”اٹھو، بیٹی اب دوپہر ہونے والی ہے۔“

قسطنطنیہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور کچھ دیر خاموشی سے اپنی ماں کی طرف دیکھتی رہی، بالآخر اُس نے پوچھا۔
 ”وہ چلا گیا ہے؟“

”وہ صبح ہوتے ہی چلا گیا تھا۔ اور تمہارا خیال درست تھا، اس نے میرے پاس آنے کی جرأت نہیں کی۔“
 قسطنطنیہ نے کہا۔ ”اتنی عاصم زندہ ہے، میں نے اُسے خواب میں دیکھا ہے۔“

یسیدیا نے قریب بیٹھ کر قسطنطنیہ کا سراپا گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی خدا کرے وہ زندہ ہو۔“

بازنطینی سلطنت ایشیا اور افریقہ کے عماذوں پر ایرانیوں کے ہاتھوں پے درپے شکستیں کھانے کے بعد
 برپ میں بھی ایک انتہائی تشویش ناک صورت حال کا سامنا کر رہی تھی۔ یہاں قسطنطنیہ اعظم کے جانشین کسی منظم
 سلطنت یا لشکر کی بجائے اُن خانہ بدوش وحشیوں کے ایک نئے طوفان کا سامنا کر رہے تھے، جو گزشتہ صدیوں
 میں بارہا وسط ایشیا سے نکل کر کبھی بحیرہ خزر اور بحیرہ اسود کے جزیری اور کبھی شمالی علاقوں کو روندتے ہوئے یورپ
 اترتے اور بربادی کا پیغام دیا کرتے تھے۔ شکاریوں اور چرواہوں کی اس قوم کو جب اپنی بڑھتی ہوئی آبادی
 کے لئے وسائل حیات کی کمی محسوس ہونے لگی تو وہ نئی زمینوں کی تلاش میں نکل پڑتے اور پھر جو ہنڈلے ترقی یافتہ
 نئے اُن کے راستے میں آتے، وہاں تہذیب و تمدن کے سارے چراغ بجھا دیئے جاتے۔ لہذا نئے حکمت
 سرسبز باغات ویران ہو جاتے اور خوشحال بستیوں اور پر رونق شہروں کی جگہ دالکھ کے ڈھیر اور لاشوں کے
 انبار دکھائی دیتے۔ پھر یہی خانہ بدوش کچھ مدت لوٹ مار پر گزارا کرنے کے بعد آہستہ آہستہ آرام اور فراغت
 لے نکلنے کے عادی ہو جاتے۔ اپنے آبائی وطن کی برفانی ہواؤں اور نیم زمینیوں کی بجائے مفتوحہ علاقوں کی تیزری
 زمیں کا اعتدال اور وسائل حیات کی فراوانی کے باعث اُن کی سمعت اُن کی سمعت کو شی اور جفاکشی، تن آسانی اور عافیت
 پسندی میں تبدیل ہونے لگتی، بسیدہ کھالوں کے جھونپڑے کشادہ مکانوں سے بدل دیئے جاتے۔ خانہ بدوشی
 کی بُلکھداریت کا شعور ابھرنے لگتا۔ مکھن بستیوں، اور بستیوں، شہروں میں تبدیل ہو جاتیں۔ شکاری اور چرواہے
 سالن بن جاتے اور چرواہوں اور ویرانوں کی جگہ حکمت اور باغات دکھائی دینے لگتے۔ لیکن پھر صحرائے کوئی اور
 شہریاکی دستوں سے ننگے اور بھوکے انسانوں کا کوئی اور قافلہ اٹھتا اور یہ ہنڈلے تن آسانی اور عافیت پسند

لوگ وحشت اور بربریت کے ایک نئے سیلاب کے سامنے تنکوں کے انبار ثابت ہوتے۔

روم اور ایران کی جنگوں کے اس دور میں خانہ بدوشوں کے جو قبائل شمال مشرقی یورپ کو ہرب کے اور اطالیہ کو آگ و خون کا پیغام دینے کے بعد تھریس کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ شاید ان تمام قبائل سے زیادہ خونخوار تھے، جنہوں نے گزشتہ ادوار میں مغرب پر یونان کی تھی۔ اور بازنطینی سلطنت پر ایک کاری ضرب لگانے کے لئے جو سازگار حالات ان لوگوں نے دیکھے تھے۔ وہ شاید کسی آدر نے نہیں دیکھے۔ رومی عقاب زنجی ہو چکا تھا۔ ایرانیوں نے اُس کے پر نوج لئے تھے، اب اُسے ہلاک کرنے کے لئے کسی جرأت یا ہمت کی ضرورت نہ تھی۔ آوار قبائل کا خاقان دریائے ڈینیوب سے لے کر اطالیہ تک ہزاروں بستیاں تباہ کرنے اور لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ترقیہ کے قریب ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ مشرقی یورپ سے تباہ حال لوگوں کے قافلے قسطنطنیہ اور اُس کے مضافات میں پناہ لے رہے تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ تاناریوں کی دندگی اور سفاکی کی جو داستانیں لاتے تھے، ان کے باعث شہر میں سرسنگی پھیلی ہوئی تھی اور ہر آن یہ خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ اچانک کسی وقت گردوغبار کے بادلوں سے وحشیوں کا لشکر نمودار ہوگا اور مضافات کی سینٹیوں سے لے کر قیصر کے محل تک لاشوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔

افریقہ اور ایشیا میں اپنے زنجیر علاقوں سے محروم ہونے کے باعث قسطنطنیہ کے عوام پہلے ہی قحط کا سامنا کر رہے تھے، اب پناہ گزینوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے جھوک اور افلاس کا مسئلہ زیادہ تشویش انگ صورت اختیار کر چکا تھا۔ قیصر کی یالوسی اور بددلی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ ایک دن جب قسطنطنیہ کا استغی اعظم سر جسین سینٹ صوفیہ کے عظیم الشان گرجے میں گریہ و زاری کر رہا تھا، اُسے یہ اطلاع ملی کہ ہرقل قرطابہ کی طرف فرار ہونے کا فیصلہ کر چکا ہے اور اُس کا ساؤ سامان جہازوں پر لادا جا رہا ہے۔ سر جسین کرب و اضطراب کے عالم میں گرجے سے نکلا اور با پینٹا کا پینتا قیصر کے محل میں داخل ہوا۔ شہنشاہ اور ملکہ سفر کی تیاریوں میں مصروف

سلہ آوار، سینتین قوم سے تعلق رکھتے تھے اور عام طور پر انہیں بھی وسط ایشیا کے دوسرے قبائل کی طرح

تاناریوں کے نام سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔

نے، اور کسی کو ملاقات کی اجازت نہ تھی، لیکن پہریداروں کو قسطنطنیہ کے استغی اعظم کا راستہ روکنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ہرقل اپنا غم غلط کرنے کے لئے شراب پی رہا تھا۔ سر جسین کو دیکھ کر اُس کے ہاتھ سے سونے کا پیالہ پڑا اور اُس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا "مقدس باپ مجھے معلوم ہے، آپ کس لئے آئے ہیں لیکن اب ش سے کوئی فائدہ نہیں، میں دار الحکومت تبدیل کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

سر جسین اطمینان سے ہرقل کے سامنے بیٹھ گیا اور پھر قدرے توقف کے بعد بولا "آپ اس لئے آگ رہے ہیں کہ قسطنطنیہ کے حالات مخدوش ہو چکے ہیں، لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر قرطابہ کو کوئی ذرہ پیش آیا، اگر ایرانی یا آوار دہاں پہنچ گئے تو آپ کہاں جائیں گے؟"

ہرقل نے عاجز ہو کر جواب دیا "مقدس باپ آپ مجھے بزدلی کا لہجہ نہیں دے سکتے۔ میں کئی برس ایرانیوں کے ساتھ لڑ چکا ہوں، اگر صرف کسری کے لشکر کے ساتھ مقابلہ ہوتا تو شاید ہم چند برس اور انہیں بٹائے سفورس کے پار روک سکتے تھے۔ لیکن ان نئے درندوں کو روکنا میرے بس کی بات نہیں۔ میرے سپاہی ان کے نام سے لڑتے ہیں۔ میرے سالار یالوسی اور بددل ہو چکے ہیں۔ میرا خزانہ خالی ہے میں اپنے امراء اور اپنے عوام سے مزید قربانیوں کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ قرطابہ پہنچ کر مجھے تیاری کے لئے موقع مل سکتا ہے ذرا، بحری قوت کے بغیر وہاں نہیں پہنچ سکتے، اگر ایرانیوں نے وہاں تک ہمارا پیچھا کیا تو بھی ہمیں تیاری کے لئے جہلت ضرور مل جائے گی۔"

سر جسین نے جواب دیا "نہیں، نہیں آپ اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش نہ کریں، آپ بازنطینی سلطنت کے حکمران ہیں اور قسطنطنیہ کے بغیر اس سلطنت کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔ آپ سرکٹوانے کے بعد پانچویں کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ آپ ان لوگوں کو دشمن کے دم و دم پر چھوڑ کر نہیں جا سکتے، جن کے بیڑوں سے بھائیوں نے آرمینیا، شام اور مصر کے میدانوں میں آپ کے جھنڈے تلے جانیں دی ہیں، اگر آپ نے غلطی نہ کی تو قرطابہ کے لوگ آپ کے لئے اپنے خون کا ایک قطرہ بہانے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ انطلیہ، دمشق اور اسکندریہ چھین جانے کے بعد قسطنطنیہ اس دنیا میں عیسائیت کا آخری حصار ہے۔ اور اگر یہ حصار نہ ہوگا

ہو گیا تو اس دنیا سے عیسائیت کے سارے چراغ بج جائیں گے۔ پھر ممکن ہے کہ آپ اس غلط فہمی کے کسی نامعلوم گوشے میں چند سال اور سکتے رہیں، لیکن جو لوگ آزادی اور عزت کی نعمتوں سے آشنا ہیں، ان کے لئے ایسی زندگی کا ہر لمحہ موت سے زیادہ بھیانک ہوگا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ برقل جسے میں جانتا ہوں، جس کی فتح اور نصرت کے لئے آج ہر فتناء اور ہر گرجے میں دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ جسے قدرت نے بدترین حالت میں کلاماً محافظ بنا کر بھیجا تھا۔ اور جس کے سر پر میں نے اپنے ہاتھوں سے تاج رکھا تھا، مجھے خدا اور اس کے بندوں کے سامنے شرمسار نہیں کرے گا۔“

برقل نے نضال ساہوکر سر جس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مقدس باپ، آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ سنیٹ کے ارکان کی اکثریت میرے فیصلے کی تائید کر چکی ہے۔“

سر جس نے جواب دیا۔ ”سنیٹ کے ارکان کی اکثریت کی تائید سے ایک غلط فیصلہ صحیح نہیں ہو سکتا لیکن میں یہاں اس مسئلے پر بحث نہیں کروں گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں، آپ میرے ساتھ سنیٹ صوفیہ کے مقدس گرجے میں تشریف لے چلیں، مجھے یقین ہے کہ وہاں بزرگان دین کی رومیں ہماری راہنمائی کریں گی۔“

برقل تذبذب کی حالت میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سر جس اٹھا اور آگے بڑھ کر ادب کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ”آئیے!“

برقل اپنی بھاری قبائلی سنبھالتا ہوا، اس کے ساتھ چل دیا۔ شہر کے عوام جو برقل کے ارادے سے ناخبر ہو چکے تھے، محل کے دروازے کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ اور بعض دل جلے پر جوش نفروں سے اپنے غم و غصہ کا اظہار کر رہے تھے۔ پیریدار انہیں اپنے نیزوں کی مدد سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شرمندہ امت اور خوف کے احساس سے برقل کو دروازے سے باہر پاؤں رکھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ سر جس بچوم کا جوش و خروش دیکھ کر چند قدم آگے بڑھا اور بلند آواز میں چلایا۔ ”بھائیو! راستہ چھوڑ دو، تمہارے شہنشاہ، تمہاری سلامتی کی دعا مانگنے کے لئے سنیٹ صوفیہ کے مقدس گرجے میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔“ ان الفاظ نے بچوم پر جادو کا سا اثر کیا اور وہ راستہ چھوڑ کر ادھر ادھر سمٹنے لگے۔

برقل مسلح پیریداروں کی حفاظت میں گرجے میں داخل ہوا اور ان کی آن میں وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ سر جس نے ایک دولا انگریز تقریر کے بعد کلیسا اور سلطنت کے لئے فتح و نصرت کی دعائیں مانگی اور پھر رب طلب نگاہوں سے برقل کی طرف دیکھنے لگا۔ برقل کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی ذہنی فیصلہ جواب دے چکی ہے۔ اُس نے مغموں اور اندر دیکھا ہوں سے لوگوں کی طرف دیکھا اور گردن جھکائی۔ رب جو سکتے کے عالم میں اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ سرگوشیاں کرنے لگے۔ سر جس نے کہا ”عالمیہ رب کی دعایا اپنی قسمت کا فیصلہ سننا چاہتی ہے۔“

برقل نے دوبارہ گردن اٹھائی، تو اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ چند ثانیے وہ حاضرین کی زلف دیکھتا رہا، اور پھر اچانک استغفرت اعظم کے سامنے دو زانو ہو کر بولا۔ ”مقدس باپ! میں کلیسا اور اپنی رعایا کے سامنے شرمسار ہوں۔ میں یہ عہد کرتا ہوں کہ میں قسطنطنیہ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میری زندگی اور موت ان دونوں کے ساتھ ہے۔ آپ دعا کریں کہ خدا مجھے ایک حکمران کی ذمہ داریوں سے عہدہ براہوں کی ہمت دے۔“

تھوڑی دیر بعد جب برقل گرجے سے نکل کر اپنے محل کا رخ کر رہا تھا تو عوام مسلح پیریداروں کو ادھر ادھر دیکھ کر اُسے اپنی حفاظت میں لے چکے تھے۔ اور وہ جو تھوڑی دیر قبل اُسے ملامت کر رہے تھے، اب انتہائی ہوش و خروش کے ساتھ اُس کی سلامتی اور فتح کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔



قسطنطنیہ کی خوشگوار آب و ہوا میں عاصم کی صحت آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہی تھی۔ کلاڈیوس کے گھر میں اُسے زندگی کا ہر آرام میسر تھا۔ مرقس جو شاید عام حالات میں ایک عرب کے ساتھ بات تک کرنا پسند نہ کرتا اُسے اپنے بیٹے کا محسن سمجھ کر ہر ممکن طریقے سے اُس کی دلجوئی کیا کرتا تھا۔ انطونیا کی طرح جو لیا جی اُس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ دیویس جس کا جہاز باسفورس کے جنگی بیڑے کے ساتھ شامل کر دیا گیا تھا، کلاڈیوس کی طرح اُس کا گرویدہ بن چکا تھا اور قریباً ہر شام اُس کے پاس آیا کرتا تھا۔ لیکن عاصم کو ایک مستقل جہان کی حیثیت سے وہاں ٹھہرنا پسند نہ تھا۔ چنانچہ قسطنطنیہ میں قریباً ایک ماہ آرام کرنے کے بعد اُس نے مستقبل کے متعلق سرچنا شروع کر

دیا۔ چند بار اُس نے کلاڈیوس کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ ابھی تمہاری صحت ٹھیک نہیں ہوئی۔ تمہیں کچھ عرصہ اور آرام کی ضرورت ہے۔ جب تم تندرست ہو جاؤ گے تو تمہارے لئے کوئی موزوں کام تلاش کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ سردست تمہیں میرے گھر کو اپنا گھر بنا چاہئے۔ عاصم کی طرح فرس کو بھی اپنے داماد کے گھر میں ایک مستقل جہان کی حیثیت پسند نہ تھی۔ معمولی کاروبار شروع کرنے کے لئے اُس کے پاس کچھ سرمایہ موجود تھا اور اُس نے قسطنطنیہ میں اطمینان کا سانس لیتے ہی گلیوں اور بازاروں کے چکر لگانے شروع کر دیئے تھے۔ عاصم کو اُس کے ارادے کا پتا چلا تو اُس نے اپنی ساری پونجی اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: ”آپ مجھے اپنا شریک سمجھیں اور بلا توقف کوئی کام شروع کر دیں۔“

ایک شام فرس نے اُس سے کہا: ”بیٹا میں نے ساری زندگی سرمائے کا کاروبار کیا ہے اور قسطنطنیہ میں مجھے اپنے لئے اس سے زیادہ اور کوئی موزوں مشغلہ نظر نہیں آتا۔ آج میں نے شہر سے باہر ایک کشادہ مکان دیکھا ہے، جسے معمولی ردوبدل کے بعد ایک اچھی خاصی سرمائے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس مکان کا مالک قسطنطنیہ کے حالات سے مایوس ہو کر اپنے بال بچے قرطاجنہ بھیج چکا ہے اور اب اپنی جائیداد ٹکانے لگانے کی فکر میں ہے۔ میں اُس کے ساتھ قیمت کے متعلق بات چیت شروع کر چکا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ یہ مکان ہمیں بہت ستے داموں مل جائے گا۔ لیکن مجھے یہ الجھن ہے کہ رومی امراء اس قسم کے کاروبار کو پسند نہیں کرتے۔ کلاڈیوس، شاید میری مخالفت نہ کرے، لیکن اُس کا باپ یقیناً یہ پسند نہیں کرے گا۔“

عاصم نے کہا: ”قسطنطنیہ میں یہ کام یقیناً آپ کے شایان شان نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کلاڈیوس آپ کے احترام کی وجہ سے خاموش رہے، لیکن اُس کے لئے اپنے احباب کا یہ طعنہ یقیناً ناقابل برداشت ہوگا، کہ اُس کا خسر ایک معمولی سرمائے چلارہا ہے۔ اگر آپ مجھ پر اعتماد کر سکیں تو آپ کی طرف سے یہ کام میں اپنے ذمہ لینے کے لئے تیار ہوں۔ یہاں میری حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں اگر جنگل سے لکڑیاں لاکر فروخت کروں تو بھی مجھے کوئی ملامت نہیں کرے گا۔ اگر آپ پسند کریں تو میں بھی اپنی تھوڑی سی پونجی اس کاروبار میں لگانے کے لئے تیار ہوں۔“

فرس نے جواب دیا: ”بیٹا میں اپنی ذات سے زیادہ تمہارے مستقبل کے متعلق سوچتا ہوں، اس کے

میں اگر میں کوئی کام شروع کرنا چاہتا ہوں تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں نہیں اپنا شریک کار بنانا چاہتا ہوں۔ ایک بوڑھے آدمی کو دو وقت کی روٹی کے لئے کسی بھاگ دوڑ کی ضرورت نہیں، لیکن تم ابھی جوان ہو اور تمہیں یہاں اپنی زندگی کے باقی دن گزارنے کے لئے کسی شغل کی ضرورت ہے۔ اگر تمہارے پاس ایک لڑی بھی نہ ہوتی تو بھی میں تمہیں اپنے ساتھ برابر کا حصہ دار بنانے پر اصرار کرتا۔ جب تم ابھی طرح تندرست ہو جاؤ گے تو ہم کسی تاخیر کے بغیر یہ کام شروع کر دیں گے۔ ابتدا میں تمہیں سارا کام سنبھالنا پڑے گا اور میں بننا ہر ایک دوست اور مددگار کی حیثیت میں تمہارے پاس آیا کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصہ بعد کلاڈیوس اور اُس کا باپ ہمیں دو ساتھیوں کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی ہو جائیں گے اور میں کھلے بندوں تمہارا شریک کار بن جاؤں گا۔ لیکن پہلے میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم سچ سچ ہمیشہ کے لئے قسطنطنیہ کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر چکے ہو؟“

عاصم نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد جواب دیا: ”آپ کو ابھی تک اس بات کا یقین نہیں آیا کہ ماضی کے ساتھ میرے تمام رشتے ٹوٹ چکے ہیں؟“

فرس نے جواب دیا: ”میں اکثر یہ سوچتا ہوں، تم قسطنطنیہ میں زیادہ عرصہ خوش نہیں رہ سکو گے اور کسی نہ کسی دن ماضی کی بعض حسین یادیں تمہیں آبنائے باسفورس کے پارے جائیں گی۔“

عاصم پھر تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا، بالآخر اُس نے گردن اٹھا کر فرس کی طرف دیکھا اور کہا: ”ماضی کے دامن میں میرے لئے اب سب سے بڑا اور یادوں کے سوا کچھ نہیں۔ میں ایک درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح ہوں، جسے دریا کی طغیانیاں کوسوں دُور کسی ٹاپو کے کنارے پہنچا دیتی ہیں۔ اب مجھے واپس جانے کے لئے حوادث کے اُس سیلاب کا رخ بدلنا پڑے گا جو مجھے شام اور صبح کے راستے یہاں لے آیا ہے اور یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اپنے ماضی کی گزراگاہ پر اگر میں نے کوئی نخلستان دیکھا تھا تو یہ میری نگاہوں کا فریب تھا۔ اگر میں نے کسی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھنے کی تمنا کی تھی تو یہ میری نادانی تھی۔ میں نے مایوسی کی تاریک آندھیوں میں جو چراغ جلائے تھے وہ مجھ چلے ہیں۔ اب میں اپنے آپ کو یہ فریب دینے کی کوشش نہیں کروں گا کہ آبنائے باسفورس کے پار کوئی میرا انتظار کر رہا ہے۔“

فرس نے سوال کیا ”کیا یہ ممکن ہے کہ تم اُس ایرانی لڑکی کو مجھوں جاؤ، جس کی ایک مسکراہٹ تمہیں اپنی جان پر کھینچنے پر آمادہ کر سکتی تھی“

عاصم نے جواب دیا ”بعض سراب اتنے نظر فریب ہوتے ہیں کہ انسان اُن کے پیچھے دم توڑ دیتا ہے میں نے بھی ایک سراب دیکھا تھا، لیکن اب وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ اب مجھے سین کی دوستی اور ایرانی فوج کے ساتھ اپنے کارنامے مذاق معلوم ہوتے ہیں۔ زمانے کے حوادث نے مجھے اُس خود اعتمادی سے محروم کر دیا ہے جو ایک انسان کو سراب کے پیچھے بھاگنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ اب اگر کوئی سراب ایسی حقیقت بن کر میرے سامنے آجائے تو مجھے اُس کی طرف قدم اٹھانے کا حوصلہ نہیں ہوگا۔ اب میری تمام دلچسپیاں صرف زندہ رہنے تک محدود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب میں تلوار نہیں اٹھاؤں گا۔ قسطنطنیہ میں اگر میرے لئے کوئی بات تخلیف کا باعث ہے تو وہ یہ کہ میں یہاں بیکار ہوں۔ اگر میں اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کوئی کام تلاش نہ کر سکتا تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں کی طرح کلاڈیوس کی دوستی بھی مجھے ایک بار پھر ایک ایسے سپاہی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور نہ کر دے جو کسی مقصد یا اصول کی خاطر سینہ سپر ہونے کی بجائے اپنی بے مقصد اور بے کیفیت زندگی کا جواز ثابت کرنے کے لئے تلوار اٹھا لیتا ہے۔ اب مجھے ایران کی فتوحات اور روم کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں، میں اپنی کتاب حیات کا نیا ورق اُلٹ چکا ہوں۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی کے باقی دن قسطنطنیہ میں گزارنے پڑیں گے۔ میں شمال یا مغرب میں وحشی قبائل کے حملوں کے واقعات سنتا ہوں تو کبھی کبھی میرے دل میں پھر ایک بار تلوار اٹھانے کا شوق کروٹیں لینے لگتا ہے، لیکن پھر میرے سامنے جب یہ سوال آتا ہے کہ کیا میرے خون کے چند قطروں سے ظلم اور وحشت کی وہ آگ بجھ جائے گی جو کبھی قیصر اور کسری کے ایوانوں اور کبھی خانہ بدوشوں کے خیموں سے نمودار ہوتی ہے تو میرے حوصلے سرد ہو جاتے ہیں۔ مجھے اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں ایک معمولی انسان ہوں اور اپنی حدود سے باہر نکلنے کے بعد میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے۔ اگر میرے جیسے معمولی انسان قیصر اور کسری کے جھنڈے اٹھانے کی بجائے اپنے حال پر نافع رہ سکتے تو شاید اس دنیا کی حالت بہتر ہوتی“

فرس نے کہا۔ عاصم تم ایک معمولی آدمی نہیں ہو۔ بعض حالات میں تلوار نکلنے کی بجائے تلوار نیام ڈالنے کے لئے زیادہ حوصلے اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کل تمہارا فیصلہ کیا ہوگا، لیکن اگر میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی نہیں کی تو تم ان لوگوں سے مختلف ہو جو گنگامی اور بے چارگی کی زندگی پر زندہ رہ سکتے ہیں۔ قدرت نے تمہیں پامال راسخوں پر چلنے کے لئے پیدا نہیں کیا۔ اگر یہ بات ہوتی تو تم رب سے نکل کر یہاں تک نہ پہنچتے اور آج تمہاری دلچسپیاں صرف اپنے دشمنوں سے انتقام لینے یا اپنے مذہب یا اپنے قبیلے کا بول بالا کرنے تک محدود ہوتیں۔ لیکن قدرت نے تمہیں اپنے لئے نئے راستے تلاش کرنے کی ہمت دی تھی، اور آج بھی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ زمانے کا کوئی انقلاب تمہاری اس ہمت پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ صحت کی خرابی کے باعث، تمہارے خیالات میں جو تبدیلی آئی ہے وہ میرے نزدیک لازمی ہے۔ جب تمہاری کھوئی ہوئی توانائی واپس آجائے گی تو تمہارا سوچنے کا انداز مختلف ہوگا۔ بہر حال یہ تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ اگر تم ایک سرسٹے میں کام کر کے مطمئن رہ سکتے ہو تو میں ایک ہفتہ کے اندر ندر سارا انتظام کروں گا۔ اگر ایرانی فوج کا ایک نامور سالار اس کام میں کوئی سبکی محسوس نہیں کرتا تو میں ہی جس نے ساری عمر یہ کام کیا ہے، کسی کی ناراضگی یا خستگی کی پروا نہیں کروں گا۔ عاصم! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری رفاقت کو میں قدرت کا انعام سمجھوں گا۔“

عاصم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”ایک ہفتہ بعد آپ کو یہ شکایت نہیں رہے گی کہ میری صحت خراب ہے۔“

۱

اگلے روز سہ پہر کے قریب فرس مکان کا سردا چکانے کے بعد واپس آیا تو کلاڈیوس جہان خانے کے ایک کمرے میں عاصم کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے فرس کو دیکھتے ہی سوال کیا ”کچھ ہے، کوئی کام سببی ہوئی ہے۔“

فرس جواب دینے کی بجائے پریشان سا ہو کر، عاصم کی طرف دیکھنے لگا اور وہ بولا ”آپ کو پریشان

ہونے کی ضرورت نہیں، میں انہیں بتا چکا ہوں کہ آپ میرے لئے ایک سرائے خرید رہے ہیں۔ کلاڈیوس کو قیصر کی طرف سے ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے اور یہ کل صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ اس لئے میں نے یہی سب سمجھا کہ ان سے اجازت حاصل کر لی جائے۔“

فرس کلاڈیوس کی طرف متوجہ ہوا، آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

اُس نے جواب دیا۔ ”مجھے ہرقلیہ کے قریب ایک اہم چوکی کی حفاظت پر متعین کیا گیا ہے۔ میں اب قیصر اور سپہ سالار سے مل کر آیا ہوں۔ انہوں نے مجھے صبح ہوتے ہی کمک کے دستوں کے ساتھ کوچ کا حکم دیا ہے۔ فرس کچھ کہے بغیر ان کے قریب ایک کڑی پر بیٹھ گیا۔ کلاڈیوس نے قدم سے توقف کے بعد کہا۔ دیکھنے والے کے متعلق میرے جذبات آپ سے مختلف نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ انہیں ایک دن کے لئے بھی بریکار بیٹھنا پسند نہیں اور میری یہ خواہش تھی کہ جب یہ اچھی طرح تندرست ہو جائیں تو انہیں کسی موزوں کام پر لگا دیا جائے۔ موجودہ حالات میں قسطنطنیہ کو سب سے زیادہ سپاہیوں کی ضرورت ہے اور میں کسریٰ کی فوج کے ایک تجربہ کار سالار کے لئے یہاں بھی کوئی عزت کا مقام حاصل کر سکتا ہوں، لیکن میں ایک ایسے دوست کو اپنے ساتھ گھسٹنا پسند نہیں کروں گا۔ جو اپنی تلوار نیام میں ڈال چکا ہے۔ اب اگر یہ سرائے کے کاروبار میں خوش رہ سکتے ہیں، تو مجھے بھی خوش ہونا چاہیے۔ بلکہ میں یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ اگر یہ اپنی خوشی سے ایک ادنیٰ مزدور کا پیشہ اختیار کریں تو بھی میں ان کا دوست کہلانے میں فرح محسوس کروں گا۔ عاصم نے مجھے یہ نہیں بتایا، لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کی طرح آپ بھی مجھے اپنی خدمت کا مزید موقع دینا پسند نہیں کرتے۔ اگر آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ میں قسطنطنیہ میں آپ کی آزادی پر کوئی پابندیاں عائد کرنا چاہتا ہوں، یا ایسے کاروبار سے میری تنصیح ہوگی تو آپ غلطی پر ہیں۔ اگر بائلیوں میں ایک معمولی سرائے کا مالک میرے نزدیک دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ قابل احترام ہو سکتا تھا تو یہاں بھی عقیدت اور احترام کا رشتہ قائم رہ سکتا ہے۔ انطونین نے یہاں پہنچنے ہی مجھ سے کہہ دیا تھا کہ آپ کام کے بغیر خوش نہیں رہ سکتے لیکن آپ کو یہ پریشانی ہے کہ جو کام آپ جانتے ہیں وہ ہمیں پسند نہیں آئے گا۔ آج جب عاصم نے مجھے یہ بتایا کہ آپ اُس کے لئے سرائے کا سودا کر رہے ہیں تو میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ اس کا رو بازنطیہ

بہی اُس کے ساتھ شریک ہیں۔ اب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں اپنے باپ کے سلتھ بات کر چکا ہوں۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں، وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی سرائے اتنی شاندار ہو کہ اونچے طبقہ کے لوگ وہاں ٹھہرنے میں عزت محسوس کریں اور اس مقصد کے لئے وہ آپ کو ایک معقول رقم قرض دینے کے لئے تیار ہیں۔“

فرس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اپنے داماد کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کے والد اس قدر وسیع النظر ہیں تو مجھے اس قدر پریشانی نہ ہوتی۔ لیکن میں موجودہ غیر یقینی حالات میں کسی وسیع پیمانے پر کوئی کاروبار شروع کرنا مناسب خیال نہیں کرتا۔ اب میں مکان خرید چکا ہوں اور جو عورتوں ہی پونجی ہمارے پاس بچ گئی ہے وہ کام شروع کرنے کے لئے کافی ہے۔ جب حالات بہتر ہو جائیں گے، مجھے آپ کے والد سے مدد لینے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

ایک نوکر نے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ولیرس تشریف لائے ہیں۔“

”انہیں یہاں لے آؤ،“ کلاڈیوس نے جواب دیا۔ نوکر واپس چلا گیا اور چند ثانیے بعد ولیرس کمرے میں داخل ہوا۔ عاصم، فرس اور کلاڈیوس اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور وہ اُن کے ساتھ باری باری مصافحہ کرنے کے بعد ایک کڑی پر بیٹھ کر کلاڈیوس سے مخاطب ہوا۔ ”میں صرف آپ کو الوداع کہنے کے لئے آیا ہوں۔ صبح تک قرطاجنہ سے رسد لانے والے جہاز بحیرہ مارمورا میں داخل ہو جائیں گے۔ اور میں آج رات اُس کی حفاظت کے لئے جنگی جہازوں کا ایک بیڑہ لے کر روانہ ہو جاؤں گا۔“

کلاڈیوس نے کہا۔ ”یہ عجیب بات ہے کہ میں بھی علی الصبح قسطنطنیہ سے کوچ کر رہا ہوں، اور ابھی تمہاری تلاش میں نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”مجھے ہرقلیہ کے محاذ کی کمان سونپی گئی ہے۔“

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ بالآخر ولیرس نے کہا۔ ”آپ وہاں تنہا جا رہے ہیں؟“

”نہیں میں یہاں سے ایک کمک کے ساتھ جا رہا ہوں۔“

”نہیں، نہیں میرا مطلب ہے کہ آپ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر تو نہیں جا رہے؟“

”نہیں، میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں، مجھے وہاں کے حالات معلوم ہیں۔ دلیرس، میں نہیں ایک لم
ذمہ داری سونپنا چاہتا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ عاصم میری غیر حاضری میں ایک دوست کی کی محسوس کرنے
اُس نے جواب دیا۔ ”میں آپ کے ساتھ یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ اس ہم سے فارغ ہونے کے بعد میں
میں کم از کم ایک بار ضرور اس کے پاس آیا کروں گا۔“

”عاصم یہاں سرٹے کا کاروبار شروع کرنا چاہتا ہے، اور مجھے امید ہے کہ تمہاری موجودگی میں اسے کوئی
پریشانی نہیں ہوگی۔“

”سرٹے کا کاروبار؟“ دلیرس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”ہاں! اور الطونیبہ کے والد اس کے ساتھ شریک ہوں گے۔“

دلیرس نے کہا۔ ”یہ بات تو میری سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو شخص ایرانی فوج میں شہرت اور کامیابی کی
منازل طے کر چکا ہے، وہ اپنی زندگی کا راستہ تبدیل کر لینے کے بعد بھی ہماری فوج کے ساتھ کھڑا ہونا پسند
نہیں کرے گا۔ لیکن ایک سپاہی کے متعلق یہ سوچنا کہ وہ سرٹے بھی جلا سکتا ہے۔ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔
اگر عاصم آپ کی ممان نوازی سے اکتا گیا ہے تو میں اس کے لئے فوج سے باہر بھی کوئی موزوں ملازمت
تلاش کر سکتا ہوں۔“

کلاڈیوس نے کہا۔ ”دلیرس اب اس موضوع پر بحث کی ضرورت نہیں مجھے معلوم نہیں کہ کل عاصم کے
خیالات کیا ہوں گے، لیکن اُس وقت اُس کا یہ فیصلہ ہے۔ مجھے صرف یہی ثابت کرنا ہے کہ میں اپنے عمن
کی ہر خواہش کا احترام کر سکتا ہوں۔“

دلیرس نے جواب دیا۔ ”بہت اچھا میں بحث نہیں کرتا۔ اور میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ فرصت کے
لمحات میں ان کی سرٹے میری اور میرے تمام دوستوں کی توجہ کا مرکز بنی رہے گی۔ اگر مجھے کوئی غیر متوقع
حادثہ پیش نہ آ گیا تو میں چار پانچ دن تک واپس آ جاؤں گا، اب مجھے اجازت دیجئے۔“

دلیرس نے کرسی سے اٹھ کر کلاڈیوس کی طرف ہاتھ بڑھایا، لیکن اُس نے کہا۔ ”تم ہمارے ساتھ

نہیں کھاؤ گے؟“

”نہیں، میں بہت مصروف ہوں۔“

”اچھا، تو میں دروازے تک تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

کلاڈیوس کی دیکھا دیکھی فرس اور عاصم بھی اٹھ کر دلیرس کے ساتھ چل دیئے۔ دروازے سے باہر نکل
س نے یکے بعد دیگرے اُن کے ساتھ مصافحہ کیا۔ جب عاصم کی باری آئی تو اُس نے جھکتے ہوئے سوال
”اگر آپ بڑا نہ مانیں تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کی میم زیادہ خطرناک تو نہیں؟“

”نہیں۔“ دلیرس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ میں اس ہم سے
م سلامت واپس آؤں گا۔ ایرانی بیڑے کے متعلق جو اطلاعات ملی ہیں، اُن کے پیش نظر میں کسی مزاحمت
ترق نہیں۔ ان دنوں دشمن کا کوئی جہاز مشرقی ساحل کے اڈوں سے زیادہ دور نہیں آتا۔ لیکن وہ اپنی بحری
رت میں تدریج اضافہ کر رہے ہیں اور اُن کا یہ عارضی سکون کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ میں جب
ت خطیبہ سے دور ہونا ہوں تو مجھے ہر آن یہ خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ میری واپسی تک اس شہر کے باشندے
س حال میں ہوں گے۔ میں ایرانیوں سے زیادہ اُن دہشیوں کے متعلق پریشان ہوتا ہوں، جو کسی وقت بھی
ندعی اور طوفان بن کر یہاں نازل ہو سکتے ہیں۔ اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ جب میں
دیں آؤں تو مجھے قسطنطنیہ کی خاموش دیواروں سے یہ سوال پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آئے کہ بازنطینی
کے آخری محافظ کہاں ہیں؟“

کلاڈیوس نے مضطرب ہو کر۔ ”دلیرس مجھے یہ توقع نہ تھی کہ تم اس قدر مایوس ہو جاؤ گے۔“

اُس نے جواب دیا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ مجھے مستقبل کی تاریک گزر گاہوں پر اُمید کا کوئی چراغ
نہی نہیں دیتا۔ لیکن یہ وقت اس موضوع پر بحث کرنے کے لئے موزوں نہیں۔ اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ
عاصم ایک حقیقت پسند انسان ہے تو میں اسے پریشان کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ میرے خیال میں ایک ایسے
ذی کو مستقبل کے خدشات سے آگاہ کرنا ضروری تھا جو قسطنطنیہ کو عاقبت کا گھر سمجھ کر آپ کے ساتھ آیا
ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے، خدا حافظ!“

کلاڈیوس کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن ولیرس اُسے موقع دینے بغیر وہاں سے چل دیا۔
اگلی صبح کلاڈیوس بھی قسطنطنیہ سے روانہ ہو چکا تھا۔ اور چند دن بعد عاصم اور فرس شہر سے
باہر اپنی چھوٹی سی سرائے کا کام سنبھال چکے تھے۔



سرائے کا کاروبار، عاصم اور فرس کی توقع سے زیادہ منفعت بخشنے ثابت ہو رہا تھا۔ قسطنطنیہ میں
پناہ گزینوں کے سیلاب کے باعث رہائش کا مسئلہ ایک نازک صورت اختیار کر چکا تھا اور جن لوگوں کو شہر
میں جگہ نہیں ملتی تھی وہ مضافات میں سر چھپانے کے لئے جگہ تلاش کر لینا بھی غنیمت خیال کرتے تھے۔
فرس نے مسافروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا مسئلہ حل کرنے کے لئے، دوسرے چھینے ایک خیمہ خریدا اور اُسے
سرائے کے پاس نصب کر دیا۔ تیسرے چھینے اُس نے ایک اور خیمہ خریدا اور اس کے ساتھ ہی ایک کشتی
عمارت کی تعمیر شروع کر دی۔ قسطنطنیہ کی بیشتر سرائیں آرمینی تاجروں کی ملکیت تھیں۔ اور وہ باہر سے
آنے والے مسافروں کو دونوں ہاتھوں لوٹتے تھے، لیکن فرس زیادہ نفع کمانے کی بجائے زیادہ گاہک پیدا
کرنے کے مسلک پر کاربند تھا اور یہی وجہ تھی کہ جو مسافر ایک دن اُس کی سرائے میں ٹھہرنا تھا وہ دوسرے دن
دو چار اور مسافر وہاں لے آتا تھا۔

ولیرس فرصت کے اوقات میں انٹران کے پاس آیا کرتا تھا، فرس اور عاصم کے کاروبار سے اُس
کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ شہر میں ہر اجنبی کو اُن کی سرائے کا راستہ دکھانا اپنا فرض خیال کرتا تھا۔ فرس جب
اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لئے جاتا تو عاصم کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔

اپنی غیر حاضری کے پہلے چھینے کلاڈیوس نے انہیں جو خطوط بھیجے تھے، اُن میں یہ بات خاص طور
پر ہمراہی لکھی تھی کہ مجھے حنفرب گھرانے کے لئے چند دن کی چھٹی مل جائے گی، لیکن اس کے بعد اُس کے
تمام خطوط میں اس قسم کی شکایات ہوتی تھیں کہ میں بے حد مصروف ہوں۔ دشمن نے فلاں علاقے میں
مار دھاڑ شروع کر دی، ہماری افواج فلاں قلعے پر دوبارہ قابض ہو گئی ہیں۔ آج دشمن کے لشکر نے اہلک

ی فلاں چوکی پر قبضہ کر لیا۔ اب میں چند ہفتے گھر نہیں آسکوں گا۔ اس طرح چار چھینے گزر گئے۔

قسطنطنیہ چھینے کے بعد عاصم نے اپنی زندگی میں جو خلا محسوس کیا تھا، اسے سرائے کے ایک
دور سے ساحل کی دلچسپیاں زیادہ عرصہ تک پُر نہ رکھ سکیں۔ اپنی کھوئی ہوئی توانائی دوبارہ حاصل کرنے
کے بعد اُس کی حالت اُس مسافر کی سی تھی جو ایک اتق و دن صحرا میں تھکا وٹا اور پیاس سے ٹدھال ہونے
کے بعد کسی نخلستان میں پہنچ جائے اور وہاں کسی چشمے کے ٹھنڈے پانی سے پیاس بجھانے اور کسی درخت
کی ٹہنی چھاؤں میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اپنے دل میں ایک نیا اضطراب محسوس کرنے لگے۔ ایک
اموش اور پرسکون زندگی پر فراق ہو جانا اُس آدمی کے بس کی بات نہ تھی، جس نے اپنی زندگی کی بیشتر
منازل، نامہوار اور پُر خطر راستوں پر طے کی تھیں۔ ماضی کی تمام دلچسپیوں سے کنارہ کش ہونے اور مستقبل
کے متعلق تمام اُمیدوں سے محروم ہو جانے کے بعد یہ سرائے جیسے ابتدا میں اُس نے ایک گوشہ عافیت
سمجھا تھا، اب اُسے ایک ایسا قید خانہ معلوم ہوتی تھی۔ جس کے باہر مشرق و مغرب کے تمام راستے اتق
نی تارکیوں میں گم ہو کر رہ جاتے تھے۔ صبح و شام کی مصروفیت اُس کے لئے زندگی کی ایک ضرورت بن
جاتی تھی۔ وہ سرائے کے ملازموں کی طرح جن کی تعداد اب پانچ چھ لکھی، نہایت ادنی کاموں میں بھی کوئی عار
محسوس نہیں کرتا تھا، لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی اُس کے دل کی گہرائیوں میں کوئی خیال اٹھتا اور اُس کے
ذہنی اور جسمانی قوی نشل ہو کر رہ جاتے، وہ کوئی کام کر رہا ہوتا اور اُس کے ہاتھ پاؤں اچانک ڈگ جاتے۔
ایسی ہی طرف دیکھتا اور اُس کی نگاہیں کسی مہموم اتق کے دھندلوں میں گم ہو کر رہ جاتیں۔ وہ کسی کے ساتھ
بست کرتا اور اچانک اُس کی قوت گویائی سلب ہو جاتی۔ پھر سرائے کے کسی گوشے سے ایک جانی بچھائی آواز
سنائی دیتی، عاصم بیٹا، تم کیا سوچ رہے ہو۔ تم تھک گئے ہو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ آؤ میرے پاس
بیٹھ جاؤ۔ دیکھو، تمہیں ایندھن کے لئے لکڑیاں پھاڑنے، اور گھوڑوں کے آگے چارہ ڈالنے کی ضرورت نہیں
ان کاموں کے لئے ہمارے پاس نوکر موجود ہیں۔ اور عاصم ایسا محسوس کرتا کہ وہ کسی گہرے سمندر میں غوطہ کھانے
کے بعد اچانک ساحل پر پہنچ گیا ہے۔

فرس ہر تیسرے یا چوتھے روز اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لئے اُس کے گھر جایا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ عاصم کو

اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتا، لیکن عاصم کے طرز عمل سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُسے کلاڈیوس کے کمر پاؤں دکھتے ہوئے کوئی الجھن محسوس ہوتی ہے، اور وہ عام طور پر کسی نہ کسی بہانے دیاں جانے سے انکار کر دیتا۔

ایک دن فرس نے اُسے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی تو عاصم نے جواب دیا۔ ”آج میں باسنوئری کے کنارے گھومنا چاہتا ہوں۔“

فرس نے کہا۔ ”بیٹا یہ میرے ساتھ نہ جانے کے لئے کوئی معقول بہانہ نہیں۔ دیکھو، انطونیز تم سے بہت خفا ہے۔ اور جولیا پھلی مرتبہ بار بار تمہارے نہ آنے کی وجہ پوچھتی تھی۔ کلاڈیوس کے باپ نے بھی تمہارے متعلق پوچھا تھا۔“

عاصم نے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ انطونیز مجھے ایک بہن کی طرح عزیز ہے، اور اُسے دیکھ کر مجھ کی راحت سی محسوس ہوتی ہے لیکن جولیا کے سامنے جاتے ہوئے مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ جب میں وہاں تھا تو مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے قابلِ رحم سمجھتی ہے۔ اور اپنی عزیزِ الوطنی، اور بے بسی کے باوجود میرے لئے یہ ناقابلِ برداشت ہے کہ میں قابلِ رحم سمجھا جاؤں۔“

فرس نے کہا۔ ”عاصم فرض کرو کہ وہ نیلی آنکھوں والی مغزور لڑکی صبح، شام انطونیز سے تمہارے متعلق ایسی داستانیں سنتی ہے، جن کے باعث احترام اور عقیدت کے رشتے استوار ہوتے ہیں تو تم اس کے متعلق کیا کہو گے؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”اس صورت میں مجھے اُس سے اور زیادہ دُور رہنا چاہیے۔“

فرس نے پوچھا۔ ”یہ خریدی ہے یا احساسِ مہربانی؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم نہیں، میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اب میں اُن راستوں پر چلنے کی جرات نہیں کروں گا، جن کی کوئی منزل نہ ہو۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس راستے کی کوئی منزل نہیں ہو سکتی۔ فرس نے کہا۔ ”بیٹا تم نے مجھے غلط سمجھا، میرا یہ مطلب نہ تھا کہ جولیا تمہارے دل میں جگہ لے سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس قدر نادان نہیں ہو۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے دل سے تنہائی اور بے بسی

س اس دُور کیا جائے، اور جب تمہیں یہ محسوس ہونے لگے گا کہ یہاں تمہیں جاننے بچانے اور تڑپا رہا تھا۔ ان دنوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے تو ماضی کی تھخیاں تمہارے لئے اس قدر کھینچ دہ نہیں ہوں گی۔“

عاصم نے کہا۔ ”کیا آپ میرے لئے کافی نہیں؟“

لیکن میں ہمیشہ تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا۔ میرے راستے کی آخری منزل اب زیادہ دُور نہیں۔“

عاصم کچھ دیر کرب و اضطراب کے عالم میں فرس کی طوط دیکھتا رہا۔ بالآخر اُس نے ایک گہری سانس بھری اور کہا۔ ”جب آپ میرے ساتھ نہیں ہوں گے تو میں یہ سمجھوں گا کہ زندگی کے ساتھ میرا آخری رشتہ ٹوٹ رہا ہے۔ پھر میری جگہ یہ سرائے نہیں ہوگی۔“

”تم کہاں جاؤ گے؟ فرس نے مفہوم لہجے میں سوال کیا۔

”مجھے معلوم نہیں، آج مجھے اس سوال کا جواب سوچتے ہوئے بھی خواب محسوس ہوتا ہے۔“

فرس نے کہا۔ ”عاصم جو انسان دوسروں کے لئے جینا اور مرنا جانتا ہو اُسے اپنے ماضی پر نادم، دل سے پریشان اور مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کیا تم اپنے ماضی کے واقعات کے متعلق سوچتے وقت یہ محسوس نہیں کرتے کہ بعض فیصلہ کن مراحل میں تمہارے اپنے شعور سے زیادہ قدرت کی ان دیکھی اور ان جانی قوتوں نے تمہاری راہنمائی کی ہے اور یہ قوتیں آئندہ بھی تمہاری راہنمائی کرتی رہیں گی؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”اپنے ماضی سے میں نے صرف یہ سبق سیکھا ہے کہ میں نے اپنے مہم جو سپروں کو حقیقت سمجھ لیا تھا۔ میں اس خود فریبی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میں وقت کی آندھیوں کا رخ بدل سکتا ہوں۔ لیکن میری کوششوں کے نتائج میری توقعات کے خلاف تھے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ وہ زمین جہاں میں محبت

کے پھولوں کی آبیاری کرنا چاہتا ہوں، صرف انگاروں کو جرم دے سکتی ہے۔ میں نے میزب کو اپنے دوستوں اور دشمنوں کے لئے امن کا گہوارہ بنانے کی تمنا کی تھی، لیکن میری کوششوں کا حاصل یہ تھا کہ اس حسین وادی کے لئے میرا وجود ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ پھر جب میں وہاں سے نکلا تو زندگی کی تمام خواہشوں سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ اپنی کمزوری اور بے بسی کا احترام کرتے ہوئے میں نے اپنی تلوار چھینک دی تھی۔ سٹیڈین اور اُس کے والدہ کی مصیبت نے مجھے ایک نئے طوفان کے سامنے سینہ سپر ہونے پر مجبور کر دیا۔ پھر میں نے اپنے

نئے راستے پر جتنے قدم اٹھائے وہ سب غلط تھے۔ میں اس بات پر خوش تھا کہ میں مصیبت میں کسی رکلم آ رہا ہوں، لیکن اس کے بعد خود نمائی کا جذبہ میری ہر نیک خواہش پر غالب آچکا تھا۔ وہ خمیر جو ایک رات اپنے زخمی دشمن کی قابلِ رحم حالت دیکھ کر بیدار ہوا تھا، فلسطین، شام اور مصر کے میدانوں میں سوچا تھا۔ ایرانی فوج میں شامل ہونے کے بعد میری فتوحات میرے اس یقین کی آخری شکست تھیں کہ میں عام انسانوں سے مختلف ہوں۔

”اگر تم عام انسانوں سے مختلف نہ ہوتے تو اپنے قبیلے کی روایات کے خلاف بغاوت کا جھنڈا نہ اٹھاتے اور اس کے بعد ایرانی فوج کا ساتھ چھوڑ کر یہاں نہ آتے۔“ عاصم تم اس بات پر فخر کر سکتے ہو کہ تمہارے اندر ایک غلط راستہ چھوڑ کر ایک صحیح راستہ اختیار کرنے کی جرأت موجود تھی۔“

عاصم نے جواب دیا: ”شاید آپ کو میری بات پر یقین نہ آئے، لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنے ماضی سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ قدرت کا کوئی معجزہ مجھے چند سال پیچھے لے جائے۔ اور میں اپنا سفر از سر نو شروع کروں تو میں پھر ایک بار ماضی کی تمام غلطیوں کو دہرانے کی کوشش کروں گا میں پھر ایک زخمی دشمن کو اٹھا کر اُس کے گھر لے جاؤں گا اور مجھے اس بات کی پروا نہیں ہوگی کہ میری سہمدی اُس کے خاندان کی تباہی کے دن قریب لا رہی ہے۔ میں سیرا سے محبت کروں گا اور مجھے اس بات کی پروا نہیں ہوگی کہ میری محبت کے پھول اُس کے لئے انگارے بن جائیں گے۔ میں انتہائی مایوسی اور بے چارگی کی حالت میں یروشلم کے قریب ایک سرائے میں پہنچنے کے بعد فلسطین کی اعانت اور دلجوئی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لوں گا۔ پھر وہی نادان لڑکی میری نگاہوں کا مرکز بن جائے گی۔ اور مجھے اس بات کا احساس تک نہیں ہوگا، میں اپنے آپ کو قریب دے رہا ہوں۔ اس کے بعد میرا خمیر مجھے ظلم کرنے والوں کی مخالفت یا منظریہ کی حمایت پر نہیں اکٹائے گا، بلکہ میں وحشت اور بربریت کے سیلاب کا راستہ صاف کرنے والوں کا ساتھی بن جاؤں گا اور جب تک چیرے بازو شل نہیں ہو جائیں گے اور میری ہمت جواب نہیں دے جائے گی مجھے اپنی تباہی پر بے گناہوں کے خون کے دھبے شرمسار نہیں کریں گے۔ میں نے اپنی نگاہوں سے ہمیشہ مختلف اور متضاد راستے دیکھے ہیں۔ کیا وہ نوجوان جو صرف اپنے خاندان کے دشمنوں سے انتقام لینے کے لئے نہ تھا، اُس نوجوان سے مختلف نہ تھا جو اپنے قبیلے کو امن اور رواداری کا درس دے رہا تھا اور اپنے دشمن

منظمت کے لئے اپنے عزیزوں اور بھائیوں کے خلاف سینہ سپر ہو گیا تھا؟ کیا دنیا سے تمام رشتے، زرنے کے بعد یہ بات میرے دہم و گمان میں آسکتی تھی کہ میں اپنے انا کی تسکین کے لئے درندوں کا ساتھی بن جاؤں گا؟ کیا شام سے حبشہ کی حدود تک ایرانی لشکر کے جھنڈے تلے سفر کرنے والے اور وہاں سے قسطنطنیہ عادت فرار ہونے والے انسان کے دور استے ایک دوسرے سے مختلف نہ تھے۔؟ کیا ان تمام واقعات کے بعد میں اپنے دل و دماغ پر مہر وسر کر سکتا ہوں۔؟ مجھ جیسے انسانوں پر قدرت کا سب سے بڑا احسان ہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی عمر کا ایک حصہ مختلف اور متضاد راہوں پر بھٹکنے کے بعد تنگ کر ایک جگہ بیٹھ جائیں۔ ذرا اس تلخ حقیقت کا اعتراف کر لیں کہ یہ دنیا اُن سے پہلے بھی اسی طرح چلتی رہی ہے اور اُن کے بعد بھی اسی طرح چلتی رہے گی۔ فرس میں تنگ چکا ہوں، میری ہمت جواب دے چکی ہے۔ اب مستقبل کے ہر راستے پر مجھے تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ آپ اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ جب تاریکی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو خدا کا نئی بندہ ایک صبح درخشنا کا پیغام لے کر آتا ہے۔ اور انسانوں کے تنگے بارے قافلے نئی امیدوں اور نئے حوصلوں سے سرشار ہو کر اُس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ لیکن کاش میں اپنی زندگی کا سفر شروع کرنے سے پہلے اسی ایسے راہنما کو تلاش کر سکتا جس کی آواز مجھے اپنے خمیر کی آواز محسوس ہوتی۔ جو مجھے یہ بتا سکتا کہ میں اس دنیا میں کیوں آیا ہوں۔ وہ کون سا راستہ ہے جس پر چلنے والے آخری دم تک مایوسی اور بددلی کا شکار نہیں ہوتے وہ کون سے ضابطے اور اصول ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہم انسانی زندگی کے آلام و مصائب سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ کون سی قوت ہے جو ظالم کی تلوار کے سامنے مظلوم کی ڈھال بن سکتی ہے۔ اور وہ کون سا قانون ہے جس کی بدولت نسلوں، قبیلوں اور خاندانوں کے درمیان اخوت اور مساوات کے رشتے قائم ہو سکتے ہیں؟“

فرس نے کہا: ”میرے دوست تم تنہا نہیں ہو۔ اس دنیا کے ہر گوشے میں ہزاروں ایسے انسان ہیں جو تمہاری طرح سوچتے ہیں۔ تم جس راہنما کے متلاشی ہو، اُس کے ظہور کے تمام اسباب مکمل ہو چکے ہیں جس طرح رات کی تاریکی میں ستاروں کی جگہ گاہٹ صبح کی آمد کا پیغام دیتی ہے، اسی طرح انسانیت کے مستقبل پر یقین رکھنے والے اُس راہنما کی آمد کا پتا دے رہے ہیں، جس کے نور سے مشرق اور مغرب کے ظلمت کے روشن ہونے والے ہیں۔ میں خدا کے اُن نیک اور پاک باندوں کو دیکھ چکا ہوں، جن کے نزدیک اُس کی

راہ دیکھنا زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ میں نے اُن میں سے اکثر کو یہ کہتے سنا ہے کہ اب اس دنیا کے معاملات سلجھانے کے لئے کلیسا کے پیشواؤں کا تقدس اور سلطنت کے کچھلا ہوں کا تدریب جواب دے چکا ہے۔ اب سستی اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کو نجات کا راستہ دکھانے کے لئے اُس لادبی کی ضرورت ہے، جس کو دیکھنے والے یہ محسوس کریں کہ وہ خدا کا نور دیکھ رہے ہیں۔ عاصم انہیں معلوم ہے کہ میراٹے کے کاروبار سے میری رغبت کی وجہ کیا ہے؟ سفر! میں کئی برس سے یہ سوچ رہا ہوں کہ ایک دن دنیا کے کسی دور افتادہ گوشے سے کوئی مسافر میرے پاس آئے گا اور مجھے یہ خوشخبری دے گا کہ وہ جس کی تم برسوں سے ماہ دیکھ رہے ہو نمودار ہو چکا ہے۔ پھر میں سب کچھ چھوڑ کر اُس کے ساتھ روانہ ہو جاؤں گا۔ ایک مرتبہ عرب کے تاجروں کی زبانی میں نے یہ سنا تھا کہ مکہ میں کسی نے نبوت کا دعوے کیا ہے لیکن یہ تاجر اُس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اس کے بعد میری یہ خواہش تھی کہ اگر مکہ کے کسی سنجیدہ آدمی سے ملاقات ہو تو میں اُس کے متعلق مزید معلومات حاصل کروں، میری تشنگی کا یہ عالم تھا کہ بذاتِ خود وہاں جانا چاہتا تھا لیکن پھر ایسے حالات پیش آئے کہ مجھے وہاں سے ہجرت کرنا پڑی۔ ہو سکتا ہے کہ مکہ میں ایک نبی کے ظہور کی اطلاع صرف ایک مذاق ہو لیکن میں اب ناک مایوس نہیں ہوا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اُس کی آمد کا زمانہ قریب ہے۔ وہ باتیں جو میں نے کئی بزرگوں سے سُنی ہیں غلط نہیں ہو سکتیں۔“

عاصم نے کہا ”لیکن میں آپ کی طرح نہیں سوچ سکتا۔ اور اگر میں آپ کی طرح سوچنا شروع کر دوں، تو مجھے اپنے نگاہوں پر، جو مجھے کئی بار دھوکا دے چکی ہیں، کیسے اعتبار آئے گا۔ میں حقیقت اور سزا میں کیسے امتیاز کر سکوں گا۔ میں کیونکر یہ سمجھ لوں گا کہ جس ضمیر کی آواز نے مجھے ایرانی لشکر میں شامل ہونے پر آمادہ کر دیا تھا، دوبارہ مجھے دھوکا نہیں دے رہا۔ مجھے یہ کیسے یقین آئے گا کہ وہ داہنہا جسے لوگ خدا کا نبی سمجھتے ہیں، عام انسانوں سے مختلف ہے؟“

فرس نے جواب دیا ”اُس کے ساتھ خدا کی نشانیاں ہوں گی۔ اُس کے بدترین دشمن بھی اُس کی نیکی اور صداقت کا اعتراف کریں گے۔ وہ ناداروں اور بے کسوں کو اپنی پناہ میں لے گا اور وہ یہ محسوس کریں گے کہ اُن کے سر پر خدا کا ہاتھ ہے۔ وہ عدل و انصاف کا بول بالا کرے گا اور اُس کے جلال کے سامنے ظالموں

رد نہیں جھک جائیں گی۔ اُس کا راستہ روکنے والے سنگوں کی طرح بر جائیں گے۔ وہ جس زمین پر قدم رکھے اُس پر خدا کی نعمتوں کی بارش ہوگی۔ اُس کی اطاعت کرنے والے فلاح پائیں گے اور اُس سے سرکشی کرنے والے ذلیل و خوار ہوں گے، وہ ضرور آٹے کا، عاصم اُٹم اُسے دیکھتے ہی یہ محسوس کر دے کہ تمہارے خدا کی تاریک رات بیت چکی ہے۔“

عاصم کچھ دیر خاموشی سے فرس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اُس نے کہا ”کاش! میں آپ کی باتوں پر یقین کر سکتا۔“

”جب تم میری عمر کو پہنچو گے تو تم یہ محسوس کر دے کہ یہ یقین تمہارا آخری سہارا ہے۔“ فرس نے یہ کہہ کر اُٹھ کر چلا گیا۔

عاصم نے پوچھا ”آپ جا رہے ہیں؟“

”ہاں! میں نے انطونیا سے وعدہ کیا تھا اور وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ اور اگر تم جو لیا سے بہت زیادہ خوفزدہ نہیں ہو تو تھوڑی دیر کے لئے میرا ساتھ دینے میں کوئی ہرج نہیں، چلو!۔“

عاصم مسکراتا ہوا اٹھا اور فرس کے ساتھ ہولیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اُس نے کہا ”میں جو لیا سے خوفزدہ نہیں ہوں، میرے نزدیک وہ قسطنطنیہ کے پورا ہوں پر نصب اُن مہر میں مجھوں سے مختلف نہیں، نہیں صرف چند قدم دور سے دیکھا جا سکتا ہے لیکن کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے نازک ہاتھ کی دن میرے پرانے زخموں کو کھیر ڈالیں گے۔ اُس کا وجود ایک آئینہ ہے اور میں اُس کی طرف دیکھ کر یہ محسوس کرتے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ماضی کی ایک تصویر میرے دل کی گہرائیوں سے نکل کر میری نگاہوں کے سامنے آئی ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ جو لیا احسانمندی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر مجھ میں دلچسپی لینے کی کوشش کرتی تھی لیکن اُس کی شفقت اور مروت سے متاثر ہو کر، میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ قسطنطنیہ ایک نئے روپ میں میری نگاہوں کے سامنے جلوہ افروز ہے اور وہ مجھ سے یہ کہہ رہی ہے کہ میں سین کی بیٹی ہونے کے باوجود مغزور اور نودوست نہیں ہوں۔ تمہارا یہ خیال غلط تھا کہ عمر کے ساتھ جب میرا شعور بچتے ہوئے لگے گا تو ماضی کے واقعات ایک مذاق معلوم ہوں گے۔ تمہارا یہ خیال بھی صحیح نہیں تھا کہ میرے باپ نے صرف تم سے چھٹکارا حاصل

کرنے کے لئے تمہیں مصر کی ہم پر بھیج دیا تھا۔ میں نے اُس سے اپنے دل کا حال پوشیدہ نہیں رکھا تم پر یہ الزام نہیں دے سکتے کہ میں نے تمہیں جنگ میں حصہ لینے پر مجبور کیا تھا۔ نہیں، تمہارا یہ اقدام تمہاری خود پسندی کا نتیجہ تھا، اور مجھے صرف تمہاری خوشی منظور تھی، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ فتوحات کا شوق نہیں مجھ سے چھین لے گا تو میں دونوں ہاتھوں سے تمہارا دامن چھوڑتی۔ تم واپس آ جاؤ، عاصم میں صبح و شام تمہارا راستہ دکھیتی ہوں۔ اگر تم زخمی ہو تو میں تمہارے زخموں پر مرہم رکھوں گی، اگر تم بیمار ہو تو میں تمہاری تیمارداری کروں گی تم میری نگاہوں میں سین کی بیٹی کی خود پسندی اور غرور کی بجائے اُس لڑکی کا سحر و اکسار دیکھو گے، جس نے ایک دن بے بسی کے آنسوؤں سے تمہاری محبت کا سودا چکا یا تھا۔“

عاصم یہاں تک کہہ کر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا، لیکن چند قدم اور چلنے کے بعد اُس نے کہا ”فرس، مجھے معلوم نہیں، میں کیا کہہ رہا ہوں مجھے ڈر ہے کہ اگر میں کچھ دیر اور اسی طرح باتیں کرتا رہا تو آپ مجھے دیوانہ سمجھنے لگ جائیں گے۔ آج میں یہ تسلیم کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتا کہ فسطینہ کی یاد اب بھی کبھی کبھی مجھے بے چین کر دیتی ہے۔ میں دنیا کی ہر حسین لڑکی کو اُس کے چہرے کا آئینہ سمجھ لیتا ہوں۔ ایک دن۔ میں کلاڈیوس کے گھر سے نکلا تھا اور رات کے وقت واپس آیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے میں کہاں گیا تھا؟“

فرس نے جواب دیا ”تم نے مجھیں صرف یہ بتایا تھا کہ تم سیر کرتے کرتے شہر سے باہر نکل گئے تھے اور پھر شام کی تاریکی میں واپسی پر راستہ بھول گئے تھے۔ اور مجھے تمہارا چہرہ دیکھ کر صرف یہ احساس ہوا تھا کہ تم بہت زیادہ پریشان ہو۔“

عاصم نے کہا ”سُنئے، میں نے اُس دن سارا وقت اُن ٹیلوں کے آس پاس گھوم کر گزارا تھا، جہاں سے باسفورس کے دوسرے کنارے ایرانی لشکر کے خیمے دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس دن مجھ پر کئی گات ایسے بھی آئے تھے، جب میں آبنائے باسفورس کو عبور کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا اور مجھے اس بات کی پروا نہ تھی کہ پہریداروں کے تیر میرا جسم چھلنی کر ڈالیں گے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر میں یہاں سے بچ کر نکل گیا، تو دوسرے کنارے مجھے ایرانیوں کے تیروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن فسطینہ کو دیکھنے کی خواہش میرے ہر لسان

ب آپ کی محنتی۔ میرا دل مجھے بار بار یہ فریب دے رہا تھا کہ فسطینہ دوسرے کنارے میرا انتظار کر رہی ہے۔ یہ نہ کسی طرح اُس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ پھر مجھے اس بات کی پروا نہیں ہو گی کہ ایرانی مجھے ایک غرور کر میرے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ فسطینہ کو صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے میں موت کے دروازے تک دینے کے لئے تیار تھا۔ میں اُسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ اپنی بے بسی اور بے چارگی کے باوجود میں سے محبت کرتا ہوں۔

غروب آفتاب کے بعد میں نے کئی بار پانی میں کودنے کا ارادہ کیا، لیکن ہر بار میری ہمت جواب نہ دیتی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ نے میرا دامن پکڑ لیا ہے اور آپ یہ کہہ رہے ہیں، عاصم پاگل نہ رہا، تم تیر کر دوسرے کنارے نہیں پہنچ سکو گے۔ تم اگر رومیوں کے ہاتھوں نہیں تو ایرانیوں کے ہاتھوں، رہ جاؤ گے، اور فسطینہ کو یہ معلوم بھی نہیں ہو گا کہ تم اُس کی خاطر اپنی جان پر کھیل گئے۔ پھر میں نے رات کی تاریکی میں ایک کشتی چرانے کا ارادہ کیا، لیکن مجھے موقع نہ ملا اور ایک ساعت ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد میرے تمام دلوں نے سرد ہو چکے تھے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک بھیا ناک خواب سے بیدار ہوں۔ فسطینہ پہنچنے کے بعد اپنے ماضی کی طرف لوٹنے کے لئے یہ میری پہلی اور آخری کوشش تھی۔ اگر میری زبان شکست، ندامت اور بے بسی کے احساس سے گنگ نہ ہو جاتی، تو اُس رات میں آپ سے یہ بات چھپانے کی کوشش نہ کرتا۔ لیکن میں ایک بات پوچھتا ہوں۔ فرض کیجئے، میں اُس دن واپس نہ آتا اور آپ کو کسی طرح یہ معلوم ہو جاتا کہ میں آبنائے باسفورس عبور کر کے سین کے پاس چکا ہوں، تو آپ میرے متعلق کیا خیال کرتے؟“

فرس نے جواب دیا ”میں صرف یہ خیال کرتا کہ ایک غیر معمولی انسان کسی غیر معمولی ہم پر روانہ ہو چکا ہے۔ تم نے باسفورس کے پار کسی مظلوم کی چھین سنی ہیں یا کسی نے خواب میں تم سے فریاد کی ہے اور تم نے اُس کی اعانت اور دلجوئی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیا ہے۔“

عاصم نے قدرے لاجواب ہو کر کہا ”اور اگر میں آپ کو یہ بتا کر گھر سے نکلتا، کہ آج میری ہم صورت فسطینہ کو دیکھنے تک محدود ہے۔ یا میں پھر ایک بار ماضی کے سراب کے پیچھے بھاگنا چاہتا ہوں تو آپ کا

دہا پر تناوحت کر لینا، اس بات کا ثبوت نہیں کہ میں کوئی خطرناک راستہ اختیار کرنے کی جرأت سے محروم رہا ہوں اور میری ساری خواہشات صرف زندہ رہنے تک محدود ہیں ؟۔

”نہیں، عاصم میں نے تمہارے متعلق یہ کبھی نہیں سوچا کہ تم موجودہ حالات پر قانع رہ سکتے ہو۔ مجھے یہ ہے کہ تمہارے ضمیر کی آواز کسی دن اچانک تمہیں بے چین کر دے گی اور تم بلا توقف کسی طوفان کے سامنے کھڑے ہو جاؤ گے“

”آپ قسطنطنیہ کے حالات سے بے خبر نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ نے کبھی یہ نہیں پایا کہ یہاں لاکھوں انسانوں کو ہلاکت کے طوفانوں سے بچانے کے لئے میں کچھ کر سکتا ہوں۔ اگر آپ میری جرأت پر اعتماد ہونا تو آپ یقیناً مجھے یہاں آرام سے بیٹھنے کی بجائے کلاڈیوس کا ساتھ دینے پر آمادہ رہتے۔ آپ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ وہ ایک خطرناک جہم پر گیا ہوا ہے اور میں ان دنوں سردار دشمن قبائل کے خاقان کے درمیان مصالحت کی افراہوں کے باوجود بے محسوس کرتا ہوں کہ قسطنطنیہ نے خطرات دور نہیں ہوئے“

فرمس نے جواب دیا۔ ”کلاڈیوس، رومی فوج کا ایک سپاہی ہے اور اُس پر سلطنت کی حفاظت کے لئے ہر خطرے کا سامنا کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لیکن تم اپنے ضمیر کی آواز پر چلنے کے لئے آزاد ہوؤ“

عاصم نے کہا۔ ”آپ کو معلوم ہے، کہ اگر کلاڈیوس مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دیتا، تو میں بھی انکار نہ کرتا“

”مجھے معلوم ہے، لیکن اگر کلاڈیوس، تمہیں اپنے حصے کی ذمہ داریوں میں شریک کرنے کی کوشش کرتا تو میں اُسے تمہارا دوست خیال نہ کرتا“

عاصم نے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ اپنی عمر کے چند سال ایرانیوں کی فتوحات میں اضافہ کرنے کے بعد میری ساری ہمدردیاں رومیوں کے ساتھ ہیں۔ اور کبھی کبھی یہ خیال مجھے بے چین کر دیتا ہے کہ میں کلاڈیوس کے ساتھ نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ بازنطینی سلطنت کے آلام و مصائب کا دور ختم ہو جائے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دور کب اور کیسے ختم ہوگا۔ خدا کے لئے مجھے بتائیے، کہ

فرمس نے دوبارہ اُسی اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں پھر بھی تمہارے پیچھے بھاگنے یا تمہارا راستہ روکنے کی کوشش نہ کرتا۔ اول تو مجھے اس بات پر یقین نہ آتا کہ تم کسی بلند مقصد کے بغیر اپنی جان کھو جاؤ اور اگر مجھے یقین آجی جاتا تو بھی میں تمہارے ایک اضطراری عمل کو قابل ملامت خیال نہ کرتا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ سوچنے کی کوشش کرتا کہ تمہارے زندہ و سلامت باسفورس کے دوسرے کنارے پہنچ جانے کے امکانات کیا ہیں، اور اگر تمہیں کوئی خطرہ ہے تو میں تمہاری کیا اعانت کر سکتا ہوں“

عاصم نے انتہائی پریشانی کی حالت میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ مذاق کر رہے ہیں“

”نہیں، عاصم میں مذاق نہیں کرتا۔ میرے نزدیک تم ان انسانوں سے مختلف ہو، جو دیر تک انہیں بند کر کے کسی راستے پر چل سکتے ہیں۔ میں تمہارے ضمیر میں وہ روشنی دیکھ چکا ہوں، جو ایک انسان کو کسی اپنی کو قبول کرنے کا حوصلہ اور کسی بُرائی کو ٹھکرانے کی جرأت عطا کرتی ہے۔ اگر مجھے تم اپنے دل کا سارا حال بتا جاتے تو بھی میں تمہارے متعلق یہی سوچتا کہ نئے راستوں اور نئی منازل میں بھی تمہارے ضمیر کی روشنی تمہارا ساتھ دے گی۔ اور تمہاری زندگی میں وہ لمحات بار بار آئیں گے، جب تم انسانیت کے متعلق اپنی ہنگامی مصلحتوں سے بالاتر ہو کر سوچو گے۔ تم ہدی کے طوفانوں کا ساتھ دینے کے لئے نہیں، بلکہ اُن کے خلاف سینہ سپر ہونے کیلئے پیدا ہوئے ہو، اور میں تمہارے متعلق یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ جب تمہاری بڑی سے بڑی خواہش، یہاں تک کہ قسطنطنیہ کی محبت بھی تمہارے ضمیر کی آواز کے ساتھ منقاد ہوگی تو آہنائے باسفورس کے پار ایرانیوں کی وسیع سلطنت تمہیں قسطنطنیہ کے ماحول سے کہیں زیادہ تنگ و تاریک محسوس ہوگی۔ اور اگر پوچھو، تو میں یہ ماننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں کہ اُس روز تم واقعی باسفورس کے پار پہنچنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ یہ صرف ایک ہنگامی جوش تھا، جسے دبانے یا شکست دینے کے لئے تمہاری اندرونی توانائی کافی تھی۔ تم نے تصویب اپنی بعض خواہشات کے خلاف ایک جنگ لڑی تھی اور تم ان خواہشات کو مغلوب کرنے کے بعد واپس آ گئے تھے۔“

وہ کچھ دیر خاموشی سے چپتے رہے۔ ”بالآخر عاصم نے رُک کر کہا۔ کیا یہاں میرا ایک سرانے کے

میں کیا کر سکتا ہوں۔“

فرس نے جواب دیا، تم صرف انتظار کر سکتے ہو، عاصم اور بعض اوقات موزوں حالات کا انتظار کرنے کے لئے ناموزوں حالات کے ساتھ نبرد آزما ہونے کی نسبت زیادہ ہمت اور استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ اس جنگ کو ایرانیوں، رومیوں یا تاتاریوں کے ہتھیاروں کی تلواریں ختم نہیں کر سکتیں۔ وہ صرف اُن لڑائیوں میں ایک دوسرے کو شکست دے سکتے ہیں، جن کے نتیجے میں آج کا ظالم کل کا مظلوم بن سکتا ہے، لیکن دائمی جنگ کا خاتمہ صرف کسی ایسے اصول کی فتح سے ہو سکتا ہے جو مشرق و مغرب کے ہر انسان کو امن اور خوشحالی کی ضمانت دے سکتا ہو۔ اور ایسا کوئی اصول نہ ایرانیوں کے پاس ہے اور نہ رومیوں اور اُن کے مغربی حریفوں کے پاس۔“

عاصم نے کہا، ہم پھر اپنی بحث کے نقطہ آغاز پر پہنچ گئے ہیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ آپ پھر اُس رہنما کا ذکر چھیڑ دیں گے، جس کے بغیر آپ کے نزدیک انسانیت کی نجات ممکن نہیں۔“

”جو شخص پیاس سے مر رہا ہو، وہ پانی کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں لے سکتا۔ ادھر دیکھو، فرس نے سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”اگر میں غلطی پر نہیں تو وہ فرس کا غلام ہے اور شاید ہلا پتلا کرنے آ رہا ہے۔“

وہ رُک گئے۔ غلام انہیں دیکھ کر بھاگتا ہوا قریب پہنچا اور اُس نے کہا، ”میں آپ کی طرف آ رہا تھا چھوٹے آقا آپ کو بلاتے ہیں۔“

”کون! کلاڈیوس؟“ فرس نے سوال کیا۔

”جی ہاں۔“

”وہ کب آئے؟“

”جی وہ کل شام گھر پہنچے تھے اور اسی وقت قیصر کے ساتھ ملاقات کے لئے چلے گئے تھے۔ آج بھی وہ دوپہر تک گھر سے باہر مصروف رہے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد وہ آپ کے پاس آنا چاہتے تھے لیکن لوگوں نے انہیں گھر سے نکلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس وقت بھی اُن کے کئی دوست اور سینیٹ کے

چند ارکان اُن کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔“

فرس نے عاصم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”معلوم ہوتا ہے کہ کلاڈیوس کوئی اہم خبر لے کر

یا ہے۔“

”ہاں۔“ نوکر نے کہا، ”وہ یقیناً کوئی اہم خبر لائے ہیں۔ ورنہ فوج کے بڑے بڑے عہدہ دار اور

سینیٹ کے ارکان اس طرح بھاگے ہوئے اُن کے پاس نہ آتے۔ صبح اسقف اعظم نے بھی اُن کے ساتھ ملاقات کی تھی۔“

میں دیکھنے کے لئے بیٹیاں ہوگا۔“

کلاڈیوس کا باپ مرقس اٹھ کر آگے بڑھا اور اُس نے نووارد کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی کرسی پر بٹھا دیا۔
دیس نے اپنی کرسی مرقس کے لئے خالی کر دی اور خود ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

اس عمر رسیدہ رومی کا نام مارٹن تھا، اُس کے تین بیٹے آرمینیا اور شام کی جنگوں میں کام آچکے تھے۔ وہ رومی سنیٹ کے اُن چند ارکان میں سے ایک تھا، جنہیں قیصر کے دربار اور قسطنطنیہ کے بائلاں میں یکساں عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ حاضرین کی نگاہیں کلاڈیوس کی بجائے اس معزز رومی کی طرف سبڈول ہو چکی تھیں۔ اُس نے قدرے توقف کے بعد کلاڈیوس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”میں قیصر سے مل کر آ رہا ہوں، اس لئے تمہیں بے فائدہ سوالات سے پریشان نہیں کروں گا۔ میں صرف اپنے کانوں سے یہ سننا چاہتا ہوں کہ تم واقعی ان درندوں کے خاقان سے مل چکے ہو۔“

کلاڈیوس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ”جناب یہ خراب اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ اب اگر میں اس کی تردید کروں تو بھی کسی کو یقین نہیں آئے گا۔“

مارٹن نے کہا: ”بیٹیا میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں، اور اگر اس ملاقات کے نتائج کے بارے میں تیسر کی توقعات درست ثابت ہوئیں تو مستقبل کے مورخ تمہیں روم کے نجات دہندہ کی حیثیت سے یاد کریں گے، لیکن تمہیں یقین ہے کہ یہ وحشی ہمارے ساتھ کسی باعزت سمجھوتے پر آمادہ ہو جائیں گے؟“

کلاڈیوس نے چند ثانیے سوچنے کے بعد کہا: ”میں آپ کے اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتا۔ مجھے صرف اس احساس نے تاناریوں کے کیمپ میں جانے پر مجبور کر دیا تھا کہ موجودہ حالات میں ہمارے لئے دو محاذوں پر لڑنا ناممکن ہے۔ آوار کے خاقان کے ساتھ میری ملاقات کے بعد کم از کم خیال ثابت ہو چکا ہے کہ ایرانیوں کی طرح ان لوگوں کو بھی مصالحت پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا۔“

ایک اور رومی نے کہا: ”اگر خاقان نے مصالمانہ گفتگو کے لئے آمادگی ظاہر کی تھی تو اُسے قسطنطنیہ آنے پر کیوں اجتراض تھا؟“

کلاڈیوس کی بجائے مرقس نے جواب دیا: ”مصالحت کی ضرورت ہمیں ہے آوار کو نہیں۔ اودھم

باب ۳

کلاڈیوس کے مکان میں شہر کے اکابر کی آمدورفت اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ واقعی کوئی اہم خبر لے کر آیا ہے۔ عاصم اور فرمیس نے باہر نکلنے اور اندر جانے والے مردوں اور عورتوں سے کتراتے پڑتے محض عبور کیا لیکن ملاقات کے کمرے کے دروازے سے باہر برآمدے کی سیڑھیوں تک لوگوں کا ہجوم دیکھ کر انہیں رکنا پڑا۔

غلام نے قدرے توقف کے بعد کہا: ”میں پچھلی طرف سے اندر جا سکتے ہیں، آپ میرے ساتھ آئیں؟“ وہ غلام کے پیچھے چل دیئے، لیکن مکان کے عقیقی حصے میں خواتین کا شور سن کر پھر اٹنے پاؤں واپس آگئے چند ثانیے بعد جب پندرہ بیس آدمی کمرے سے باہر نکلے اور برآمدے کا ہجوم اندر گھس گیا، تو فرمیس اور عاصم کو دروازے میں کھڑا ہونے کی جگہ مل گئی۔

کلاڈیوس پچھلی دیوار کے قریب کھڑا لوگوں کے سوالات کے جواب دے رہا تھا۔ اُس کے بائیں بائیں چند معززین کرسیوں پر اور باقی نیچے قالینوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک سیاہ فام اور قوی سہیل غلام برآمدے میں داخل ہوا اور اُس نے کچھ کہے بغیر عاصم اور مرقس کو ایک طرف دھکیل کر اپنے پیچھے آنے والے ایک عمر رسیدہ رومی کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ رومی کمرے میں داخل ہوا اور لوگ جلدی سے اٹھ کر ادھر ادھر سمٹنے لگے۔ کلاڈیوس عمر رسیدہ رومی کو دیکھ کر آگے بڑھا اور اُس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے بولا: ”مجھے سب سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے تھا، لیکن لوگوں نے مجھے گھر سے باہر نکلنے کا موقع نہیں دیا۔“

عمر رسیدہ رومی نے مسکراتے ہوئے کہا: ”مجھے معلوم تھا کہ اس خبر کے بعد قسطنطنیہ کا ہر باشندہ رومی

تو اسے بھی خدا کا احسان سمجھتے ہیں کہ خاقان نے ہر قلبیہ آنا منظور کر لیا ہے۔“

دوسرے رومی نے کہا ”مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ تنہا تانادیوں کے کیمپ میں جانے کا خطرہ مول لے کر کلاڈیوس نے ایک غیر معمولی جرأت اور بہت کام مظاہرہ کیا ہے، لیکن مجھے یہ اطمینان نہیں کہ موجودہ حالات میں قیصر قسطنطنیہ چھوڑ کر ہر قلبیہ جانا پسند کریں گے۔“

مارٹن نے برہم ہو کر کہا ”ہمیں اطمینان رکھنا چاہیے، قیصر اپنے عمل میں بیٹھ کر تانادیوں کا انتظام نہیں کرے گا۔ تانادیوں سے مصالحت کی اُمید پر وہ اُن کے کیمپ میں جانے سے بھی دیدیغ نہیں کرے گا۔“ کلاڈیوس نے کہا۔ جہاں تک قیصر کی ذات کا تعلق ہے، اُن کے متعلق میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ قسطنطنیہ کو بچانے کے لئے ہر خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اس ملاقات سے

کوئی خوشگوار نتائج پیدا کرنے کے لئے تنہا اُن کی جرأت کافی نہیں ہوگی، بلکہ ہمارے اکابر اور ہمارے عوام کو اُن کا ساتھ دینا پڑے گا۔ اگر ہر قلبیہ میں ہم اپنی قوت اور شان و شوکت کا مظاہرہ کر کے یہ ثابت کر سکے کہ ہم اس گئی گزری حالت میں بھی ان خانہ بدوش و عیشیوں کو اپنے لئے کوئی بڑا خطرہ نہیں سمجھتے تو آدراہاں کے

سردار اور اُن کا خاقان قیصر کے سامنے زمین پر بیٹھتے ہوئے بھی فخر محسوس کریں گے، لیکن اگر ہم نے یہ تاثرینے کی کوشش کی کہ ہم قسطنطنیہ سے باہر نکلتے ہوئے بھی خوف محسوس کرتے ہیں تو مصالحت کے متعلق تانادیوں کا رویہ ایرانیوں سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔ میں تانادیوں کے کیمپ میں اُن کے پہلوانوں کی کشتیاں اور

شہسواروں، تیراندازوں اور نیزہ بانوں کے مقابلے دیکھ چکا ہوں۔ خاقان نے اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لئے، مجھے چار دن اپنے پاس مہمان رکھا تھا۔ آدراہداروں نے اپنے خاقان کے سامنے پیش کرنے سے پہلے مجھے اپنے ایک دیوقامت پہلوان سے قوت آزمائی کی دعوت دی تھی اور آج میں اس نے

ہوں کہ میں نے اُس کی گردن توڑ ڈالی تھی۔ سفید رنگ کا ایک خوبصورت گھوڑا جو اس وقت میرے اصل میں بندھا ہوا ہے، مجھے اس کشتی کے بعد خاقان کی طرف سے انعام میں ملا تھا۔ میں خاقان کے کیمپ سے یہ تاثر لے کر آیا ہوں کہ ہر قلبیہ میں خاقان کو ہماری طرف سے ظاہری شان و شوکت کے مظاہرے

قیصر کی مصالحت باتوں سے زیادہ متاثر کریں گے۔“

ایک نوجوان نے کہا ”جہاں تک قسطنطنیہ کے عوام کا تعلق ہے، وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ میں سنیٹ کے ایسے ارکان کو جانتا ہوں، جن کے نزدیک جنگ کے پورے زمانے کی بدترین خبر یہ تھی کہ قیصر نے قسطنطنیہ سے قرطاجنہ منتقل ہونے کا ارادہ تبدیل کر دیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ قیصر کو علم سُن کر بھی ہر قلبیہ کا رخ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔“

مرقس نے کہا ”ہم سب ایسے ارکان کو جانتے ہیں، لیکن تمہیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ اس مسئلہ میں اگر کسی نے بزوری کا مظاہرہ کیا تو قسطنطنیہ میں اُس کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی۔“

مارٹن نے مسکراتے ہوئے کلاڈیوس سے پوچھا ”بیٹا اس محفل میں سنیٹ کے ارکان پر سخت کتہہ چینی ہو رہی ہے، کہیں تمہارے دوستوں کو یہ شبہ تو نہیں ہو گیا کہ میں بھی ہر قلبیہ جانے سے خوف محسوس کرتا ہوں؟“ کلاڈیوس نے جواب دیا ”نہیں جناب! ابھی میرے دوست اس قدر بددل نہیں ہوئے اور آپ کے متعلق وہ اتنا ہزور جانتے ہیں کہ تانادیوں کے کیمپ میں اگر کسی محروم تجربہ کار ایلچی کو بھیجنے کی ضرورت محسوس کی جاتی تو سب سے پہلے آپ کا نام لیا جاتا۔“

مارٹن نے اٹھ کر کہا ”کلاڈیوس اگر مجھے تمہاری تھکاوٹ کا احساس نہ ہوتا تو میں خاقان کے ساتھ تمہاری ملاقات کی پوری تفصیلات سے بغیر میاں سے اٹھنا پسند نہ کرتا۔ لیکن تمہیں آرام کی ضرورت ہے اور میں تمہارے باقی دوستوں سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ وہ تمہاری قوت برداشت کا امتحان نہ لیں۔“

مارٹن کے باہر نکلتے ہی کمرہ خالی ہونے لگا اور کلاڈیوس ٹڈھال سا ہو کر اپنے باپ کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

فرس اور عاصم کمرے میں داخل ہوئے۔ ”کلاڈیوس نے آگے بڑھ کر پہلے اپنے خمر سے مصافحہ کیا اور پھر عاصم سے بغل گیر ہو کر کہا۔ عاصم میں تمہارے پاس آنا چاہتا تھا لیکن میں بہت مصروف تھا۔“ عاصم نے جواب دیا ”میں آپ کی مصروفیت کا حال دیکھ چکا ہوں۔“

چند معززین جو ابھی تک کمرے میں موجود تھے، ایک اجنبی کے ساتھ کلاڈیوس کو اس قدر تے کھٹ بڑا دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ کلاڈیوس نے عاصم کے ساتھ محفوظی دیر باتیں کرنے کے بعد اُن کی طرف

متوجہ ہو کر کہا ”شاید آپ میں سے بعض عاصم کو نہیں جانتے۔ یہ ایک عرب ہیں اور میں انہیں اپنا دوست اور بھائی کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔“

مقس نے کہا ”بیٹا اب تمہارا دوست کچھ عرصہ سے ہمارے پاس آنا پسند نہیں کرتا۔“

عاصم نے جواب دیا۔ جناب ان دنوں میں کچھ زیادہ مصروف رہا ہوں، لیکن آئندہ مجھ سے کوئی بات نہیں ہوگی۔“

ایک رومی نوجوان نے عاصم سے سوال کیا ”جناب میں یہ پوچھ سکتا ہوں، کہ آپ کیا کام کرتے ہیں؟“ فرس کو پوچھنے والے نوجوان کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم پسند نہ آیا اور اُس نے بہم ہو کر کہا۔ ”یہ ایک سرائے میں کام کرتا ہے، تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

”جی نہیں۔“ رومی نے کھسیانا ہو کر جواب دیا۔

کلاڈیوس کچھ دیر فرس سے باتیں کرنے کے بعد عاصم کی طرف متوجہ ہوا۔ ”عاصم عنقریب ہرطریق سے ایک شاندار میلہ لگنے والا ہے۔ قسطنطنیہ سے میرے تمام دوست وہاں آئیں گے۔ اور میں یہ چاہتا ہوں کہ تم بھی چند دن کے لئے وہاں آ جاؤ۔ وہاں ہمارے وہ قومی کھیل کھیلے جا ئیں گے جنہیں دیکھنے کے لئے ایک مدت سے اہل قسطنطنیہ کے عوام کی آنکھیں ترس گئی ہیں، وہاں شہ زوری، پہلوانی اور فنونِ حرب کے مظاہروں کے علاوہ محنتوں کی دوڑ بھی ہوگی۔ اور یہ تمام باتیں تمہارے لئے نئی ہوں گی تاہم ان بھی وہاں آئیں گے اور ویسے شاید ان سے چند دن پہلے ہی وہاں پہنچ جائے۔ اگر تم چند دن کی سیر و تفریح پسند کرو تو ویسے تمہیں اپنے ساتھ لیتا آئے گا۔“

عاصم نے جواب دیا ”اگر وہاں کوئی اور دلچسپی نہ ہوتی تو بھی میرے لئے یہی کافی تھا کہ آپ وہاں ہوں گے میں ضرور آؤں گا۔“

کلاڈیوس نے کہا ”اچھا میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں، ایک ایسی چیز جس کی صحیح پہچان صرف ایک عرب کو ہو سکتی ہے۔“

ویسے نے پوچھا، کیا چیز ہے وہ؟“

”جی ہمارے ساتھ آ کر دیکھ لو۔ آپ سب آ سکتے ہیں۔“

کلاڈیوس عاصم کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا اور باقی آدمی ایک دوسرے کی دیکھا دکھی اُن کے پیچھے چلے گئے۔ کلاڈیوس کا باپ چند تانیئے تذبذب کی حالت میں بیٹھا رہا۔ لیکن پھر وہ بھی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

کلاڈیوس نے صحن میں پہنچ کر ایک غلام کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور کہا ”تم اُس گھوڑے کو نکام سے کر یہاں لے آؤ۔“

غلام جھاگتا ہوا صطل کی طرف چلا گیا۔ مٹھوڑی دیر بعد کلاڈیوس کے جھان ایک اچھلتے کودتے اور پتے ہوئے گھوڑے کی تندہی اور سرکشی اور اُسے لانے والے کی بے بسی دیکھ رہے تھے۔ آدمیوں کی دیکھا دکھی گھر میں جمع ہونے والی خواتین بھی باہر آ چکی تھیں۔ اور بعض زور لگائیں غلام کی بدحواسی پر قہقہے لگا رہیں۔“

کلاڈیوس نے عاصم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”کیوں عاصم کیسا ہے یہ گھوڑا؟“ عاصم نے آگے بڑھ کر سہمے ہوئے غلام کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگیں پکڑ لیں اور پیار سے اس کی ٹرن پر ہاتھ پھیرنے کے بعد بولا ”ایسی چیز کو پہچاننے کے لئے کسی ہمارت کی ضرورت نہیں۔ صرف آنکھیں کافی ہیں۔“

کلاڈیوس نے کہا ”عاصم اس سرکش جانور کو کسی اچھے سواری کی ضرورت ہے۔ تم اس پر سواری کرنا، پسند کرو گے؟“

عاصم نے جواب دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں سواری کا شوق یہاں سے بہت دور چھوڑ آیا ہوں لیکن اگر آپ اس گھوڑے کے متعلق کوئی اطمینان چاہتے ہیں تو میں آپ کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

کلاڈیوس نے کہا ”میں اس گھوڑے سے دو مرتبہ گر چکا ہوں، اور تمہارے سوا مجھے اس بات کا اطمینان اور کوئی نہیں دلا سکتا کہ یہ مجھے تیسری بار نہیں گرائے گا۔“

ایک نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا ”آپ کا مطلب ہے کہ اس گھوڑے سے تیسری بار گرنے

کی سعادت انہیں حاصل کرنی چاہیے۔“

کلاڈیوس نے کہا۔ ”عام آج میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ یہ گھوڑا تمہیں پسند آجائے، یہ میرا ہے۔“

عام نے امانندی سے اپنے دوست کی طرف دیکھا اور قدر سے توقف کے بعد کہا۔ ”اگر آپ میرے لئے اتنی تکلیف اٹھاتی ہے تو میں اپنے آپ کو ناشکر گزار ثابت نہیں کروں گا۔“

رات کے وقت جب عام اور فرس اپنی سرائے کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، تو ہم اُس سے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے واقعی اس گھوڑے کی ضرورت تھی اور آپ حیران ہوں گے کہ جب میں اس پر سوار ہو کر باہر نکلا تو میں نے قسطنطنیہ میں آنے کے بعد پہلی بار یہ بات محسوس کی کہ میں تلوار کے نیچے جا رہا ہوں۔“



ایک ماہ بعد ہرقلیہ کی چہل پہل دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بازنطینی سلطنت کا پرشکوہ نئی پھر لوٹ آیا ہے۔ ہرقل جس کے متعلق آخری دم تک اُس کی رعایا کو یہ اطمینان نہیں تھا کہ وہ قسطنطنیہ کے قلعے سے باہر نکلنے پر آمادہ ہو جائے گا، ملاقات کی تاریخ سے ایک ہفتہ قبل ہرقلیہ پہنچ چکا تھا، اور اُس کے اس جرات مندانہ اقدام نے مایوس اور بددل عوام کے حوصلے بلند کر دیئے تھے، چنانچہ وہ برق در برق ہرقلیہ میں جمع ہو رہے تھے۔ شہر سے باہر اولپک کھیلوں کے میدان میں رتھوں کی دوڑ اور دوسرے ذمی کھیلوں کی مشق شروع ہو چکی تھیں۔ باہر سے آنے والے کھلاڑی اور تماشا خانہ جن کے لئے شہر میں جگہ نہ تھی، اس میدان کے آس پاس خمیے نصب کر رہے تھے۔ شہر کے اندر باہر جگہ جگہ اُن گوتوں، رفاصاؤں نقالوں اور بازی گروں نے اکھاڑے لگا رکھے تھے، جنہیں برسوں کے بعد ایک پُر امن ماحول میں اپنے کلمات اُٹھانے کا موقع ملا تھا۔ سینکڑوں پادری اور راہب دواں پہنچ کر قیصر کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔ عام اور ولیرس برقل سے ایک دن قبل دواں پہنچ گئے تھے، لیکن مرنس اُن سات قابل اعتماد عزیزین میں سے ایک تھا جنہیں قیصر نے اپنی غیر حاضری کے ایام میں دار الحکومت کے دفاعی اور انتظامی

عام حالات میں عام شاید اس قدر جلد بازی سے کام نہ لیتا لیکن اُسے تماشا خانوں کی مسکراہٹیں اور چند شوخ و طرار رومی لوگوں کے دبے دبے تہقے پسند نہ آئے، چنانچہ اُس نے کسی توقف کے بغیر بالکل سست کیوں، گھوڑے کو تھکی دی اور پھر آنکھ جھپکنے کی دیر میں اُس پر سوار ہو گیا۔ سرکش گھوڑا کچھ دیر اچھلنے، کودنے دو لڑنیاں بھاڑنے اور پھینکارنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا اور عام ایک ننگ دائرے میں چند چکر لگانے کے بعد اُسے سرپٹ دوڑانا پڑا صحن سے باہر نکل گیا۔

مرقس نے اپنے بیٹے سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ”کلاڈیوس سچ کہو تم واقعی اس گھوڑے سے دوبار گھرے تھے؟“

کلاڈیوس نے جواب دیا۔ ”نہیں اباجان میں عام جیسے دوست کو ایک ناقابلِ اعتماد گھوڑے پر سوار ہونے کی دعوت کیسے دے سکتا تھا۔ یہ بات میں نے صرف اُسے ترغیب دینے کے لئے کہی تھی۔“

ایک عمر رسیدہ آدمی نے کہا۔ ”خافان کا یہ تحفہ یقیناً بیش قیمت ہوگا، کم از کم میں نے اپنی زندگی میں اتنا خوبصورت گھوڑا نہیں دیکھا۔“

کلاڈیوس بولا۔ ”اگر یہ گھوڑا عام کو پسند آ گیا تو میں بھی اسے بیش قیمت سمجھوں گا۔ عام صحن گھوڑے پر سواری کیا کرتا تھا، وہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔“

تھوڑی دیر بعد صحن میں جمع ہونے والے بیشتر لوگ دواں سے جا چکے تھے اور کلاڈیوس اپنے گھر کے اندر اور چند بے تکلف دوستوں کے ساتھ مکان کے کشادہ کمرے میں بیٹھا عام کا انتظار کر رہا تھا۔ غروب آفتاب سے کچھ دیر قبل جب اُن کی پریشانی اضطراب میں تبدیل ہونے لگی تو باہر اچانک گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اور ایک خادم نے اندر بھاگتے ہوئے کہا۔ ”جناب وہ آگئے ہیں۔“

وہ جلدی سے اُٹھ کر باہر نکل آئے۔ عام اُن کے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے گھوڑے سے اتر پڑا اور غلام نے بھاگ کر اُس کی باگ پکڑ لی۔ عام نے آگے بڑھتے ہوئے کلاڈیوس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”آپ مذاق کرتے تھے۔ یہ گھوڑا میری توقع سے کہیں زیادہ شریف ثابت ہوا۔“

امور کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی تھی۔

عاصم کو ہر قلمیہ پہنچ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک مغموم فضا سے نکل کر مسکراہٹوں اور قہقہوں کی دنیا میں داخل ہو چکا ہے۔ اُس نے بڑی بڑی فتوحات کے بعد ایرانی لشکر کو جشن منانے دیکھا تھا لیکن ہر قلمیہ میں جمع ہونے والوں کی گرجبوشی اُس کی توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ عاصم دن کے وقت کبھی فیصلہ کرنا دستانوں کی پریڈ، کبھی پہلوانوں کی شہ زوری کے کرتب اور کبھی رقصوں کی دوڑ دیکھتا اور رات کے وقت ہائیرس کے ساتھ رقص اور موسیقی کی محفلوں میں چلا جاتا۔ کلاڈیوس عام طور پر فیصلہ کی حفاظت کے انتظامات کی دیکھ بھال یا کھیلوں کے میدان کو آراستہ کرنے اور اونچی حیثیت کے جہازوں کی رہائش کا مسئلہ حل کرنے میں مصروف رہتا تھا، اس لئے اُسے عاصم کے پاس بیٹھنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔

ایک رات وہ تنہا ہارا اپنی قیام گاہ میں داخل ہوا، تو عاصم تنہا ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کلاڈیوس نے پوچھا۔ ”عاصم اکیلے یہاں کیا کر رہے، ولیرس کہاں ہے؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”وہ ابھی تک رقص دیکھ رہا ہے اور میں واپس آ گیا ہوں۔“

”کیوں، تمہیں رقص پسند نہیں آیا؟“

”نہیں، رقص تو بہت اچھا تھا، لیکن مجھے کبھی کبھی لوگوں کے جرم سے وحشت ہونے لگتی ہے۔“

کلاڈیوس نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”عاصم میں بہت تنگ کیا ہوں۔ کاش قیصر اور خاقان کی ملاقات سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد ہو سکے، ورنہ یہ لوگ اپنے مستقبل سے قطعاً مایوس ہو جائیں گے۔“

عاصم نے کہا۔ ”یہ خیال مجھے بھی بہت پریشان کرتا ہے۔ مجھے لوگوں کا جوش و خروش دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دشمن کے ساتھ صلح کی بات چیت کی بجائے کسی بہت بڑی فتح کے جشن کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آج نقالوں کے ایک اگھاڑے میں جمع ہونے والے لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور اُن کے قہقہے میرے کانوں کو اجنبی محسوس ہوتے تھے۔ کلاڈیوس میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر صلح اور امن کے متعلق اُن کی توقعات مطابقت نہیں یا خاقان نے یہاں آنے سے انکار کر دیا تو یہ کتنا بڑا سانحہ ہوگا۔ اگر ان سادہ دل انسانوں کو جنگ کے آلام و مصائب سے نجات دلانا میرے بس کی بات ہوتی تو میں

یہ قربانی سے دریغ نہ کرتا۔ آج رقص و سرود کی محفلوں کے قریب سے گزرتے ہوئے میں جنگ کی ہولناکیاں تیر کر رہا تھا اور مجھے طاؤس درباب کے فنون کی بجائے بے بس انسانوں کی چینی سنانی دے رہی تھی۔ یہ میرے لئے دہاں کھڑا ہونا مشکل ہو گیا تھا۔ ابھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر آوار کے خاقان نے جنگ ہی رکھنے کا فیصلہ کیا تو ایرانیوں کو آناٹے باسفورس جمود کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ پھر جب یہ خطرناک طاقتیں ایک دوسرے کی حلیف بن کر قسطنطنیہ پر یلغار کریں گی تو کیا ہوگا؟“

کلاڈیوس نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں اُس دن زندہ نہیں ہو گیا۔ میرے کان اپنی مہنوں اور جھانٹوں کی چینی نہیں سنیں گے۔ عاصم ایک انسان کی بے بسی اپنی انتہائی ہمت میں خود فریبی کو جرم دیتی ہے اور میں سر درست اس خود فریبی میں مبتلا رہنا چاہتا ہوں کہ قیصر اور ذہان کی ملاقات سے ہماری تقدیر بدل جائے گی۔ اور صرف میں ہی نہیں، بلکہ میری ساری قوم اس خود فریبی میں مبتلا رہنا چاہتی ہے۔“

عاصم کچھ دیر سوچا، بالآخر اُس نے کہا۔ ”آج دنیا کا ہر مظلوم اس خود فریبی میں مبتلا ہے کہ اُس کی مظلومیت کے دن بیت چکے ہیں اور ہر ظالم اس یقین کے ساتھ اپنی تلوار بے نیام کر چکا ہے کہ مظلوموں کی تقدیر ہمیشہ اُسی کے ہاتھ میں رہے گی اور عدل و انصاف کے جو دروازے اُس نے اپنے طاقتور ہاتھوں سے بند کئے ہیں، وہ ہمیشہ بند رہیں گے۔ لیکن وہ کہاں ہے؟ وہ کب آئے گا؟ ظالم اُسے کب تک لٹکارتے رہیں گے اور مظلوم کب تک اُس کی راہ دیکھتے رہیں گے؟“

”وہ کون؟“ کلاڈیوس نے پریشان سا ہو کر پوچھا۔

عاصم نے چونک کر کلاڈیوس کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ”مجھے فرس کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ بہا کرتے ہیں کہ کسی دن امن کا ایک دائمی نمودار ہوگا اور اُس کے ساتھ خدا کی نشانیاں ہوں گی۔ وہ انسانوں کو زندگی کے نئے آداب سکھائے گا۔ اُس کا جرم مظلوموں کی ڈھال ہوگا اور اُس کے جلال کے سامنے ظالموں کی گردنیں جھک جائیں گی۔“

کلاڈیوس مسکرایا۔ ”اس قسم کی باتیں انطونینہ بھی کیا کرتی ہے۔ اور میں اُس سے یہ کہا کرتا ہوں

کرجب وہ اُسے گانورہم دونوں دوڑ کر اُس کے پاؤں سے پٹ جابئیں گے۔“



بڑی گروں اور مسخروں کے گروہ نمودار ہوئے، سب سے آخر میں اُن رنٹوں کی نمائش شروع ہوئی، جن کی دوڑ کو تعلیم یونائیٹڈ کی طرح رومیوں سے قومی کھیلوں میں بھی ایک اہم ترین مقام حاصل تھا۔ ہر رنٹہ کے ساتھ چار چار لوٹھے جتھے ہوئے تھے۔ اور اُن کے سوار انتہائی شہو رنگوں کے پیش قیمت لباس پہنے ہوئے تھے۔ آوار لباس میلے کچیلے کپڑوں، بدبودار پوشیوں اور سموردار ٹوپوں پر مشتمل تھا، اور اُن کا ہیب صورت خاندان ہی ایک غریب رومی کے مقابلے میں غلغلہ نظر آتا تھا۔ یہ لوگ لچائی ہوئی نگاہوں سے کبھی کھلاڑیوں کی اور کبھی اپنے قریب بیٹھے یا کھڑے ہونے والے رومیوں کی ذرت برق پوشائیں دیکھ رہے تھے۔

عاصم اور ولیرس کو بائیں طرف کے شامیانے کے نیچے جگہ ملی تھی۔ اور اُن کے درمیان ایک دیو قامت سیٹھین کے ساتھ ایک تپلا ڈبلا رومی بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک عاصم کی نگاہ ایک اور سیٹھین کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئی جو ولیرس کے دائیں ہاتھ بیٹھا ہوا تھا اور اُس کے عجیب و غریب لباس کے باوجود عاصم کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اُسے پہلے ہی کہیں دیکھ چکا ہے۔ ایک ثانیہ کے اندر اندر اُس کے شبہات یقین کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ اس آدمی کی شکل ایرج سے اس قدر ملتی تھی کہ اگر وہ ایرانی لباس میں ہوتا تو عاصم اُسے پچاس ساٹھ ذرم کے فاصلے سے بھی پہچان لیتا۔ لیکن موجودہ حالات میں اُسے ایرج کا یہاں پہنچ جانا بعد از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس مشابہت کو محض ایک اتفاق سمجھ کر کھیلوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مٹھوڑی دیر بعد یہ سیٹھین عاصم کی طرف متوجہ ہو چکا تھا، لیکن جب عاصم نے اچانک اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے خوفزدہ ہو کر منہ پھیر لیا۔ اُس کی بدحواسی نے عاصم کے شبہات میں اضافہ کر دیا۔ میدان میں پہلوانوں کی زور آزمائی شروع ہو چکی تھی۔ لیکن عاصم کو اب کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بار بار اس آدمی کی طرف دیکھتا اور ہر بار اپنے دل کی دھڑکتوں میں اضافہ محسوس کرتا۔ میدان میں ایک قومی ہیکل رومی دو پہلوانوں کو چت کرنے کے بعد ایک نئے بدمقابل کے ساتھ زور آزمائی شروع کر چکا تھا اور تماشاخانے کے دروازوں کے قریب بلند کر رہے تھے۔ عاصم اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کر ولیرس کے قریب پہنچا اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھانے ہوئے بولا: ”ولیرس اگر تمہیں تکلیف نہ ہو تو تم میری جگہ بیٹھ جاؤ۔“

ولیرس کشتی دیکھنے میں اس قدر متنبہ تھا کہ وہ کوئی سوال کئے بغیر اٹھ کر عاصم کی جگہ بیٹھ گیا، اور عاصم

دو دن بعد قیصر اور خاقان ایک کشادہ شامیانے کے نیچے سونے کی مرصع کرسیوں پر رونق افروز تھے۔ ماہ دسمبر کی سردی کے باوجود کھیلوں کے میدان میں غیر معمولی جہل جہل تھی۔ قیصر کے بائیں ہاتھ خاقان کے بعد چند آوار سرداروں کی کرسیاں تھیں اور دائیں طرف اُس کے وزراء، بڑے بڑے عہدہ دار اور سینٹ کے ارکان بیٹھے ہوئے تھے۔ پچھلی قطاروں میں مہمانوں اور میزبانوں کو اس قرینے سے بٹھایا گیا تھا، کہ ہر سیٹھین کے ساتھ ایک رومی نظر آتا تھا۔

ہر تہل اور خاقان کی کرسیوں کے مین پیچھے کچھ جگہ خالی تھی اور وہاں کلاڈیوس کے علاوہ دو رومی اور دو آوار کھڑے تھے۔ اس مرکزی شامیانے کے دائیں بائیں چند قدم کے فاصلے پر دو اور شامیانے نصب تھے اور یہاں نسبتاً کم درجہ کے سیٹھین اور رومی بیٹھے ہوئے تھے اور باقی میدان کے گرد تماشاخانوں کا پھم گھیرا ڈالے ہوئے تھا۔

خاقان اپنے ساتھ قریباً تین سو سوار لے کر آیا تھا۔ رومیوں نے ان سب کو شامیانوں کے نیچے بٹھانے کی کوشش کی تھی لیکن خاقان کے آدمیوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے گھوڑے رومیوں کے حوالے کرنا پسند نہ تھے۔ چنانچہ اُن میں سے قریباً ایک سو شامیانوں کی طرف چلے گئے۔ باقی سواروں نے نیچے اترے بغیر اپنے ساتھیوں کے خالی گھوڑوں کی باگیں پکڑ لیں اور ادھر ادھر پھیل کر تماشاخانوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ رومیوں نے گھوڑوں کو میدان سے باہر باندھنے کا انتظام کر رکھا تھا، لیکن خاقان کے آدمیوں کو اپنے گھوڑوں کے ساتھ رہنے پر بضد دیکھ کر انہوں نے زیادہ اصرار کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ کھیلوں کا آغاز روم اور یونان کی قدیم رسم کے مطابق ایک نمائشی پریڈ کے ساتھ ہوا۔ سب سے پہلے سوار اور پیادہ فوج کے دستے مارچ کرتے ہوئے قیصر اور اُس کے معزز مہمانوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ اس کے بعد شہنشاہ و طراد و شیشیز میں ناچتی، گاتی اور مسکراہٹوں کے پھول نچا دو کرتی ہوئی گز گئیں۔ اُن کے پیچھے پہلوان

نے اُس کی جگہ لے لی۔۔۔ قدرے توقف کے بعد اُس نے سیتھین کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور فارسی میں کہا: "ایرج تم نے مجھے ابھی تک نہیں پہچانا؟"

اور ایرج جس کے خون کا ہر قطرہ نمود ہو چکا تھا اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سہمی ہوئی آواز میں بولا: "میں نے تمہیں پہچان لیا ہے، لیکن یہ جگہ باتوں کے لئے موزوں نہیں۔"

عاصم نے کہا: "لیکن میرا خیال ہے کہ یہ لوگ فارسی نہیں جانتے۔ اور تمہیں یہاں راز کی کوئی بات ظاہر کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔۔۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس خطرناک جہم کے لئے کسی تجربہ کار آدمی کو بھیجیں گے۔" ایرج کے چہرے پر قدرے اطمینان کے آثار ظاہر ہونے لگے اور اُس نے پہلی بار مسکرائے۔ کوشش کرتے ہوئے کہا: "یہاں تمہاری موجودگی میں کسی اور تجربہ کار آدمی کی ضرورت نہ تھی۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تم یہاں پہنچ چکے ہو تو میں اس جہم کے لئے اپنا نام پیش نہ کرتا۔ لیکن تمہارے متعلق تو وہاں یہ مشہور تھا کہ تم کہیں روپوش ہو چکے ہو۔"

عاصم نے جواب دیا: "جو فرقان میرے ذمے لگائے گئے تھے اُن کی تکمیل کے لئے میرا روپوش ہونا ضروری تھا۔ لیکن میں حیران ہوں کہ میرے بعد سین نے تمہیں یہاں بھیجے کی ضرورت کیوں محسوس کی انہیں مجھ پر اعتماد کرنا چاہیئے تھا۔"

ایرج نے جواب دیا: "مجھے سین نے نہیں بھیجا ہے۔ میں براہ راست کسریٰ کے حکم سے خاقان کے پاس آیا تھا۔"

عاصم نے کچھ سوچ کر سوال کیا: "تمہارا مطلب ہے کہ تم سین کے علم کے بغیر خاقان کے پاس پہنچ گئے تھے؟"

"نہیں، اُس نے جواب دیا۔ میں راستے میں سین سے ملا تھا۔ لیکن انہوں نے مجھ سے تمہارا ذکر تک نہیں کیا۔ فضیلینہ اور اُس کی والدہ کی باتوں سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمہارے متعلق کچھ نہیں جانتے۔" عاصم نے کہا: "ایرج مجھے جس قدر اپنی ناکامی کا افسوس ہے، اسی قدر تمہاری کامیابی کی خوشی ہے۔ لیکن یہی تمہاری بہت کشتی نظر تمہیں قیصر اور خاقان کے قریب بیٹھنا چاہیئے تھا۔"

ایرج نے قدرے فکر مند ہو کر عاصم کی طرف دیکھا اور دہی زبان میں جواب دیا: "میں خاقان کے پاس صرف ایک ایچی کی حیثیت سے پہنچا تھا۔ اور میں اپنا فرض پورا کر چکا ہوں۔"

عاصم نے کہا: "میں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اور میں بار بار یہ سوچ رہا تھا کہ اگر آوار نے ہانک مار دھاڑ مٹوڑ کر دی تو تمہارے لئے یہاں سے بچ نکلنے کے امکانات کیا ہیں؟ تمہیں شاید یہ سوچ نہیں کہ رومی ہر غیر متوقع صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

ایرج کا اضطراب اب خوف میں تبدیل ہو رہا تھا، تاہم اُس نے مسکرائے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا: "میرا گھوڑا یہاں سے زیادہ دُور نہیں، اور مجھے اتنا وقت ضرور مل جائے گا کہ میں اطمینان سے اُس پر سوار ہو سکوں۔"

عاصم اپنی توقع سے کہیں زیادہ معلومات حاصل کر چکا تھا اور ہر لحظہ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے کہا: "ایرج اگر خاقان واقعی کسریٰ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُسے اس سے بہتر متوقع نہیں مل سکتا۔ لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر اس وقت قیصر پر ہاتھ اٹھانے کی غلطی لی گئی تو رومی ان اڑھائی یا تین سو آدمیوں میں سے ایک کو بھی بچ کر بھاگنے کا موقع نہیں دیں گے۔ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس وقت بھی میدان سے باہر اُن کے پانچ ہزار سپاہی گشت کر رہے ہیں اور شامیانے کے ارد گرد بھی قیصر کے حفاظتی انتظامات کا یہ عالم ہے کہ اگر اُسے کوئی خطرہ پیش آیا تو رومی اُنکھ چپکنے کی دیر میں خاقان کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

ایرج نے قطعی ہو کر کہا: "عاصم ذرا احتیاط سے باتیں کرو۔ اگر کسی رومی نے ہماری گفتگو کا ایک فقرہ بھی سمجھ لیا تو ہم دونوں کی خیر نہیں۔"

عاصم نے کہا: "تم مطمئن رہو، سر دست رومیوں کو کیسیوں کے سوا کسی بات سے دلچسپی نہیں۔" ایرج بولا: "میں تمہاری تسلی کے لئے صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ آج کادن بازنطینی سلطنت کی نیرنگ خانوں میں تیریں دن سمجھا جائے گا۔"

عاصم نے کہا: "ایرج اگر تم کسی مرحلہ پر میری مدد کی ضرورت محسوس کرو۔ تو تم مجھے حکم دے سکتے ہو۔"

اور میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ اس عظیم ہم کی کامیابی کا تمام سہرا تمہارے سر ہوگا۔ اور میں تمہارے اشارے پر جان کی بازی لگانے کے بعد بھی انعام میں حصہ دار بننے کی کوشش نہیں کروں گا۔“

ایرج نے جواب دیا: ”اگر تم میرا حکم مان سکتے ہو تو خاموشی سے یہاں بیٹھے رہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ تم کس مذہب کے آدمیوں کا اعتماد حاصل کر چکے ہو، لیکن خاقان کے نزدیک میری حیثیت کسی کے ایک معمولی اہلچی سے زیادہ نہیں اور خاقان کے ساتھیوں سے بعید نہیں کہ وہ مجھے تمہارے ساتھ اس قدر مانوس دیکھ کر کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں۔ تم نے جس بے تکلفی سے ایک رومی کو یہاں سے اٹھا کر اپنی جگہ بٹھار دیا تھا، وہ اُن کے دل میں اُن گنت شبہات پیدا کر سکتی ہے۔ تمہارے بائیں ہاتھ بیٹھے والا دیوانت سیختین بڑی دیر سے میری طرف گھور رہا ہے۔ تمہیں میرے ساتھ اس جگہ ہلکام ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

عاصم نے جواب دیا: ”مجھے اپنی غلطی کا افسوس ہے، لیکن تمہیں دیکھ کر خاموش رہنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ تم اس وحشی کو تسلی دے سکتے ہو کہ میں تمہارا دوست ہوں۔“

ایرج نے جواب دیا: ”یہ وحشی میری زبان نہیں جانتا اور میں اپنے مترجم اور دوسرے ساتھیوں کو خاقان کے کیمپ میں چھوڑ آیا ہوں۔ وہ یہاں آنے سے ڈرتے تھے۔“

عاصم نے کہا: ”ایرج اگر بڑا نہ مانو تو میں یہ کہوں گا کہ تمہاری یہ جرأت میری توقع سے کہیں زیادہ ہے لیکن یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر رومی قبل از وقت ہوشیار ہو گئے تو تم اپنی جان کس طرح بچا سکو گے۔ میرے خیال میں وہ لوگ جو گھوڑوں پر بیٹھ کر یہ تماشا دیکھ رہے ہیں، اپنے اُن ساتھیوں سے کہیں زیادہ دُور اندیش ہیں جو اس وقت شامیوں کے اندر موجود ہیں۔ میرے لئے تمہاری جان کی قیمت ان تمام سیختین وحشیوں سے زیادہ ہے، اور اگر تم کسی مصیبت میں پھنس گئے تو میں واپس جا کر تمہارے عزیزوں اور دوستوں کو کیا جواب دوں گا۔“

ایرج نے جواب دیا: ”اگر تمہیں میری زندگی اس قدر عزیز ہے تو سنو! جب میرا یہاں سے اٹھ کر گھوڑے پر سوار ہونا ضروری ہوگا تو تم مجھے یہاں نہیں دیکھو گے۔“

عاصم نے کہا: ”لیکن مجھے تمہاری طرح اپنی جان بھی عزیز ہے۔ اگر تمہیں یہ پریشانی ہے کہ ایک سیختین پریشان ہو کر تمہاری طرف دیکھ رہا ہے تو مجھے بھی اس پاس بیٹھے ہوئے نوعی بڑی طرح گھور رہے ہیں۔“

ایرج نے کہا: ”جب سورج نصف النہار پر آئے گا تو تمہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ تمہیں لیا کرنا چاہیے۔“

عاصم نے کہا: ”تم جانتے ہو کہ میں ایک سپاہی ہوں اور ایک سپاہی ایسے معاملات کے متعلق تیارگی میں رہنا پسند نہیں کرتا جو اُس کی زندگی اور موت سے تعلق رکھتے ہوں۔“

ایرج نے کہا: ”تمہارے خیال میں آوار کا خاقان ایک سپاہی نہیں۔ اور وہ صرف خودکشی کے ارادے سے قیصر کے پاس بیٹھا ہوا ہے؟“

عاصم نے بظاہر مطمئن سا ہو کر کہا: ”اب میں تمہیں اپنے بہبودہ سوالات سے پریشان نہیں کروں گا۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ جب سورج نصف النہار پر آئے گا تو خاقان اور اُس کے ساتھی کسی بہانے شامیوں سے نکل کر اپنے گھوڑوں پر سوار ہو جائیں گے۔ اور اِس کے ساتھ ہی وہ لشکر جسے وہ راستے میں چھوڑ آئے ہیں، اچانک کسی سمت سے نمودار ہوگا۔ ایرج! اگر تم نے خاقان کو یہاں آنے پر آمادہ کیا ہے، تو کسری تمہیں بڑے سے بڑے انعام کا مستحق سمجھے گا۔“

ایرج نے جواب دیا: ”میں نے خاقان کو یہاں آنے پر آمادہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ ملاقات رومیوں کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں صرف کسری کی طرف سے دوستی کا پیغام لے کر خاقان کے پاس پہنچا تھا۔ لیکن قیصر کا اہلچی مجھ سے ایک ہفتہ قبل ہی خاقان سے مل چکا تھا۔“

”ایرج میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے ایک خطرے سے خبردار کر دیا ہے۔ اب اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں باقی تماشا گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر دیکھنا بہتر سمجھتا ہوں۔ میرا گھوڑا یہاں سے کچھ دُور ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ میرے لئے اچانک دُور پہنچنا آسان نہیں ہوگا۔“

عاصم نے یہ کہہ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس کے بائیں ہاتھ بیٹھے ہوئے دیوانت سیختین نے اچانک اُس کے کندھے پر اپنا آہنی ہاتھ رکھا اور اُسے پوری قوت سے نیچے دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی

ایرج نے عاصم کا بازو پکڑ لیا اور سرایا انقباض کر کہا۔ عاصم اگر تم نے زور آزمائی کی تو اس کا نتیجہ ہم دونوں کے لئے خطرناک ہوگا۔ اب اس کے شہادت دود کرنے کی یہی ایک صورت ہے کہ تم خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھے رہو۔ دوسرے لمحے اس مہیب صورت سینچنے کے خنجر کی نیز نوک عاصم کی پسلی کو چھو رہی تھی اور وہ اپنے اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ایرج سے یہ کہہ رہا تھا "تم اس وحشی کو یہ کیوں نہیں سمجھاتے کہ میں تمہارا ساتھی ہوں۔"

ایرج نے جواب دیا۔ "اس وحشی کو سمجھانا میرے بس کی بات نہیں، یہ میری زبان نہیں سمجھتا۔" عاصم کے لئے بے حس و حرکت بیٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، اس پاس بیٹھے ہوئے رومی گشتیاں دیکھنے میں اس قدر محو تھے کہ انہیں اپنے گرد پیش کی کوئی خبر نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا سینچین جو ایرج کے دائیں ہاتھ بیٹھا ہوا تھا، اس کے ساتھ اپنی جگہ تبدیل کر چکا تھا اور عاصم کی حالت اس شخص کی سی تھی، جسے دودندوں کے درمیان باندھ دیا گیا ہو۔

دلیرس نے ایک مرتبہ عاصم کی طرف دیکھا لیکن سینچین کے ہاتھ کا خنجر جس کا بیشتر حصہ اس کی پسلی میں چھپا ہوا تھا، اس کی نگاہوں سے اوجھل رہا۔ جوں جوں سورج بلند ہو رہا تھا۔ عاصم کی بے قراری اور بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اگر اُسے اس بات کا یقین ہوتا کہ اس کی چیخ پکار سے آنے والے خطرات ٹل سکتے ہیں تو وہ شاید اپنی جان کی بھی پروا نہ کرتا۔ لیکن ان حالات میں جرأت اور بہادری کے مظاہرے سے زیادہ ضبط و سکون کی ضرورت تھی۔



دندوں کی دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ اور ان پر فطری بدنہ والے رویوں کا جوش و خروش اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ جب رنجیں شامیانوں کے سامنے سے گزرنے لگیں تو عاصم بھی رویوں کی طرح ہاتھ اٹھا اٹھا کر نعرے لگانے لگا۔ سینچین سپاہی نے آہستہ سے اپنا خنجر چھو کر اُسے خاموش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن عاصم نے بے پروائی سے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ جب رنجیں دوسری بار قریب پہنچیں تو

دوبارہ بے تکلفی کے ساتھ شہر چھوڑا تھا۔ اور سینچین جو شاید ابھی تک کسی خطرناک قدم کے لئے تیار تھے، غصے اور اضطراب کی حالت میں اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جب رنجیں تیسری بار شامیانے کے قریب پہنچیں تو وہ چند بار انتہائی جوش و خروش سے نعرے لگانے کے بعد اچانک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سینچین اب خون آشام نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن عاصم کے جوش و خروش نے اُس پاس کئی اور آدمیوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ جب رنجیں گزر گئیں تو عاصم خاموشی سے بیٹھ گیا اور سینچین قدمے ملنے ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

اس کے بعد عاصم اپنے دل میں ایک فیصلہ کر چکا تھا، جب رنجیں قریب آنے لگیں تو وہ پوری حالت سے چند نعرے لگانے کے بعد اچانک کھڑا ہو گیا۔ سینچین سپاہیوں نے اس مرتبہ بھی گھنٹوں کے قریب دونوں طرف سے اُس کی تباہ کاری کی تھی، لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اٹھنے سے پہلے تباہ کا تسہ لکھل چکا ہے۔ جب سب سے آخری رنج قریب پہنچی تو اُس نے اچانک اپنی تباہیوں سے نیچے سرکاتے ہوئے ایک جست لگائی اور اپنے آگے بیٹھے ہوئے آدمیوں کے اوپر سے کود گیا۔ سینچین سپاہیوں نے انتہائی قہر و غضب کی حالت میں خالی تباہیوں کی طرف پھینک کر اُس کا پیچھا کیا، لیکن عاصم ان کی آن میں دو اور صفوں کے اوپر سے پھانڈ کر پوری رفتار سے شاہی شامیانے کا رخ کر رہا تھا۔ لیکن ان دو شامیانوں کے درمیان تیس چالیس قدم کا فاصلہ مسلح پہریداروں سے اٹا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک ایک جہتی کو قیصر کے شامیانے کی طرف بھاگتے دیکھا تو نیزے تان کر اُس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ عاصم نے ایک طرف سے کتر کر نکلنے کی کوشش کی لیکن قیصر کے محافظ اُسے تنگ گھیرے میں لے چکے تھے۔ عاصم چلایا "خدا کے لئے مجھے قیصر کے پاس لے چلو، اُس کی جان خطرے میں ہے، تم سب کی جانیں خطرے میں ہیں۔" لیکن اُس کی آواز پہریداروں کی چیخ پکار میں دب کر رہ گئی۔ دور رویوں نے اُسے اپنی گرفت میں لے کر ایک طرف کھڑا کر دیا۔ سینچین جو اُس کا پیچھا کر رہے تھے چند قدم دُور رک گئے۔ دلیرس بھاگتا ہوا آیا اور اُس نے کہا "ٹھہر جا! اسے چھوڑ دو۔" سپاہیوں نے اُسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تو وہ چلایا "دلیرس مجھے قیصر کے پاس لے چلو!"

دلیرس نے جواب دیا۔ ”اس وقت قیصر کے سامنے جانا کوئی مذاق نہیں۔ اگر تمہیں کوئی اہم بات ہو رہی تھی تو اس طرف بھاگنے کی بجائے مجھ سے کہنی چاہیے تھی۔“

عاصم نے کہا ”قیصر کی زندگی خطرے میں ہے، تم اُدھر دیکھو وہ اب میرا بیچا چھوڑ کر قیصر کے شانہ و شوکت کی طرف بھاگ رہے ہیں۔“

عاصم نے چھپٹ کر ایک رومی کے ہاتھ سے نیزہ چھین لیا اور اُن کے پیچھے بھاگنے لگا۔ دلیرس اور دوسرے رومیوں نے اُس کی تعلید کی، لیکن اُن سے پہلے قیصر کے چند حبشی محافظ آوار کے راستے میں حائل ہو چکے تھے۔ انہوں نے مڑ کر عاصم کی طرف دیکھا تو زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر اُس پر ٹوٹ پڑے اور وہ اُن کی تلواروں کے وار اپنے نیزے پر روکتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ دلیرس اپنی تلوار سونت کر عاصم کے ساتھ کھڑا ہو گیا لیکن اتنی دیر میں کئی اور سیستین شامیانے سے نکل کر اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے بھاگے آ رہے تھے۔ چند نانیے رومی سپاہیوں کو خاقان کے آدمیوں کے ساتھ لڑنے کا حوصلہ نہ ہوا لیکن جب انہوں نے دلیرس کی چیخ پکار سنی تو وہ بھی بادل ناخواستہ میدان میں آگئے۔ تاہم وہ لڑنے سے زیادہ آوار کو ڈرا دھماکا کر پیچھے ہٹانے پر اکتفا کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں رتھیں میدان کا چکر پورا کرنے کے بعد قریب آگئیں اور وہ اپنی جانیں بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ رتھوں کے گزر جانے کے بعد ایک آوار لڑتا بھڑتا قیصر اور خاقان کے سامنے پہنچ گیا اور اُس نے خاقان کو دیکھتے ہی دہائی عیاری۔ خاقان جلدی سے اُٹھ کر آگے بڑھا اور اُس نے ایک نانیہ کے لئے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد ہاتھ اٹھا کر بلند آواز میں کچھ کہا اور سیستین اُس کے گرد گھومتے گئے۔ قیصر تذبذب اور پریشانی کی حالت میں کھڑا تھا اور رومی اُس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ عاصم بھاگ کر شامیانے کے اندر داخل ہوا اور اُس نے شاہی آداب کا لحاظ رکھتے بغیر قیصر سے مخاطب ہو کر کہا۔

”آپ کی زندگی خطرے میں ہے، آپ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کریں۔“

خاقان جو اتنی دیر میں اپنے ساتھیوں سے چند باتیں کرنے کے بعد اپنی بدحواسی پر قابو پا چکا تھا اُس نے آوار قیصر کے قریب پہنچ کر بولا ”میرے آدمی کہتے ہیں کہ یہ پاگل آدمی مجھے قتل کرنے کے ارادے سے

س طرف بھاگا تھا۔“

قیصر نے جواب دیا۔ ”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے اس پاگل کو پہلے کسی نہیں دیکھا۔“
کلاڈیوس نے کہا۔ ”عالیجاہ اس آدمی کو میں جانتا ہوں اور یہ پاگل نہیں ہے۔“ پھر وہ آگے بڑھ کر خاقان سے مخاطب ہوا۔ ”اگر آپ کے آدمی اس شخص پر الزام لگاتے ہیں تو وہ یقیناً کسی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔“

خاقان نے کہا۔ ”اگر تم لوگ میرے ساتھیوں پر بھوٹ بولنے کا الزام عائد کرتے ہو تو میں یہاں بیٹنا پسند نہیں کروں گا۔“

قیصر نے تلخی ہو کر کہا۔ ”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس واقعہ کی پوری چھان بین کی جائے گی۔“
اگر یہ آدمی جرم ثابت ہوا تو ہم اسے آپ کے حوالے کر دیں گے۔ لیکن اُس طرف دیکھئے آپ کے آدمی گھوڑوں سمیت میدان کے اندر آ رہے ہیں۔“

خاقان نے جواب دیا۔ ”وہ احمق شاید یہ سمجھتے ہیں کہ میں کسی خطرے کا سامنا کر رہا ہوں لیکن آپ مطمئن رہیں، میں آپ کا یہ شاندار کہیں خراب نہیں ہونے دوں گا۔“

خاقان یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا اور جو سیستین شامیانوں سے نکل کر اُس کے گرد جمع ہو گئے تھے اُس کے پیچھے ہو لئے۔

قیصر نے جھنجھلا کر اپنے مشیروں سے کہا۔ ”ایک پاگل آدمی نے ہمارے معزز جہان کو تاراج کر دیا ہے خدا کے لئے جاؤ اور اُسے منانے کی کوشش کرو۔“ سنیت کے چند ارکان خاقان کے پیچھے بھاگنے لگے لیکن اُس نے مڑ کر دیکھنا گوارا نہ کیا۔ میدان میں جمع ہونے والے سیستین گھوڑے دوڑاتے ہوئے خاقان کی پیشوائی کے لئے بڑھے لیکن خاقان نے ہاتھ بلند کر کے اپنی زبان میں کچھ کہا اور وہ رک گئے۔



پہلو وچ میں آٹھ رتھوں نے حصہ لیا تھا، ختم ہو چکی تھی اور دوسری دوڑ میں حصہ لینے والے

جوان میدان میں آنے کے لئے قیصر کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن قیصر رنج و اضطراب اور بے بسی کی حالت میں کھڑا خاقان کی واپسی کا منتظر تھا۔

کلاڈیوس نے عاصم سے چند سوالات پوچھے اور اُس نے جلدی جلدی ایرج کے ساتھ اپنی ملاقات کا واقعہ بیان کر دیا۔

کلاڈیوس نے کسی توقف کے بغیر ایک افسر سے کہا: ”تم سپاہیوں کو حکم دو کہ وہ تمام فالتو گھوڑے شامیانے کے پیچھے لے آئیں۔“

ہرقل نے غصناک ہو کر کلاڈیوس سے کہا: ”کلاڈیوس، تم ہمیں ایک موہوم خطرے سے بھاگنے کا مشورہ نہ دو۔“

اُس نے جواب دیا: ”نہیں عالیجاہ میں صرف احتیاط کرنا چاہتا ہوں۔“

ہرقل اور زیادہ غضب ناک ہو کر چلے آیا: ”اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ مٹھی سمجھتی ہیں ہمارے لشکر کو گل جانیں گے تو میں قسطنطنیہ کے تخت پر بیٹھنے کی بجائے خاقان کے گھوڑوں کی رکھوالی کرنا زیادہ باعثِ سعادت سمجھتا ہوں۔ تم نے اس جگہ ہماری رسوائی کے سامان پیدا کئے ہیں اور اگر ہمیں یہ پتا چلا کہ اس پاگل آدمی نے تمہاری شہ پر یہ بدمرگی پیدا کی ہے تو تم نہیں معاف نہیں کریں گے۔“

کلاڈیوس نے جواب دیا: ”عالیجاہ آپ اسے نہیں جانتے اس نے کسریٰ کی فوج میں ایک بہت بڑا جہدہ چھوڑ کر ہمارے پاس پناہ لی ہے، اور یہ وہی ہے جس نے بابلونیوں میں مجھے ایرانیوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا تھا۔“

ہرقل نے کہا: ”اگر کسریٰ کی فوج کے کسی افسر نے یہاں بدمرگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تو یہ بات ہماری سمجھ میں آسکتی ہے۔ بیوقوف تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ ایرانی اس ملاقات کو ناکام بنانے کے لئے ایک کامیاب سازش کر چکے ہیں۔ اسے گرفتار کر لو اور خاقان سے کہو کہ ہم انہیں اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار دیتے ہیں۔“

کلاڈیوس نے کہا: ”عالیجاہ اس شخص کے متعلق فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیجئے، میں بڑی

زبرداری کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ ہمارا دشمن نہیں اور اگر میرا یہ دعویٰ غلط ثابت ہو تو میں اس کے بدلے بڑی سے بڑی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔“

قیصر نے کہا: ”تم خاموش رہو۔ ہم تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔“

سپاہیوں نے عاصم کو بازوؤں سے پکڑ کر شامیانے سے ایک طرف کھڑا کر دیا۔ وہ کچھ دیر بے بسی اور اضطراب، غصے اور نفرت کے طے جُملے جذبات کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر قیصر اور دوسرے رومیوں کی طرح اُس کی نگاہیں بھی سامنے میدان میں جمع ہونے والوں کی طرف مرکوز ہو کر رہ گئیں لچانک واں سے ایک آدمی نکلا اور پوری رفتار سے قیصر کے شامیانے کی طرف بھاگنے لگا۔ پھر چند ثانیے بعد کئی سیستین شہر چماتے ہوئے اُس کا پچھا کر رہے تھے۔ جب وہ شامیانے سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا، عاصم اپنا ناک بلند آواز میں چلانے لگا: ”اُسے بچاؤ! اُس کی مدد کرو! سیستین اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور وہ صرف اس لئے مارا جائے گا کہ خاقان کے آدمیوں نے اُسے میرے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُس نے خاقان کی سازش کا بھانڈا چھوڑ دیا ہے۔“

بھاگنے والے کی رفتار چھپا کرنے والوں سے زیادہ تھی اور دیکھنے والوں کو اُس کا شامیانے کے قریب پہنچ جانا یقینی نظر آتا تھا۔ لیکن اب چند سوار بھی اُس کا پچھا کر رہے تھے، اور وہ اُن کی اُن میں اُس کے قریب پہنچ گئے۔ سب سے اگلے سوار نے جھک کر اُس پر اپنی تلوار سے وار کیا، لیکن وہ اپنا ناک لڑا کر ایک طرف نکل گیا۔ دوسرے سوار نے اُسے اپنے نیزے کی زد میں لینے کی کوشش کی لیکن اُس نے اپنا ناک منہ کے بل گر کر اپنی جان بچالی۔ جب اُس نے دوبارہ اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تو میرے سوار نے بھاگتے ہوئے گھوڑے سے نیزہ مچھینا۔ ایرج ایک جگر دوزخ کے ساتھ گرا، اُٹھا اور چند قدم لڑکھڑانے کے بعد دوبارہ منہ کے بل گر پڑا، ایک اور سوار نے گھوڑے سے کود کر اُس کا تبر قلم کرنے کی کوشش کی، لیکن اتنی دیر میں کلاڈیوس اور چند سپاہی اُس کی مدد کے لئے پہنچ چکے تھے۔ ایک نوجوان نے سیستین کا دار اپنی تلوار پر روکا اور دوسرے نے اپنا نیزہ دکھا کر اُسے پیچھے دھکیل دیا اور باقی چند قدم ڈر ڈر کر اپنی زبان میں غم و غصے کا اظہار کرنے لگے۔ تاہم انہوں نے ذمہ ہونے والے کی موت یقینی سمجھ کر

رومیوں کے ساتھ اُلجھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

عاصم اپنے آپ کو سپاہیوں کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کلاڈیوس نے مڑکرائیں کی طرف دیکھا اور بلند آواز میں کہا: ”اُسے چھوڑ دو۔“

عاصم سپاہیوں کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی بھاگتا ہوا، ایرج کی طرف بڑھا اور اُس کے قریب دو زانو ہو کر ”ایرج! ایرج! پیکار نہ لگا۔ جب ایرج نے کوئی جواب نہ دیا تو سیستقین مطن ہو کر وہاں سے کھسکنے لگے۔ عاصم کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ مختصری دیر بعد ایرج نے آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے گردن اٹھانے کی کوشش کی تو عاصم نے سہار دے کر اُس کا سر اپنے زانو پر رکھتے ہوئے کہا: ”ایرج مجھے افسوس ہے، میں تمہاری جان نہ بچا سکا۔ لیکن تمہاری زبان سے چند الفاظ ہزاروں جانیں بچا سکتے ہیں۔“

ایرج نے ڈوبتی ہوئی آوازیں جواب دیا: ”اب میری باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ خاقان کا لشکر یہاں پہنچنے والا ہے۔ تم اپنی جان بچانے کی فکر کرو۔ یہ عجیب بات ہے کہ اب میں تمہیں جان بچانے کا مشورہ دے رہا ہوں اور مختصری دیر قبل میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ تمہیں اپنے ہاتھ سے قتل کروں۔ لیکن میری وہاں پیش نہ گئی۔ خاقان کے آدمیوں نے اُسے یقین دلادیا تھا کہ میں رومیوں کا جاسوس ہوں۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ عاصم یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جب میں اس طرف بھاگا تھا تو مجھے یقین تھا کہ تم مجھے پناہ دینے سے انکار نہیں کرو گے۔ اب تم میری کوئی مذہبی کر سکتے۔ اگر تمہیں کوئی تیز رفتار گھوڑا مل سکتا ہے تو یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ اگر اپنے لئے نہیں تو فسطنینہ کے لئے۔ میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ ابھی تک تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ عاصم تم جاؤ اور اگر قدرت تمہیں وہاں پہنچنے کا موقع دے تو فسطنینہ کو اتنا ضرور بتادینا کہ جسے وہ ہمیشہ قابلِ نفرت سمجھتی تھی مرتے وقت بھی اُس کی یاد سے غافل نہیں تھا۔“ ایرج یہاں تک کہہ کر کھانسنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے منہ سے خون جاری ہو گیا۔ چند ثانیے بعد اُس کی سانس اُکھر چکی تھی۔

ہرقل اُس کے قریب کھڑا تھا اور شاہی مترجم اُسے عاصم اور ایرج کی گفتگو کا مفہوم بتا رہا تھا۔ ایک گرسیدہ رومی نے کہا: ”عالیجاہ ایک مرتے ہوئے انسان کی باتیں جھوٹ نہیں ہو سکتیں۔ اگر خاقان

واقعی اس طرف آ رہا ہے تو ہمارے لئے قسطنطنیہ کا رخ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لیکن ہرقل نے فیصلہ جواب دے چکی تھی۔ ایرج نے ایک بھر بھری لے کر دم توڑ دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ زمین پر قتل ہو گیا۔ خاقان کو منانے کے لئے بھیجا تھا، واپس آتے دکھائی دینے لگے۔ سینیٹ کا بتاؤ رکن قریب پہنچتے ہی رومی سپاہیوں پر برس پڑا۔ تم سب پاگل ہو گئے ہو۔ تمہیں آوار کو ایک دن کا سر قلم کرنے سے روکنے کی ضرورت نہ تھی۔“

سپاہی کوئی جواب دینے کی بجائے مڑکھیر کی طرف دیکھنے لگے تو وہ قدرے نرم ہو کر قیصر سے بڑھا۔ ”عالیجاہ یہ معاملہ خطرناک حد تک بگڑ چکا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ خاقان کے آدمیوں کو جلد اس بات کا پتہ چل گیا کہ اُن کے ساتھ ایک ایرانی جاسوس بھی یہاں پہنچ گیا تھا اور اُس کا مقصد اس کے اور کچھ نہ تھا کہ یہ ملاقات ناکام بنا دی جائے۔“

قیصر نے جواب دیا: ”ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ اگر ہم یہ بات درست تسلیم کر لیں تو ایرانیوں کا نہیں بلکہ دو جاسوس یہاں موجود ہیں۔ مجھے یہ عرب جسے کلاڈیوس اپنا دوست کہتا ہے اس قتل کرنے والے آدمی سے کہیں زیادہ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر خاقان کو اطمینان ہو چکا ہے تو وہ ابھی وہاں کیوں کھڑا ہے؟“

رومی نے جواب دیا: ”عالیجاہ اُس کے آدمی ہماری نیت پر شک کر رہے ہیں اور وہ ان کے شبہات کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

قیصر نے کہا: ”کیا سیستقین یہ چاہتے ہیں کہ میں بذاتِ خود وہاں جا کر اُن سے التجا کروں گا؟“

”نہیں عالیجاہ وہ آجائیں گے۔“

عاصم جو ابھی تک ایرج کے قریب بیٹھا ہوا تھا، اٹھ کر کلاڈیوس سے مخاطب ہوا: ”یہ شخص واقعی رومن کا جاسوس تھا لیکن خاقان اسے اپنی کارگزاری دکھانے کے لئے ساتھ لایا تھا۔ اب یہ مر رہا ہے اور میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے میرے متعلق کیا سوچا ہے؟“

کلاڈیوس نے قیصر کی طرف دیکھا اور کہا: ”عالیجاہ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص کسی سازش کی

نیت سے بیان آیا ہے تو میں بھی اس کے جرم میں حصہ دار ہوں۔ اور ہم دونوں کو ایک جیسی سزا ملے گی۔
لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ ہمارے متعلق کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے خاقان کے ارادوں کے متعلق اپنی
اطمینان حاصل کریں۔“

ایک رومی نے کہا: ”عالیجاہ، میں یہ درخواست کرتا ہوں کہ اس شخص کو خاقان کے حوالے کر دیا
جائے۔ سیتھین ایسے آدمی کے منہ سے سچی باتیں اگلوانے کے طریقے جانتے ہیں۔“

قیصر تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا، اچانک میدان کی باتیں جانب ایک سرپرٹ گھوڑے کی
ٹاپ سنائی دی۔ اور کنارے پر جمع ہونے والے لوگوں نے ادھر ادھر سمٹ کر آنے والے کے
مٹھوڑی سی جگہ خالی کر دی، ایک رومی سوار میدان میں داخل ہوتے ہی دونوں ہاتھ اٹھا کر بلند آواز میں
لگا: ”ہوشیار! ہوشیار! آواز آرہے ہیں۔“

سیتھین اس سوار کو دیکھتے ہی اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور پیشتر اس کے کہ رومی اپنے
دعواس پر قابو پاتے، وہ ایک طرف مار دھاڑ کرتے ہوئے میدان سے باہر نکل گئے۔

رومی سوار اب قیصر کے سامنے رک کر ڈائی دے رہا تھا، لیکن قیصر کی حالت اس شخص کی سی
تھی جسے اچانک سانپ نے دس لیا ہو۔ چند اور رومی سوار مختلف سمتوں سے میدان میں داخل ہوئے
اور ان سب کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا: ”سیتھین آرہے ہیں۔“

اب ہر سمت افزائری کا عالم تھا۔ مقامی لوگ چھتے چلاتے اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے اور
تسطنظینہ اور دوسرے شہروں سے آنے والے معززین افزائری کے عالم میں شامیانے کے پیچھے پھاڑ
اپنے گھوڑوں پر سوار ہو رہے تھے۔ رومی فوج کے سوار اور پیادہ سپاہی چاروں اطراف سے سمٹ کر
قیصر کے گرد مہین بائذھنے لگے۔ ایک نوجوان جن نے قیصر کے گھوڑے کی باگ پکڑ رکھی تھی، جھاگتا ہوا،
اُس کے سامنے پہنچا اور قیصر کو کسی حد تک اپنی سرسبلی پر قابو پا چکا تھا کسی توقف کے بغیر گھوڑے پر سوار
ہو گیا۔ کلاڈیوس نے بلند آواز میں کہا: ”عالیجاہ آپ سیدھے تسطنظینہ کا رخ کریں، ہم دشمن کو روکنے کی
کوشش کریں گے۔ قیصر نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور اُس کے محافظ سپاہیوں کا ایک دستہ اُس کے ساتھ پہنچا۔“

دلیس اور عاصم کی طرح کلاڈیوس بھی اپنا گھوڑا نوکر دوں کے پاس چھوڑ آیا تھا لیکن اب اُس کے لئے
پس جانے کا موقع نہ تھا۔ چنانچہ جب ایک سپاہی نے اُسے اپنا گھوڑا پیش کیا تو وہ بلا توقف اُس پر سوار
ہو گیا اور ادھر ادھر بھاگ کر سوار اور پیادہ دستوں کو ہدایات دینے لگا۔ تماشاخیوں میں سے کئی ایسے تھے
باز اتفری کے باعث اپنے گھوڑوں سے محروم ہو چکے تھے لیکن اُن کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ ہر طبقہ کے
بہن نازک مزاج دوسرا پالکیوں پر سوار ہو کر آئے تھے لیکن اب انہیں اٹھانے والے رفیق ہو چکے تھے
دشمنوں کے سوار خاقان کے لشکر کی آمد کی اطلاع پاتے ہی فرار ہو چکے تھے اور ان کے راستے میں آنے والے
کئی آدمی زخمی اور ہلاک ہو چکے تھے۔



عاصم اپنا گھوڑا لینے کے لئے بھاگا، لیکن راستے میں چھتے چلاتے بدحواس لوگ ایک دوسرے
کے اوپر گر رہے تھے اور کئی خواتین اور بچے اُن کے پاؤں تلے روندے جا رہے تھے۔ ایک نیچے کے قریب
دو مضبوط آدمی ایک گھوڑے پر قبضہ جانے کے لئے زور آزمائی کر رہے تھے اور ایک بڑھاد مائی چار ہاتھ
تھبے ان ڈاکوؤں سے بچاؤ، میری مدد کرو، یہ گھوڑا میرا ہے۔“

اپنے اگے اور پیچھے لوگوں کے بے پناہ ہجوم کے باعث عاصم کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کس سمت
بھاگ رہا ہے۔ مٹھوڑی دیر اور ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد اُسے اُس پاس ہزاروں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی
دینے لگی۔ پھر اچانک ایک نیچے کے قریب اُسے کلاڈیوس کا ایک عمر رسیدہ غلام دکھائی دیا۔

”میرا گھوڑا کہاں ہے؟“ عاصم نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد بدحواس سا ہو کر پوچھا۔
غلام نے جواب دیا۔ دلیس آپ سے نہیں ملا، وہ ابھی تینوں گھوڑے لے گیا ہے۔ وہ یہ کہتا
تھا کہ میرے آقا واپس نہیں آئیں گے۔ اور اُن کے دو نوکر بھی دلیس کے ساتھ چلے گئے ہیں، اور میں
سوچ رہا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

”اگر تمہیں قتل ہونا پسند نہیں تو یہاں سے بھاگ جاؤ، ورنہ کسی ایسی جگہ چھپ جاؤ، جہاں دشمن

کی نگاہ نہ پہنچ سکے۔“

دوڑے رہی تھی۔

میرجہ وہ شہر سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر تھے تو پیچھے آنے والوں کی جھین سنا دیں۔
 یں۔ عاصم نے مڑ کر دیکھا تو اسے سیقتیں سواروں کی ایک ٹولی دکھائی دی۔ وہ اپنی رہی سہی قوت
 روٹے کار لاتے ہوئے بھاگا۔ دروازے کے سامنے اور فیصل کے اوپر چند سپاہی شور مچا رہے تھے،
 یقین آگئے، بھاگا، جلدی کرو!!

دروازے میں داخل ہوتے وقت عاصم اپنے پیچھے آنے والوں کی چیزوں کے ساتھ گھوڑوں کی ٹاپ
 لٹ رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے بوڑھے کو نیچے اتارا اور نڈھال سا ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ عاصم کے
 پیچھے اس کے ساتھ افراد سے زیادہ اندر داخل نہ ہو سکے۔ اس کے بعد دشمنوں کے سوار اس قدر قریب
 پہنچے تھے کہ پہریندار دروازہ بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔

عاصم چند نائنے ستانے کے بعد اپنا پسینہ پونچھتا ہوا اٹھا اور کسی توقف کے بغیر فیصل کے زینے پر
 چڑھنے لگا۔ اوپر جا کر اُس نے ایک دلخراش منظر دیکھا۔ سیقتیں سوار جن کی تعداد پچاس کے زیادہ نہ
 تھی دروازے کے آس پاس لاشوں کے انبار لگانے کے بعد قیدیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے
 واپس جا رہے تھے۔ اُس نے ایک نوجوان سے جو پہریداروں کا افسر معلوم ہوتا تھا مخاطب ہو کر کہا: ”اگر
 تم لوگ اپنے تیروں کے استعمال میں عقل سے کام نہ لیتے تو کئی اور آدمیوں کی جان بچ سکتی تھی۔ اور تمہیں
 دروازہ بند کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی، یہاں سے دس اچھے تیر انداز اُن کی پیش قدمی روکنے کے لئے
 کافی تھے۔“

”آپ کون ہیں؟“ رومی افسر نے سوال کیا۔

”میں ایک اجنبی ہوں۔“ عاصم یہ کہہ کر نیچے اُتر آیا۔

عمر رسیدہ آدمی نے اُسے دیکھتے ہی کہا: ”اگر میری نگاہیں مجھے دھوکا نہیں دیتیں تو تم وہی ہو،
 جس نے قیصر کو اس حملے کے متعلق خبردار کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”جی ہاں میں وہی ہوں،“ عاصم نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔

عاصم یہ کہہ کر واپس مڑا تو میدان کی طرف نعروں اور چیزوں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ سیقتیں حملہ
 کر چکے ہیں۔ کچھ دیر وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے، آوار کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی صورت
 میں اُس کی موت یقینی تھی۔ لیکن پیدل بھاگنے کی صورت میں بھی اُسے قسطنطنیہ پہنچ جانا بعید از قیاس
 معلوم ہوتا تھا۔ کچھ دیر تذبذب اور پریشانی کی حالت میں رادھرا دھر دیکھنے کے بعد وہ ہر قلبہ کی طرف
 بھاگنے والوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ خالی تھے اور یہ پہلا موقع تھا کہ وہ صرف اپنی جان بچانے
 کے لئے بھاگا رہا تھا۔ غھوڑی دیر بعد موسم سرما کی تنگ ہوا کے باوجود اُسے پسینہ آ رہا تھا۔ جب سانس
 پھول گئی تو اُس نے اپنی رفتار ذرا کم کر دی۔ لیکن غھوڑی دیر بعد پھر زندگی کی خواہش جسمانی تنگدلی پر
 غالب آنے لگی اور اُس نے اپنی رفتار تیز کر دی، شہر سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر اُسے ایک نوجوان لڑکی
 دکھائی دی، جس نے ایک عمر رسیدہ نجیب اور لاغر آدمی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ یہ بوڑھا جو اپنے لباس سے طبقہ
 اعلیٰ کا فرد معلوم ہوتا تھا، چلا پلا کر لڑکی سے کہہ رہا تھا: ”یہی اب میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا، خدا
 کے لئے مجھے چھوڑ دو اور اپنی جان بچانے کی کوشش کرو۔ ہماری فوج دشمن کو زیادہ دیر نہیں روک سکی“
 اور نوجوان لڑکی جو اس بے بسی کے عالم میں بھی ایک شہزادی معلوم ہوتی تھی، یہ کہہ رہی تھی: ”ابا جان
 ذرا ہمت سے کام لیجئے، وہ دیکھتے شہر کا دروازہ یہاں سے زیادہ دُور نہیں۔“

عاصم ایک ثانیہ کے لئے اُن کے قریب رُکا اور پھر دوسرے لوگوں کی طرح بے پروائی سے آگے
 چل دیا۔ لیکن غھوڑی دُور آگے جانے کے بعد اُس نے مڑ کر دیکھا تو بوڑھا زین پر بیٹھا ہوا تھا اور لڑکی اُس کا
 بازو کھینچ کر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی، بوڑھا بادل ناخواستہ اٹھا، لیکن اُس کی ٹانگیں رُک کر رہی تھیں۔
 عاصم چند نائنے تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا، پھر اچانک بھاگا کہ اُن کے قریب پہنچا۔ میں آپ کی
 مدد کر سکتا ہوں۔“ اُس نے کہا۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دے سکتے اُس نے عمر رسیدہ آدمی
 کو اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ کچھ دیر بھاگنے کے بعد وہ ایک تنگے ہوئے گھوڑے کی طرح ہانپ
 رہا تھا اور اُس کا چہرہ پسینے سے شمر اور بوچکا تھا۔ تاہم اُس کی رفتار ایسی تھی کہ لڑکی بڑی مشکل سے اُس کا

پہریداروں کا افسر فیصل کے زینے سے نمودار ہوا اور اُس نے بڑے کو ادب سے سلام کرتے ہوئے کہا: ”جناب مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن نے شہر پر حملہ کرنے کا ارادہ طوی کر دیا ہے لیکن جو رہنما شہر سے باہر ہیں اُن میں سے شاید ایک بھی زندہ واپس نہ آسکے۔ انہیں ٹھکانے لگانے کے بعد شاید یہ یقین پوری قوت کے ساتھ شہر پر حملہ کریں گے۔“

عاصم نے کہا: ”ایک اجنبی کو آپ کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خاقان کے لشکر کی منزل قسطنطنیہ ہے، یہ شہر نہیں۔ اگر اس شہر پر قبضہ کرنے کی خواہش ہوتی تو اس طرف صرف پچاس، ساٹھ سواری بھیجے پر اکتفا نہ کرتا۔“

بڑے نے کہا: ”اگر ہر قبیلہ پر حملہ نہ ہوا تو میں اسے قدرت کا ایک معجزہ سمجھوں گا۔ یہاں اب خالی دیواروں کے سوا اُن کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں۔ نوجوان میں اس شہر کا منصف ہوں۔ اور تاتاریوں کے خوف سے میرے اپنے نوکر میرا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ میں تم سے پوچھ سکتا ہوں، کہ تم نے میری جان بچانے کی کوشش کیوں کی تھی؟“

عاصم نے جواب دیا: ”مجھے معلوم نہیں شاید آپ کی بیٹی کی ہمت دیکھ کر میرا ضمیر بیدار ہو گیا تھا۔“

شہر کے حاکم نے کہا: ”اب میں ایک اور سوال پوچھنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس شہر کے باشندے زندگی کی نسبت موت سے زیادہ قریب ہیں، تاہم جب تک دشمن کی تلواریں ہماری گردنوں تک نہیں پہنچتی تم ہمارے جہان ہو اور ہم اپنی بیچارگی کے احساس کو میزبانی کے فرائض میں حائل نہیں ہونے دیں گے۔“

عاصم نے جواب دیا: ”میری منزل مقصود قسطنطنیہ ہے لیکن اپنے گھوڑے سے محروم ہونے کے بعد میں یہاں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ اب اگر آپ میرے لئے ایک گھوڑے کا بندوبست کر سکیں تو میری کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔“

”گھوڑے کے متعلق تمہیں پریشانی ہونے کی ضرورت نہیں، لیکن موجودہ حالات میں تمہارے لئے

یہ کاغذ کرنا یہاں ٹھہرنے سے کم خطرناک نہیں ہوگا۔“

جناب دیاں ایک دوست میرا انتظار کر رہا ہے اور مجھے مصیبت کے وقت اُس سے دور رہنا نہیں۔“

”بہت اچھا تمہارے لئے گھوڑے کا انتظام کر دیا جائے گا، لیکن تمہارے لئے دن کی روشنی میں رات کی تاریکی میں سفر کرنا زیادہ بہتر ہوگا، کم از کم اچانک کسی گروہ کے ساتھ تصادم کی صورت میں بچ کر نکل جانے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ اگر سیتھین لشکر نے پلٹ کر شہر کا محاصرہ نہ کر لیا تو یہیں رات ہوتے ہی روانہ کر دیں گے۔ اور میں یہ کوشش کروں گا کہ کوئی باہمت جوان تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہو جائے۔“

شہر سے باہر کھیلوں کے میدان کے آس پاس چند شدید بھڑپوں کے بعد رومی دستے پسپا ہو گئے لیکن انان نے قبضہ کو پکڑنے کی نیت سے اُن کا تعاقب جاری رکھا۔ خاقان کے حکم سے پیچھے رہ جانے والے چند راتوں نے شہر سے باہر لوٹ مار کرنے اور ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرنے کے بعد ہر قبیلہ بردھاوا بولنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

غروب آفتاب سے کچھ دیر بعد جب وہ لوگ جو ادھر ادھر چھپ کر تاتاریوں کے ہاتھوں قیدی یا قتل کرنے سے بچ گئے تھے، واپس آ رہے تھے تو عاصم اور اُس کے ساتھ ایک رومی گھوڑوں پر سوار ہو کر قسطنطنیہ کی طرف چل پڑے۔

باب ۳

حوالے کر دوں گا، لیکن اب شاید کوئی اس بات پر یقین نہ کرے۔ اب اگر عام بھی زندہ واپس آجائے تو وہ بھی شاید یہی کہے گا کہ میں نے اپنی جان بچانے کے لئے ایک دوست کا تیز رفتار گھوڑا ہتھیالیا۔ مرس نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا: ”بناوہ ایک شریف آدمی تھا اور ایک شریف آدمی بدترین حالات میں بھی اپنے دوستوں کے متعلق اس قسم کی بدگمانیاں نہیں کیا کرتا۔ تم سے یہ غلطی ضرور ہوئی کہ تم اُسے بتائے بغیر اُس کا گھوڑا لانے چلے گئے تھے لیکن اس قسم کی غلطیاں ہم سب کرتے ہیں۔ جب قیصر یہاں سے روانہ ہوا تھا تو یہ کون کہہ سکتا تھا کہ خاقان کے ساتھ اُس کی ملاقات کے بعد ہم ترکیہ سے لے کر قسطنطنیہ کی چار دیواری تک مدیوں کی لاشوں کے انبار دیکھیں گے اور وہ ہماری لاکھوں لٹے عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر لے جائیں گے۔ ہم امن کے متعلق کبھی اتنے پر اُمید نہیں ہوئے تھے اور ہم نے کبھی اس قدر تباہی کا سامنا نہیں کیا تھا۔ اگر ہم تمہاری طرح سوچیں تو ہر قتل سے کہیں زیادہ مجھے اور میرے بیٹے کو اس تباہی کی ذمہ داری قبول کرنی پڑے گی۔ اگر کلاڈیوس خاقان کے پاس نیک توقعات لے کر نہ جانا تو ہم پر یہ مصیبت نہ آتی، اگر میں قسطنطنیہ کے اکابر اور سینیٹ کے ارکان کو ہر قلعہ جانے کی ترغیب نہ دیتا تو وہ اس طرح ہلاک نہ ہوتے، لیکن کوئی انصاف پسند آدمی ہم پر بدینتی کا الزام عائد نہیں کر سکتا۔“

کلاڈیوس نے مغموم لہجے میں کہا: ”لیکن آبا جان ہمارا معاملہ ولیرس سے مختلف ہے۔ آج قسطنطنیہ کا کوئی آدمی ایسا نہیں جو مجھے اس تباہی کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا۔ کل سینیٹ کا اجلاس ہو رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہاں سب سے زیادہ نکتہ چینی مجھ پر ہوگی۔ قیصر نے وہاں مجھے انعام دینے کیلئے نہیں بلایا، بلکہ اُن لوگوں کی گالیاں سننے کی دعوت دی ہے جو کل تک مجھے اپنا محسن سمجھتے تھے۔ آبا جان میں مستعفی ہونے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اب میرے لئے قیصر کے سامنے یہ اعلان کرنے کے سوا

لٹے گبن کے بیان کے مطابق آوار قبائل قسطنطنیہ کی چار دیواری تک مار دھاڑ کرنے کے بعد دو لاکھ ستر ہزار مدیوں کو غلام بنا کر دریا سے ڈیمنوب کے پار لے گئے تھے۔

مرس، کلاڈیوس اور ولیرس مغموم صورتیں بنا کر ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جولیا جتنی دیر سے اندر داخل ہوئی اور اُس نے کہا: ”انطونیہ نے کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اب اُسے تسلی دینا پڑے۔ بس کی بات نہیں۔ اگر عام کے متعلق کوئی اطلاع مل جاتی تو شاید اُسے غموڑا بہت قرار آجاتا۔ آج وہ اپنے باپ کی بجائے اُس کے لئے زیادہ روتی ہے۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا ہے کہ وہ زندہ ہے، لیکن وہ بار بار یہی کہتی ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو میرے باپ کی قبر پر مٹی ڈالنے کے لئے ضرور پہنچتا۔ آج وہ صرف عام کا گھوڑا دیکھنے کے لئے اصطبل تک گئی تھی۔“

ولیرس نے کلاڈیوس سے مخاطب ہو کر کہا: ”اگر وہ واپس نہ آیا تو میں مرتے دم تک اپنے آپ کو قابل معافی نہیں سمجھوں گا۔ وہ یقیناً اپنے گھوڑے کی تلاش میں گیا ہوگا اور جب اُسے یہ پتہ چلا ہوگا کہ میں اُس کا گھوڑا لے گیا ہوں تو اُس نے یہی سمجھا ہوگا کہ میں اُسے موت کے منہ میں چھوڑ کر جھاگ گیا ہوں۔ وہ اُن آدمیوں میں سے نہیں تھا جو موت سے ڈرتے ہیں۔ اُس نے یقیناً ایک بہادر آدمی کی طرح جان دی ہوگی۔ لیکن میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر میں اُس کی جگہ ہوتا تو اُس بے بسی کی حالت میں میرے دل پر کیا گزرتی۔ کلاڈیوس، تمہیں یقین نہیں آئے گا، لیکن میں نے آخری وقت تک اُسے تلاش کیا تھا۔ میں نے جہاں سے قبل دوبارہ اپنے نیچے کا رخ کیا تو مجھے اس بات کی پروا نہ تھی کہ دشمن کا ایک دستہ میرے پیچھے ہے۔ پھر چاروں طرف سے مایوس ہو کر جب میں اپنا گھوڑا اچھوڑ کر اُس کے گھوڑے پر سوار ہوا تھا تو اُس وقت بھی میری نیت یہی تھی کہ اگر وہ مجھے کسی جگہ نظر آ گیا تو میں بلا توقف اُس کا گھوڑا اُس کے

کوئی راستہ باقی نہیں رہا کہ میں کسی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کا اہل نہیں ہوں۔
 مرس نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا: ”میں بیٹا قیصر نہیں اپنے ماضی کی اُن کوتاہیوں کا ذمہ دار
 نہیں ٹھہرائے گا، جن کے باعث ہم اپنے حقیر دشمن سے امن اور صلح کی بھیج مانگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔
 مجھے یقین ہے کہ سینیٹ کا کوئی رکن تمہارے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرے گا۔“
 کلاڈیوس کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ دروازے کی
 طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ اچھل کر آگے بڑھا اور بے اختیار آنے والے کے ساتھ لپٹ گیا۔ یہ عاصم
 تھا۔ اُس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ دلیریں کو محو ٹی دیر اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ پھر وہ
 اٹھ کر آگے بڑھا اور مغوم لہجے میں بولا: ”عاصم تمہیں یقین نہیں آئے گا لیکن میں بے قصور ہوں۔ مجھ
 سے صرف یہ غلطی ہوئی کہ میں تمہیں بنائے بغیر گھوڑے لینے چلا گیا تھا۔“

عاصم نے جواب دیا: ”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، مجھے آپ کے غلام نے
 بتا دیا تھا۔“
 کلاڈیوس نے پوچھا: ”وہ کہاں ہے؟“
 ”کون! آپ کا غلام؟ مجھے معلوم نہیں۔ وہ آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ اور میں نے اُسے بھاگنے
 کی ہدایت کی تھی۔“
 مرس نے آگے بڑھ کر عاصم سے مصافحہ کیا اور اُسے اپنے قریب بٹھالیا۔ کچھ دیر یہ چاروں مغوم
 ٹنگا ہوں سے کبھی عاصم اور کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ بالآخر کلاڈیوس نے کہا: ”عاصم تمہیں
 معلوم ہے کہ۔“
 ”مجھے سب معلوم ہے۔“ اُس نے بات کاٹتے ہوئے کہا: ”میں سیدھا سرائے کی طرف گیا تھا اور
 اِس کے بعد اُس کی قبر سے بھی ہو آیا ہوں۔“
 ”میں انطونیا کو اطلاع دیتی ہوں۔ جو لیا یہ کہہ کر عقب کے کمرے میں چلی گئی۔ اور محو ٹی دیر بعد
 انطونیا اُس کے ساتھ عقبی دروازے میں کھڑی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے عاصم کی طرف دیکھ رہی تھی۔

۵۲۳
 زبوس جلدی سے اُٹھ کر آگے بڑھا اور اُس نے انطونیا کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے قریب بٹھالیا۔ انطونیا
 عاصم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور عاصم کو اُس کی خاموش نگاہوں کی فریاد الفاظ سے کہیں زیادہ مؤثر
 سمجھ رہی تھی۔ عاصم نے بھرائی ہوئی آوازیں کہا: ”میری بہن، فرس تمہارا باپ تھا، لیکن اس دنیا
 مجھے اُس کی زیادہ ضرورت تھی۔ میں نے اپنے مقدمہ کی تاریخوں میں صرف ایک ستارہ دیکھا تھا اور
 بادہ بھی رُوپوش ہو چکا ہے۔“
 انطونیا آہستہ آہستہ سسکیاں لینے لگی اور پھر اچانک اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب
 پوٹ نکلا۔ پھر اُس نے قدرے سنبھل کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: ”وہ حملے سے چند گھنٹیاں قبل یہاں
 تھے اور میں نے بہت التجائیں کی تھیں کہ آپ یہاں ٹھہر جائیں، لیکن وہ یہ کہتے تھے کہ اب تمہیں،
 پڑوں کی طرح ضد کرنے کی عادت چھوڑ دینی چاہیے۔ اب تم بڑی بوچھلی ہو۔ پھر جب مجھے یہ معلوم ہوا
 کہ دشمن شہر کے قریب پہنچ چکا ہے تو میں لوکر کے ساتھ اُن کا پتا کرنے کے لئے بھاگی، لیکن شہر کا دروازہ
 بند ہو چکا تھا اور لوکر سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود مجھے یہ تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ حملے سے
 پہلے شہر میں آگئے ہوں گے۔“
 عاصم نے کلاڈیوس سے سوال کیا: ”دشمن آپ سے پہلے یہاں پہنچ گیا تھا؟“
 اُس نے جواب دیا۔ آوار نے کئی سمتوں سے پیش قدمی کی تھی۔ اور یہ وہ دستے تھے جو خاقان نے
 ہرقلم میں ہمارے ساتھ جنگ کرنے سے پہلے قسطنطنیہ کی طرف روانہ کر دیئے تھے۔ جب ہم یہاں پہنچے
 تھے تو وہ مضافات کی بستیوں کو تباہ و برباد کر رہے تھے اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں کسی شدید محنت
 اسانا کے بغیر شہر میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ ورنہ اگر وہ محو ٹی دیر کے لئے بھی ہمیں روک لیتے
 تو ہمارے پیچھے جو لشکر آ رہا تھا وہ ہمیں روندنا ہوا شہر کے دروازے تک پہنچ جاتا۔ میں شہر میں داخل
 ہونے ہی فیصل کے محاذ دستوں میں شامل ہو گیا۔ پھر جب مجھے انطونیا کے آبا جان کا خیال آیا تو باہر یہ
 حالت تھی کہ اگر میں قسطنطنیہ کی ساری فوج کو لے کر باہر نکلتا تو بھی خاقان کا لشکر ہمیں چند قدم سے زیادہ
 نہ بڑھنے کا موقع نہ دیتا۔ میں بھی انطونیا کی طرح اپنے دل کو یہی تسلی دے سکتا تھا کہ وہ ہمارے گھر

پہنچ چکے ہوں گے۔ جب دشمن نے شہر کی تفصیل پر تیر رسا نے کے بعد سپاہی اختیار کی تو میں گھر جانے سے پہلے سرائے میں پہنچا اور اُس کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا وہ ناقابل بیان ہے۔ وہاں صرف ایک بڑھا نوکر موجود تھا جس نے حملے کے وقت گھاس کے انبار میں چھپ کر اپنی جان بچائی تھی۔“

عاصم نے آبدیدہ ہو کر کہا ”وہ نوکر اب مجھی وہیں تھا اور میں اُس سے ساری داستان سُن چکا ہوں“
 ولیرس نے کہا ”ہمارا خیال تھا کہ آپ سیدھے وہاں آئیں گے، اس لئے ہم نے اُسے انتظار کرنے کا مشورہ دیا تھا؟“

کلاڈیوس نے پوچھا ”لیکن تم کہاں غائب ہو گئے تھے“

عاصم نے جواب دیا ”اپنا گھوڑا غائب دیکھنے کے بعد میرے لئے شہر کی طرف بھاگنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہاں ایک شریف آدمی نے میری مدد کی اور مجھے گھوڑا اور ایک ساتھی دے کر رات کے وقت روانہ کر دیا۔ راستے میں جگہ جگہ دشمن کا فد شبہ محسوس کر کے ہم نے ایک طویل راستہ اختیار کیا اور اگلے دن ایک جنگل میں چھپے رہے۔ میں شاید ایک لمحہ کی تاخیر بھی گوارا نہ کرتا، لیکن میرا ساتھی بہت محتاط تھا اور مجھے ان دیکھے راستوں پر اُس کی راہنمائی کی ضرورت تھی۔“

”تمہارا ساتھی کہاں ہے؟“

”وہ واپس چلا گیا، قسطنطنیہ کے آس پاس تنہا ہی کے دلغزاش مناظر کے دیکھنے کے بعد اُس میں آگے بڑھنے کی سکت نہ تھی۔ لیکن اب کیا ہوگا؟“

کلاڈیوس بولا ”اب ہم کبھی کیا سکتے ہیں۔ کل سینیٹ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ اس تنہا ہی کی ساری ذمہ داری مجھے پر ڈال دی جائے گی؟“

مرقس نے کہا ”نہیں، نہیں بیٹا یہ نہیں ہو سکتا۔“

کلاڈیوس نے عاصم کی طرف متوجہ ہو کر کہا ”میرے آبا جنان سینیٹ کے متعلق بہت مطمئن ہیں، لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ وہاں ایک آواز بھی میرے حق میں نہیں اُٹھے گی۔ مجھے اگر جلالِ وطن نہ کیا گیا تو بھی میری کم از کم سزا یہ ہوگی کہ میں اُن کے سامنے اپنی نااہلیت کا اعتراف کر کے ملازمت سے

انطونیہ جیسے اپنے باپ کی موت کے سوا دنیا کا ہر مسئلہ بے حقیقت محسوس ہوتا تھا، اب مضرب ی ہو کر کبھی اپنے شوہر اور کبھی عاصم کی طرف دیکھ رہی تھی۔

عاصم نے کلاڈیوس سے مخاطب ہو کر کہا ”کیا میں سینیٹ کے سامنے جا سکتا ہوں؟“

”تمہیں سینیٹ کے سامنے لے جانا مشکل نہیں، لیکن وہاں تم میری بے بسی کے سوا اور کیا دیکھو گے۔“

عاصم نے جواب دیا ”آج ہر رومی تم سے زیادہ بے بس ہے۔ میرے نزدیک انہیں یہی سے بچانے کی یہی ایک صورت ہے کہ مستقبل کے متعلق جو اُمیدیں خاقان کی بد عہدی کے بلوٹ تم ہوئی ہیں وہ از سر نو زندہ کی جائیں۔“

”تم یہ سمجھتے ہو کہ تم انہیں اُمید کی نئی روشنی دکھا سکتے ہو؟“

عاصم نے جواب دیا ”مجھے اپنی کم مالگی اور بے بسی کا اعتراف ہے۔ لیکن آج جب میں فرسز تقریر کر رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے کہہ رہا ہے عاصم! اس شہر کو تنہا ہی سے بچاؤ، ہاں تمہاری وہ مہین رہتی ہے جس کے آفسوقیصر کے خزانوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔“

کلاڈیوس نے کہا ”ایسی بات کہنا روم کے ایک سپاہی کو زیب نہیں دیتا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ قسطنطنیہ کو اب کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ کل سینیٹ کے اجلاس کے بعد لوگ یہی خبر سنیں گے تو پھر نے بالآخر قسطنطنیہ میں پناہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

عاصم نے کہا ”اگر موجودہ حالات میں ایک اجنبی کو قیصر اور سینیٹ کے ارکان کے سامنے زبان رکنے کی اجازت مل سکے تو ممکن ہے کہ میں انہیں کوئی نیک مشورہ دے سکوں۔“

کلاڈیوس نے کہا ”جہاں تک قیصر کا تعلق ہے تم اس وقت بھی اُن کے پاس جا سکتے ہو۔ میں نے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے یہاں پہنچنے ہی تمہیں تلاش کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن کل سینیٹ کی مجلس میں تمہارا اُن کے سامنے پیش ہونا خلافِ مصلحت ہے۔ وہ میرے خلاف اس قدر مشتعل

ہیں کہ گرم نے میری حمایت میں کچھ کہنے کی کوشش کی تو میرے ساتھ تم بھی اُن کی ملامت کا ہدف بن جاؤ گے اور میرے لئے یہ بات ناقابل برداشت ہوگی۔ میں قیصر کو تمہاری آمد کی اطلاع بھیج دینا چاہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی اولین فرصت میں تمہیں بلا لیں گے۔“

”تمہیں کلاڈیوس میں تمہاری موجودگی میں قیصر اور اُس کے مشیروں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ میرا مذاق نہیں اڑائیں گے۔“

مرقس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہارے ذہن میں ہماری بھلائی کے لئے کوئی معقول تجویز ہے تو میں تمہیں اپنے ساتھ وہاں لے جانے کا ذمہ لیتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ جب تم کچھ کہنا چاہو گے تو وہ لوگ جو ہر قلب میں تمہاری جرات دیکھ چکے ہیں تمہارا مذاق اڑانے کی جرات نہیں کریں گے۔“

عاصم نے کہا۔ ”ابھی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے ذہن میں کوئی معقول تجویز ہے۔ بہر حال میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے ڈیکھنے کے بعد اُن کی توجہ کلاڈیوس سے ہٹ جائے گی۔ اور میرے دوست کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ میری کسی بات سے اُسے ندامت یا پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔“



شاہی ایران، سنیٹ کے ارکان اور حکومت کے دوسرے عمدہ داروں سے بھرا ہوا تھا۔ تماشائیوں میں طبقہ اعلیٰ کی وہ خواتین بھی تھیں، جن کے باپ، بھائی یا شوہر ہر قلبیہ سے بھاگتے وقت آوار کے ہاتھوں قتل یا قید ہو چکے تھے۔ قیصر اور اُس کی نوجوان ملکہ تخت پر رونق افروز تھے اور اُن کے چہروں سے تھکاوٹ، بددلی اور مایوسی مترشح تھی۔ کلاڈیوس تخت کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر سر جھکانے کھڑا تھا۔ سنیٹ کے بیشتر ارکان اپنی تقریروں میں اُس پر نہایت سنگین الزامات عائد کر چکے تھے۔ چند انصاف پسند ارکان نے پورے جوش و خروش کے ساتھ اُس کی حمایت بھی کی تھی، لیکن اکثریتی صحیح پیکار سے اُن کی تقریروں کا اثر ذائل ہو چکا تھا۔ اپنے باپ کی طرح سائمن بھی اُس کا پُروردہ والی

تھا لیکن اس محفل میں وہ بھی اپنی بے بسی کا اعتراف کر چکا تھا۔ جب مرقس کی باری آئی تو اُس کے غم و غصے کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی دکالت کرنے کی بجائے نکتہ چینی کرنے والوں پر برس پڑا اور اُس کی تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلاڈیوس کے مخالفین اور زیادہ مشتعل ہو گئے۔

سنیٹ کا ایک رکن جو قیصر کو قریحاً جنہ میں پناہ لینے کا مشورہ دینے والے عاقبت پسندوں کا سرغنہ تھا اٹھ کر چلایا۔ ”عالیجاہ! اگر کلاڈیوس کی بے احتیاطی یا حماقت کے نتائج اُس کی ذات، اُس کے خاندان یا اُس کے چند دوستوں تک محدود رہتے تو ہم درگزر کر سکتے تھے۔ لیکن یہ مسئلہ اب پوری قوم کا مسئلہ بن چکا ہے۔ اس ایوان میں ہماری وہ بہنیں موجود ہیں، جن کے آسوا بھی تک خشک نہیں ہوئے۔ اور ایران سے باہر آپ اُن ہزاروں انسانوں کی چھین سُن سکتے ہیں، جنہیں کلاڈیوس کی غلط اندیشی کی سزا مل چکی ہے۔ مرقس کو یقیناً اپنا بیٹا بہت عزیز ہے۔ لیکن کیا وہ لاکھوں انسان جنہیں دشمن غلام بنا کر دیا ہے ڈینوب کے پار لے گیا ہے، رومیوں کی اولاد نہ تھے۔“

کیا ہم پر یہ جرتناک تباہی صرف اس لئے نہیں آئی کہ ہماری فوج کا ایک بڑا آرڈی انا بیوقوف تھا کہ اُس نے خاقان کی باتوں میں آکر پوری قوم کے مستقبل کے متعلق اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں؟ عالیجاہ آپ کا منصب یہی تھا کہ آپ اپنی رعایا کی خاطر بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہو جاتے۔ لیکن وہ لوگ یقیناً ناقابل معافی ہیں، جنہوں نے دشمن کے عزائم کے متعلق پورا اطمینان حاصل کئے بغیر آپ کو ایک انتہائی غیر محفوظ جگہ پر ملاقات کی دعوت دی تھی۔ عالیجاہ! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اگر ایک اجنبی بروقت شور نہ مچاتا تو آپ کی زندگی بھی خطرے میں تھی لیکن عالیجاہ! یہ ایک مذاق نہیں کہ ایک اجنبی کو دشمن کے عزائم کا پتہ چل جاتا ہے اور اس ملاقات کا انتظام کرنے والے آخری دم تک بے خبر رہتے ہیں؟ بہر حال نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”کلاڈیوس پر یہ الزام کئی بار دہرائے جا چکے ہیں“ مقررہ میٹھی گیا اور بہر حال نے کلاڈیوس کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ ”تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟“

کلاڈیوس نے جواب دیا۔ ”عالیجاہ! مجھے مجرم ثابت کرنے کے لئے ان معززین کو لمبی چوڑی تقریریں کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ مجھ سے جو کوتاہیاں ہوئی ہیں، اُن کے نتائج میرے سامنے ہیں۔ اور مجھے اس

بات کا احترام ہے کہ میں اس ذمہ داری کے اہل نہ تھا۔ میں یہاں اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے نہیں آیا، بلکہ اپنی سزا کا حکم سننے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔“

ایوان میں سنانا چھایا اور کلاڈیوس کے مخالفین فاتحانہ مسکراہٹوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

قیصر نے قدرے توقف کے بعد کہا ”لیکن تم اتنا تو کہہ سکتے ہو کہ تمہاری غلطیوں میں وہ نام لوگ حصّہ دار ہیں، جنہوں نے خاقان کے ساتھ ہماری ملاقات کی تائید کی تھی۔“

”عالیجاہ! میں اس بات کا فیصلہ اُن کے ضمیر پر چھوڑتا ہوں۔“

”تم یہ بھی کہنا نہیں چاہتے کہ تم ہماری اجازت سے خاقان کے پاس گئے تھے؟“

”لیکن عالیجاہ! آپ کی اجازت کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اگر میری کوتاہ نظری کے باعث سلطنت کو تباہی کا سامنا کرنا پڑے تو مجھ سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔“

”لیکن تم یہ جانتے ہو کہ خاقان کے ساتھ نیک توقعات وابستہ کرتے وقت تم سے زیادہ دانشمند لوگ بھی خود فریبی کا شکار ہو گئے تھے؟“

”عالیجاہ میں اُن میں سے کسی کو بھی مورد الزام نہیں ٹھہراتا۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اگر میں خاقان سے ملاقات کے بعد بڑی بڑی اُمیدیں لے کر واپس نہ آتا تو وہ خود فریبی میں مبتلا نہ ہوتے۔ مجھے ایک عیار دشمن نے اپنے چہرے کا نقاب بنالیا تھا اور میرے ہم وطن اس نقاب سے دھوکا کھا گئے تھے عالیجاہ! اگر اس مجلس میں میرے خلاف غم و غصّے کا اظہار نہ ہوتا تو مجھے میرے لئے دیانتداری کا تقاضا یہی تھا کہ میں ان خود اس حقیقت کا احترام کروں کہ میں آئندہ کسی ذمہ داری کا اہل نہیں ہوں۔ آج میں یہ کہنے کا ارادہ لے کر گھر سے نکلا تھا کہ اگر میرے لئے کوئی اور سزا نہیں تو کم از کم مجھے اپنے عہدے سے سبکدوش کر دیا جائے۔“

قیصر نے کہا ”تم اگر چاہو تو دنیا بھر کے گناہ اپنے سر لے سکتے ہو۔ لیکن سزا تجویز کرنا تمہارے اختیار میں نہیں۔“

قلند نے قیصر کے کان میں کچھ کہا۔ ”اور اس نے کلاڈیوس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ اُس عرب کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا۔“

”عالیجاہ! وہ زندہ ہے اور اس وقت باہر کھڑا ہے؟“

قیصر نے برہم ہو کر کہا ”ہاں یہ توقع تھی کہ تم اُسے تلاش کرتے ہی ہمارے سامنے پیش کرو گے۔“

”عالیجاہ! امرا خیال تھا، موجودہ حالات میں ایک اجنبی کا یہاں پیش کیا جانا مناسب نہیں ہوگا۔“

”میں نے پہریداروں کو یہ ہدایت کی تھی کہ جب سینیٹ کی کارروائی ختم ہو تو اُسے آپ کی خدمت پیش کر دیا جائے۔“

”تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ سینیٹ کے ارکان ایک ایسے آدمی کا شکریہ ادا کرنے میں نخل سے کام لے گئے جس نے اپنی جان پر کھیل کر ہمیں خبردار کرنے کی کوشش کی تھی۔“

کلاڈیوس نے کہا ”وہ میرے ساتھ آنے پر مصر تھا۔ لیکن مجھے یہ بات گوارا نہ تھی کہ یہ معزز لوگ کے سامنے میں ایک مجرم کی حیثیت سے پیش ہوا ہوں، اُسے میری ڈھال سمجھ لیں۔ وہ میرا دوست ہے اور مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اس اجلاس کی کارروائی کے دوران خاموش نہیں رہ سکے گا۔“

”اُسے لے آؤ!“

کلاڈیوس نے جھک کر سلام کیا اور ایوان سے باہر نکل گیا۔ اور اُس کے مخالفین جو قیصر کے بیٹے سے کافی پریشان ہو چکے تھے، اضطراب کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد عام کلاڈیوس کے ساتھ نمودار ہوا۔ اُس نے کچھ فاصلے سے جھک کر قیصر کو سلام کیا اور پھر کلاڈیوس کا شاہہ پارک آگے بڑھا اور مسند کے قریب موڈب کھڑا ہو گیا۔

قیصر اور ملکہ کچھ دیر اُس کی طرف گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ بالآخر قیصر نے کہا۔ ”نوجوان اگر قیصر کو قتل کیے ہونے سے بچانے والوں کے لئے کوئی انعام ہو سکتا ہے تو تم اپنے آپ کو بڑے سے بڑے انعام تکمیل ثابت کر چکے ہو۔ ہمیں تمہارا انتظار تھا۔“

عام نے کہا ”یہ معنی ایک اتفاق تھا کہ میں دماغ موجود تھا اور مجھے کچھ دیر قبل اس سازش

کا پتہ چل گیا۔ میں نے آپ کی سلطنت میں پناہ لی تھی اور احسانندی کا تقاضا ہے تھا کہ میں آپ کو آنے والے خطرے سے باخبر کر دوں۔ اس کے لیے کوئی انعام مانگنا میں اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتا ہوں۔

”لیکن تم نے اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی اور اس بات کا خاصا امکان تھا کہ سینچیں سپاہیں سے بچ نکلنے کے بعد نہیں ہمارے حکم سے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔“

عاصم نے جواب دیا۔ ”مجھے یقین تھا کہ میں کلاڈیوس کی موجودگی میں کسی خطرے کا سامنا نہ کرنا پڑے گا اور اس کا سامنا نہ کرنا ہی میرا مقصد ہے۔“

”یہاں آنے سے پہلے تم ایرانی فوج کے ساتھ تھے؟“

”جی ہاں۔“

”تم نے شام اور مصر کی فتوحات میں حصہ لیا تھا؟“

”جی ہاں، میں شام اور مصر کی جنگوں میں عرب دستوں کا سالار تھا۔“

”کیا یہ درست تھا کہ جب کلاڈیوس بابلون میں زخمی تھا تو تم نے اس کی جان بچائی تھی؟“

”جی ہاں۔“ عاصم یہ کہہ کر کلاڈیوس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اس کے بعد تم حبشہ کی طرف پیش قدمی کرنے والی فوج کے ساتھ تھے؟“

”جی ہاں۔“

”اچھا یہ بتاؤ، ایرانیوں کا ساتھ چھوڑ کر قسطنطنیہ کا رخ کرتے وقت تمہیں اس بات کا احساس نہیں تھا کہ رومی، ایرانیوں اور ان کے حلیفوں کو اپنا بدترین دشمن خیال کرتے ہیں۔ اور اگر کسی کو تمہارے متعلق پتہ چل گیا تو لوگ تمہاری بوٹیاں نوچنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔“

”جی ہاں! مجھے معلوم تھا لیکن بعض حالات میں اپنا راستہ تبدیل کرتے وقت انسان یہ نہیں سوچتا، کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ جب میں نے کلاڈیوس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا تو میں زندگی کی بجائے موت سے زیادہ قریب تھا۔“

”لیکن کلاڈیوس کو اس بات کا اعتراف ہے کہ اُسے تمہارے متعلق سب باتیں معلوم تھیں اور اس کے

درد وہ تمہیں اپنی پناہ میں لینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ کیا یہ ایک جرم نہیں تھا کہ کلاڈیوس نے جس تمہارے غمی خردار کے بغیر تمہیں اپنی پناہ میں لے لیا تھا؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ کلاڈیوس نے مجھ پر اعتماد کرنے میں غلطی نہیں کی تھی۔ یہ یقین تھا کہ میں اسے دھوکا نہیں دوں گا۔“

قیصر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”ہم پر جو نئی تباہی آئی ہے اُس کی تمام ترمذہ داری کلاڈیوس کے سر ڈالی جا رہی ہے۔ اگر ہم کلاڈیوس کے لئے کوئی بدترین سزا تجویز کریں تو تم کیا خیال کرو گے؟“

”میں کلاڈیوس سے یہ وعدہ کر چکا ہوں کہ میں اُس کی حمایت میں زبان کھولنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ ہم اگر آپ اُسے سزا دینے کے متعلق سوچ رہے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ روم کا مستقبل میرے اندازوں سے کہیں زیادہ تاریک ہے۔“

”تم کلاڈیوس کو بے گناہ سمجھتے ہو؟“

”عالمیجاہ! میں کلاڈیوس کو بے گناہ ثابت کرنے نہیں آیا۔ میں یہ جانتا ہوں، اگر آپ کے مشیر اُسے سزا دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو انہیں میرے احساسات کی پروا نہیں ہوگی۔ لیکن اگر یہ حضرات ایک نیا اور شریف آدمی پر غصہ نکلانے کی بجائے روم کے مستقبل کی فکر کریں۔ اور ہر قلیبہ کے میدان کی طرح یہاں بھی میرا مذاق نہ اڑایا جائے تو میں ایک تجویز پیش کر سکتا ہوں۔“

عاصم نے جواب دیا۔ ”تمہارے قدموں کے گرد بے تاب سا ہو کر کہا کہ تمہارے غموش کیوں ہو گئے۔“

عاصم نے کہا۔ ”روم کو امن کی ضرورت ہے۔ اور خاندان سے مایوس ہو جانے کے بعد اب آپ کے لئے ایرانیوں کی طرف دیکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“

قیصر نے آزدہ ہو کر کہا۔ ”ہم برسوں سے ایرانیوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ لیکن وہ صلح اور امن کے الفاظ تک سننے کے لئے تیار نہیں۔ دو سال قبل ہم نے صلح کی شرائط معلوم کرنے کے لئے، ایرانیوں پر سالار کے پاس تین آدمی بھیجے لیکن انہیں باسفورس کے پار پہنچانے والی کشتی کا صرف ایک ملاح

ایرانوں کے تیروں سے بچ کر جہاں پہنچا تھا اور اس نے ہمیں یہ اطلاع دی تھی کہ ایرانیوں نے ہمارے ایجنٹوں کے ساتھ کوئی بات کرنے کی بجائے ان کے سر قلم کر دیئے تھے۔ اس سے قبل ہمارا ایک ایجنٹ سپہ سالار کے پاس پہنچے ہیں کامیاب ہو گیا تھا لیکن مصالحت کی گفتگو کے لئے ایرانی سپہ سالار کی پہلی شرط یہ تھی کہ ہم اُس کے لئے قسطنطنیہ کے دروازے کھول دیں۔“

عاصم نے کہا۔ ”میں آپ کو یہ اطمینان نہیں دلا سکتا کہ صلح کے لئے ایرانیوں کی نئی شرائط، آپ کے نزدیک کس حد تک قابل قبول ہوں گی، لیکن میں اُن کے سپہ سالار کے پاس جانے کے لئے تیار ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ایرانی سپاہی مجھے اپنے سپہ سالار کے سامنے پیش کرنے کی بجائے میرا سر قلم نہیں کر دیں گے۔ اگر سین ابھی تک ایرانی فوج کا سپہ سالار ہے تو وہ میری بات ضرور سنئے گا۔ کبھی وہ مجھے اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔“

قیصر نے کہا۔ ”سین کو کبھی ہم بھی اپنا دوست سمجھتے تھے اور جب ہم نے اُسے قید سے رہا کیا تھا تو ہمیں یہ اُمید تھی کہ وہ کسریٰ کو مصالحت پر آمادہ کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ لیکن یہ ایک خود فریبی تھی اب وہ روم کی دشمنی میں اپنے بادشاہ سے ایک قدم آگے ہے۔“

عاصم نے کہا یہ باتیں مجھے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ سین نے کسریٰ کو صلح پر آمادہ کرنے کی کتنی کوشش کی تھی لیکن اس وقت کسریٰ کو یہ یقین تھا کہ وہ شام اور مصر فتح کرنے کے بعد کسی مزاحمت کا سامنا کرنے بغیر قسطنطنیہ فتح کر لے گا، اس لئے سین کی پیش نہ گئی لیکن برسوں کی ناکام کوششوں کے بعد کسریٰ کے خیالات میں بھی تبدیلی آ سکتی ہے۔“

حاضرین اب پُر اُمید ہو کر عاصم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ قیصر نے کہا۔ ”اگر ایرانیوں کے لئے قسطنطنیہ کے دروازے کھول دینے کے علاوہ تمہارے ذہن میں مصالحت کی کوئی تجویز ہے تو ہم سننے کے لئے تیار ہیں۔“

”جناب ایران اور روم کی مصالحت کے لئے تجاویز سوچنا کسریٰ اور قیصر کا کام ہے۔ اگر آپ مصالحت گفتگو کے لئے تیار ہیں تو میں سین کی مدد سے کسریٰ کے دروازے پر دستک دینے کا ذمہ لیتا ہوں۔“

یہ کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ سین کس حد تک میری باتوں سے قائل ہوتا ہے اور اگر میں اُسے صلحت کی بات چیت پر آمادہ کر لوں تو وہ کہاں تک ایران کے حکمران پر اثر انداز ہو سکے گا۔ اگر سین نے مجھے کوئی حوصلہ افزا جواب دیا تو میں واپس آ کر آپ کو اطلاع دوں گا۔ اور اگر میں واپس نہ آ سکا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے اپنی ہم میں کامیابی نہیں ہوئی۔ پہلے مرحلہ میں میری کامیابی کا مطلب یہ ہوگا کہ میں آپ کے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے تیار ہے۔ سر دوست میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ سین کے ساتھ براہ راست یا بالواسطہ آپ کی گفت و شنید سے کیا نتیجہ نکلے گا لیکن میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ آپ کو خاقان کی طرح دھوکا نہیں دے گا۔“

قیصر نے کہا۔ ”تم یہ پسند کر دو گے کہ ہم براہ راست سین کے ساتھ ملاقات کریں۔“
 ”عالیجاہ اگر سین نے آپ کو ملاقات کی دعوت دی تو میں اسے ایک نیک شگون خیال کروں گا۔“
 ”تم سین کو قسطنطنیہ آنے پر آمادہ کر سکو گے؟“

”نہیں میں آپ کو یہ اُمید نہیں دلا سکتا، اور میری مایوسی کی وجہ یہ نہیں کہ سین مغزور یا خود پسند ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر سین یہاں آنا پسند کرے تو بھی ایرانی فوج کے ایک ادنیٰ سپاہی سے لے کر کسریٰ تک اُسے ملامت کریں گے۔ آپ کو یہ تلخ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ ایرانی فتوحات کے نشے سے سرشار ہیں اور اگر وہ جنگ کی طوالت سے تنگ آکر مصالحت پر آمادہ ہو گئے تو بھی وہ آپ کے ساتھ صرف فاتح کی حیثیت سے ہمکلام ہونا پسند کریں گے۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ صلح کے لئے کسریٰ کی شرائط انتہائی توہین آمیز ہوں گی۔ لیکن اگر آپ صلح اور امن کو اپنی موت و حیات کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ بازنطینی سلطنت تباہی کے آخری گناہے پہنچ چکی ہے اور آپ کے لئے مغزور اور بے رحم دشمن کے سامنے گر کر صلح کی جھبکھا مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور اگر آپ یہ نہیں چاہتے کہ کسی دن قسطنطنیہ میں بھی، انطاکیہ اور یرودشلم کی تباہی کی داستان دہرائی جائے تو آپ کو یہ تلخ گھونٹ پینا ہی پڑے گا۔“

عام حالات میں ایسی تقریر سن کر ایک ادنیٰ رومی بھی عاصم کی بوٹیاں نوچنے کے لئے تیار

ہوجاتا، لیکن سامعین کی بے بسی اور بے چارگی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس اجتماع میں اُس کی آمد کو تائید
غیبی سمجھ رہے تھے۔

قیصر کچھ دیر اضطراب کی حالت میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ "تہیں
یقین ہے کہ اگر سین ہمارے ساتھ ملاقات پر رضامند ہو گیا تو ہمیں اُس کے پاس جانے میں، کوئی
خطرہ نہیں ہوگا؟"

"عاجباً! میں سین کے خیالات معلوم کئے بغیر آپ کو کوئی اطمینان نہیں دلا سکتا۔"

قیصر نے کلاڈیوس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ کلاڈیوس ہمیں یقین ہے کہ تمہارے متعلق اگر کسی کو غلط
فہمی تو وہ دُور ہو چکی ہے۔ اور ہماری سنیٹ کے جن ارکان نے تمہارے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا ہے
وہ اب تمہاری جرات اور وفاداری کا احترام کرنے میں مجل سے کام نہیں لیں گے لیکن ہمیں یہ بات
پسند نہیں آئی کہ تم نے ہمارے حصے کا بوجھ بھی اپنے سر اٹھالیا تھا۔ تم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ ہم اپنی رعایا
کو تباہی سے بچانے کے لئے ہر خطرہ مول لینے کے لئے تیار تھے اور اگر خاقان ہر قلبہ آئے پر آمادہ نہ ہوتا
تو ہم اُس کے کیمپ میں جانے کے لئے بھی آمادہ ہوجاتے۔ بہر حال ہم تمہارے شکر گزار ہیں اور ہمیں
امید ہے کہ آئندہ تمہیں بڑی سے بڑی ذمہ داری کا اہل سمجھا جائے گا۔"

سامعین کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں اور کلاڈیوس تشکر کے آنسوؤں سے قیصر کی طرف دیکھ رہا تھا
ہرقل عاصم کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم نے ایک مرتبہ ہماری جان بچائی ہے اور ہم تمہاری نیک نیتی پر تشبہ نہیں
کر سکتے۔ تاہم کسی فیصلہ پر پہنچنے کے لئے ہمیں مزید صلاح و مشورہ کی ضرورت ہے۔ ہم دو یا تین دن کے
اندرازدہ نہیں کوئی تسلی بخش جواب دے سکیں گے۔ لیکن آج سے تم کلاڈیوس کی بجائے ہمارے جہان ہوا
— اب یہ مجلس برخواست ہوتی ہے۔"

باب ۳۲

دس روز بعد رات کے وقت ایک کشتی آنا سے فاسفورس سے نکل کر بحیرہ مارمورا کے ساحل کے ساتھ
مشرق کا رخ کر رہی تھی۔ عاصم کلاڈیوس اور ویلیس کے علاوہ چار ملاح اس کشتی پر سوار تھے۔ آسمان پر بادل
نے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ویلیس کشتی کا پتوار سنبھالنے آئیں پھاڑ پھاڑ کر کنارے کے
روٹے چھوٹے ٹیلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کلاڈیوس اور عاصم کشتی کے دوسرے سرے پر بیٹھے آپس میں
بہن کر رہے تھے۔

عاصم نے کہا۔ "کلاڈیوس اب بارش زیادہ تیز ہو رہی ہے، اگر تم لوگ اتنی دور آنے کی بجائے اسٹوڈس
سے نکلتے ہی مجھے کسی جگہ اتار دیتے تو مجھے میرے لیے کوئی فرق نہ پڑتا۔"

کلاڈیوس نے جواب دیا۔ "میں عاصم ہمیں بہر ممکن اطمینان کرنی چاہیے۔ ویلیس کا یہ خیال صحیح ہو کہ قلعہ
کے پاس ایرانی سپاہی زیادہ پوکس ہوں گے۔ وہ اس طرف سے بھی غافل نہیں ہوں گے۔ تاہم یہ علاقہ نسبتاً
زیادہ محفوظ ہوگا۔"

عاصم خاموش ہو گیا۔ اور کلاڈیوس نے کچھ دیر بعد اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "عاصم! اگر
میرے بس میں ہوتا تو میں اب بھی تمہیں کشتی سے اتارنے کی بجائے اپنے ساتھ واپس لے جانا زیادہ پسند کرتا۔
میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کیا ہم دوبارہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے؟"

عاصم نے جواب دیا۔ "اگر سین ابھی تک ایرانی لشکر کا سپہ سالار ہے تو مجھے یقین ہے کہ دو دن بعد تم مجھے
اپنا منظر باؤ گے، سمندر کے کنارے آگ کی روشنی اس بات کا ثبوت ہوگی کہ میں زندہ ہوں۔"

کشتی کے دوسرے سر کے ڈبیرس کی آواز سنائی دی، ”میرے خیال میں اب ہمیں اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں کنارے کا رخ کر رہا ہوں اس لیے آپ خاموش ہو جائیں۔“

اس کے بعد کشتی کی رفتار بندرج کم ہونے لگی اور وہ دم بخود ہو کر کنارے کی سیاہ چٹانوں کے ساتھ لگی لگی لہروں کے پھیڑوں کا شور سننے لگے، پھر کشتی کسی بھاری پتھر کے ساتھ رگڑ کھانے کے بعد رگڑ گئی اور ایک ملاح نے جلدی سے گھٹنے گھٹنے پانی میں کودتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”یہاں پانی بہت کم ہے۔ اور کشتی کو آگے لے جانا ممکن نہیں۔“

عاصم نے اپنے موزے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیے اور پھر اپنی قبائلی بھانجی کو پانچ قدم پیچھے دھکیلنے کے بعد اس پر سوار ہو گیا اور عاصم کسی توقف کے بغیر کنارے کی طرف بڑھا۔ تھوڑی دیر وہ کنارے کے ایک ٹیلے پر کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اور کشتی جسے وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا رات کی تاریکی میں غائب ہو چکی تھی۔ بارش بندرج زیادہ ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے موزے پہنے اور ایک طرف چل دیا۔ مہیب تاریکی میں اُسے ہر سمت کیسا محفوظ اور یکساں غیر محفوظ معلوم ہوتی تھی۔ کچھ ادھر ادھر بٹھکنے کے بعد وہ ایک جگہ رک کر فارسی زبان میں آوازیں دینے لگا۔ ”کوئی ہے؟ کوئی ہے؟“ میں ایرانیوں کا دوست ہوں۔ میں سپہ سالار کے پاس جانا چاہتا ہوں، میری مدد کرو۔ مجھے سپہ سالار کی قیام گاہ کا راستہ دکھا دو۔ کوئی ہے؟“

لیکن اس کی آوازیں رات کی ہولناک تاریکیوں میں گم ہو کر رہ گئیں۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پوری قوت سے آوازیں دیتا رہا۔ اور بالآخر نڈھال سا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اپنا تک اس نے محسوس کیا کہ چند ساتھی اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ پھر اسے کوئی ایسی آہٹ محسوس ہونے لگی جو بارش کے دھبے دھبے شور اور اس کے دل کی دھڑکنوں سے مختلف تھی چند ثانیے بعد اسے اپنی آنکھوں اور کانوں پر کوئی شہتہ نہ رہا۔ وہ چلا یا۔ ”میں راستہ بھول چکا ہوں۔ میری مدد کرو۔ مجھے سپہ سالار کے پاس لے چلو۔“

ساتھ تازگی کی آغوش سے نکل کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اور عاصم بدستور چلا رہا تھا۔ اگر تم ایران کے سپاہی ہو تو میں تمہارا ساتھی ہوں۔ سپہ سالار مجھے جانتا ہے۔“

کسی نے سوال کیا۔ تم اس وقت کہاں سے آئے ہو؟

عاصم نے جواب دیا۔ ”سپہ سالار کو معلوم ہے کہ میں کہاں سے آیا ہوں مجھے ان کے سوا کسی اور سے بات کرنے کی اجازت نہیں۔“

وہ کچھ دیر آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے پھر کسی نے سوال کیا۔

”تم ایسے ہو؟“

”ہاں۔“

”نہیں معلوم ہے کہ ہم رومی جاسوسوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟“

”رومی جاسوس رات کے وقت یہاں پہنچ کر ایرانی سپہ سالاروں کو مدد کے لیے نہیں بلاتے۔ تم میں سے کسی نے عاصم کا نام سنا ہے؟“

ایک طرف سے آواز آئی۔ ”میں ایک عاصم کو جانتا ہوں۔ وہ شام اور مصر کی جنگوں میں ہمارے ساتھ تھا۔ وہ جہتہ کے راستے میں زخمی ہونے کے بعد فوج سے بچ گیا تھا۔ اور سپہ سالار نے اس کا پتا لگانے والوں کے لیے انعام مقرر کیا تھا۔ لیکن ہمیں یقین ہے وہ مر چکا ہے۔“

عاصم نے کہا۔ ”وہ زندہ ہے اور تم مجھے سپہ سالار کے پاس پہنچا کر انعام حاصل کر سکتے ہو۔ میں عاصم ہوں۔“

سپاہی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”اگر آپ عاصم ہیں تو ہم آپ کو اتنی دیر بارش میں روکنے کے لیے معافی چاہتے ہیں۔ لیکن اس وقت آپ کو سپہ سالار کے پاس لے جانا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ وہ ان دنوں قلعے میں آرام فرما رہے ہیں۔ ہم علی الصبح انہیں اطلاع بھیج دیں گے۔ اور پھر اگر ان کا حکم آیا تو آپ کو ان کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ ہر دست ہم آپ کو مستقر میں لے جائیں گے۔ اور وہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

عاصم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”میں میں سیدھا ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ اگر وہ آرام کر رہے ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ مجھے وہاں پہنچنے ہی ان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے لیکن یہ اشد ضروری ہے کہ جب تک میں ان کے سامنے پیش نہیں ہوتا تمہارے ان ساتھیوں کے علاوہ دوسرے لوگ میری آمد سے بے خبر رہیں۔ اگر تم سپہ سالار کا خطاب مول لینا چاہتے ہو تو مجھے جہاں چاہو لے جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ بحث کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ لیکن تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم مستقر میں میری آمد کا دھندلرا پٹنے کی بجائے

مجھے کسی تاخیر کے بغیر ان کے پاس پہنچا دو۔“

یہ میاںوں کے افسرانے کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”اگر یہ عاصم میں تو ہم ان کی بلاضغی کا خطرہ مول نہیں لے سکتے اور اگر یہ کوئی اور ہیں تو بھی سپہ سالاران کے متعلق بہتر فیصلہ کر سکیں گے۔“



فسطیہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کا لڑھا غلام فیروز آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اسے بازو سے پکڑ کر جگانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”فسطیہ! فسطیہ! اٹھو بیٹی۔ اب صبح ہو رہی ہے۔“ فسطیہ نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور برہم ہو کر کہا۔ ”بچا فیروز! تمہیں معلوم ہے کہ رات اباجان کی طبیعت خراب تھی۔ اور میں بہت دیر سے سوئی تھی۔“

فیروز نے اپنے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے بیٹی۔ لیکن آج تمہیں دیر نہیں اٹھنا چاہیے۔“

”کیوں، آج کیا بات ہے؟ اس نے تلخ سرکسو ال کیا؟“

”آج ایک خاص بات ہے بیٹی۔ تم ذرا باہر نکل کر نو دیکھو۔“

”کیوں باہر برف گر رہی ہے؟“

”نہیں بیٹی اب تو آسمان صاف ہو رہا ہے اور سورج نکلنے والا ہے۔“

فسطیہ نے اپنا چہرہ لحاف کے اندر چھپاتے ہوئے کروٹ بدلی اور کہا۔ ”اچھا میں ابھی اٹھتی ہوں۔“

”فیروز نے کہا۔ ”فسطیہ آج میں تمہیں ایک عجیب خواب سنانے آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رات کے

وقت چند سپاہی عاصم کو پکڑ کر اس قلعے میں لاتے ہیں۔ میں اسے مشعل کی روشنی میں دیکھ کر پہچان لیتا ہوں اور

اسے پسا ہوں سے چھڑا کر گمان خانے میں لے آتا ہوں۔ وہ مجھے بتاتا ہے کہ میں زندہ ہوں اور ایک خاص وجہ سے

کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ پھر وہ تمہارے متعلق کئی سوال کرتا ہے اور میں اسے بتاتا ہوں کہ فسطیہ کو تمہارے زندہ

ہونے کا یقین تھا۔ اور تمہارے متعلق اس کے خواب درست ثابت ہوئے ہیں۔ اس کے بعد میں نے تمہیں

مناع دینے کے لیے روکنے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا۔ ”نہیں اس وقت فسطیہ کو بے آرام کرنا مناسب نہیں ہے۔ پھر میرے ساتھ باتیں کتنے کرتے اچانک ہو گیا۔ تو میں دبے پاؤں کمرے سے نکل کر یہاں پہنچا لیکن تم گہری نیند سو رہی تیں اور میں نہیں جگانے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کے بعد میں نے اپنے کمرے میں جا کر سونے کی کوشش کی۔ لیکن بچہ نیند آئی۔“

فسطیہ نے اچانک اپنے چہرے سے لحاف الٹ کر اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”پھر کیا ہوا بچا فیروز؟“ اس نے تلخی ہو کر پوچھا۔

”بیٹی جب صبح ہونے لگی تو میں ادھر ادھر گھومنے کے بعد دوبارہ ڈرتے ڈرتے تمہارے کمرے میں داخل ہوا۔“

فسطیہ کچھ دیر پختہ رہی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اچانک وہ التجائیں اور فریادیں جنہیں

وہ بان پر نہیں لاسکتی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بہ کر چھلکنے لگیں۔

فیروز نے کہا۔ ”بیٹی میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ آج تم نے عاصم کے متعلق کوئی سپینہ نہیں دیکھا؟“

اس نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”نہیں میرے ساتھ مذاق نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس کے ساتھ ہی

منوٹوں کے موتی اس کی خوبصورت آنکھوں سے ٹپک پڑے۔“

فیروز نے کہا۔ ”میں مذاق نہیں کرتا بیٹی۔ میرے ساتھ آؤ۔“

فسطیہ کچھ دیر سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اچانک بھولوں کی کھائیں، اور

ستاروں کی ساری تابانیاں اس کے چہرے پر بکھر گئیں۔

لڑھے غلام نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے

دیکھنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ فیروز مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد فسطیہ کمرے سے غوردار ہوئی تو جذبات کی شدت سے اس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ وہ صحن میں

فیروز کے قریب رکی اور اس نے کچھ کے بغیر ہاتھ اٹھا کر ایک طرف اشارہ کر دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دروازے

کے قریب پہنچی، رُکی اور پھر جھکتی ہوئی اندر چلی گئی۔

عاصم سو رہا تھا، اور اس کے چہرے پر باطنی کے آرام و مصائب کی وہ داستانیں نقش تھیں جنہیں صرف

فسطینہ کمرے سے نکل کر بھاگی تو اسے اسی بات کا احساس نہ تھا کہ صحن میں سپاہی اسے دیکھ رہے ہیں۔
سین ابھی تک اپنے لیٹر پر لیٹا ہوا تھا اور یوسبیا اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

”اباجان! امی جان!“ فسطینہ نے ہانپتے ہوئے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ وہ آگیا ہے؟“
سین نے پوچھا۔ ”کون آگیا ہے؟ تم اس قدر بدحواس کیوں ہو؟“

”اباجان عاصم آگیا ہے۔“

”عاصم! کہاں ہے وہ؟“

”اباجان وہ مہمان خانے میں ہے۔“

”تم نے اُسے دیکھا ہے؟“

”ہاں اباجان۔“

”لیکن وہ میرے پاس کیوں نہیں آیا؟“ سین نے جلدی سے اٹھ کر اپنا ہوتا پلٹتے ہوئے کہا۔

”اباجان آپ سو رہے تھے۔“

یوسبیا نے پوچھا۔ ”سچ کو بیٹی تم نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا؟“

”نہیں امی جان۔“ فسطینہ اس کے ساتھ لپٹ کر ایک بچے کی طرح سسکیاں لینے لگی۔

”میں ابھی تپہ کرتا ہوں۔“ سین یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

یوسبیا نے کہا۔ ”بیٹی اگر وہ سچ آگیا ہے تو تمہیں مجھ سے زیادہ خوشی نہیں ہو سکتی۔ لیکن وہ اتنی بڑا کہاں تھا؟“

”مجھے معلوم نہیں۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ وہ آگیا ہے۔ خدا نے میری دعائیں سن لی ہیں۔ امی جان اب

اُس کو یہ شکایت نہیں رہے گی کہ میں عیسائیت کی دشمن بن چکی ہوں۔“

یوسبیا کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلک رہے تھے۔ ”میری بیٹی! میری فسطینہ! مجھے عاصم کی آمد

سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ خدا نے تمہیں گمراہی سے بچایا۔“

”میں جانتی ہوں چچا، لیکن تم وعدہ کرو کہ انہیں بھاگنے نہیں دو گے۔“

فیروز مسکرایا۔ ”ابھی ان کے بھاگ جانے کا کوئی اندیشہ نہیں بیٹی، وہ سپاہی جو انہیں رات کے وقت

یہاں لائے تھے تمہارے اباجان سے انعام حاصل کرنے کے لیے طلوع کے دروازے کے سامنے بیٹھے ہوئے

پہلے وہ نہیں فرار ہونے کا موقع نہیں دیں گے۔“

ایک گورت کی آنکھ دیکھ سکتی تھی۔ کینٹینوں کے قریب اس کے جذبات سفید ہو چکے تھے۔

فسطینہ نے آگے بڑھ کر اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک حرف گاہوا لجات اٹھایا اور اس کے سینے پر ڈاڑھ دیا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے وہ دینک بے حس حرکت کھڑی رہی، بالآخر عاصم نے آنکھیں کھولیں۔ اور اچانک اٹھ کر ٹیٹھ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ نوزیر لوکی نہ تھی جسے اس نے پہلی بار یروشلم کے قریب ایک سرائے میں دیکھا تھا۔ اور آخری بار دمشق میں اوداع کہا تھا، بلکہ ایک گورت تھی جس نے زندگی کی تمام رعنائیوں کو اپنے وجود میں سمیٹ لیا تھا۔ عاصم کا دل دھڑک رہا تھا اور اس کی نگاہیں جھکی جا رہی تھیں۔ اور حسین الفاظ کے وہ خزانے جو اس نے جدائی کے صبر آرنایام میں جمع کیے تھے، لٹ چکے تھے۔

اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ ”فسطینہ میں آیا ہوں۔ میں بہت دور چلا گیا تھا۔ لیکن مجھے اپنے راستے کے ہر ویلے میں تمہاری آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ فسطینہ میری طرف اس طرح نہ دیکھو۔ مجھے اپنی کم مائیگی اور بے بسی کا احساس تم سے دوئے گیا تھا اور اب میں پہلے سے کہیں زیادہ تپتی دست اور بے بس ہوں۔“

فسطینہ اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ”میں صرف یہ سننا چاہتی ہوں کہ یہ ایک خواب نہیں ہے۔ جب تم یہاں نہیں تھے تو میں ساری رات آنکھوں میں کاناکرتی تھی اور آج تم یہاں تھے تو میں سو رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ۔“ لیکن تم کہاں تھے۔ میں تصور میں تم سے ہزار مرتبہ روٹھ چکی ہوں۔ لاکھوں گلے کپکپی ہوں لیکن پھر

رے گلے دور ہو چکے تھے۔“

نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ”بیٹی اب تم اپنے اباجان کو

اطلاع دو۔“

تھوڑی بعد قسطنطنیہ اور یوسپیا دروازے میں کھڑی باہر جھانک رہی تھیں۔ سین عاصم کے ساتھ بائیں کرتا، وہ صحن میں نمودار ہوا اور یوسپیا نے آگے بڑھ کر ایک ماں کی دعاؤں کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔ پھر یہ چاند ایک کشادہ کمرے میں بیٹھ گئے۔ اور سین نے عاصم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اب تم اطمینان سے مجھے اپنی سرگزشت سناؤ۔ ہماری آخری اطلاع یہ تھی کہ جب تم طیبہ سے روانہ ہوئے تھے تو قبلی ملاحوں کے علاوہ ایک رومی غلام بھی تمہارے ساتھ تھا۔ پھر چند دن بعد غالباً یہی کشتی جس پر تم طیبہ سے سوار ہوئے تھے وہ بابلیوں کے آس پاس دیکھی گئی تھی۔ لیکن وہ بابلیوں میں نہیں ٹھہری اور ہمیں یہ اندیشہ تھا کہ تم نے قبلی ملاحوں اور رومی غلام کی وفاداری پر بھروسہ کرنے میں غلطی کی ہے اور یہ لوگ تمہیں دریایا سمندریں بھینک کر روپوش ہو گئے ہیں اور اگر انہوں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا تو تم نیل کے دہانے اور شام کے ساحل کے درمیان کسی جگہ بحری حادثے کے شکار ہو چکے ہو۔ چونکہ ان ایام میں کوئی قابل ذکر طوفان بھی نہیں آیا تھا۔ اس لیے ہمارا یہ خیال بھی تھا کہ رومیوں کے کسی جھگی جہاز سے مقصود ہونے کے بعد تمہاری کشتی غرق ہو چکی ہے۔ اب تم یہ ممتا حل کر سکتے ہو کہ تم اتنی مدت تک کہاں تھے۔“

عاصم نے جواب دیا۔ ”ہاں، بیمار تھا اور طیبہ سے روانہ ہونے کے بعد میں نے کئی دن بے ہوشی کی حالت میں گزارے۔ پھر جب ہوش میں آنے کے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ میرے ساتھی مجھے شام کے ساحل کی بجائے قسطنطنیہ کی طرف لے جا رہے ہیں تو میں کوئی مزاحمت نہ کر سکا۔“

سین نے پوچھا۔ ”تو اب تم اتنی مدت کے بعد قسطنطنیہ کے کسی قید خانے سے فرار ہو کر یہاں پہنچے ہو؟“

عاصم نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”جی نہیں، وہاں مجھے ایک نیک دل رومی کے ہاں پناہ مل گئی تھی۔“

”اور وہ نیک دل رومی کون تھا۔“

”جناب یہ وہی غلام تھا جسے میں صحرائے نوب سے اپنے ساتھ لایا تھا۔“

”سین نے کہا۔“ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر وہ رومی اتنا شریف تھا تو تمہیں دھوکا دے کر قسطنطنیہ

کیوں لے گیا؟“

”میں بیمار تھا اور اس کے خیال میں میری جان بچانے کی بہترین صورت یہ تھی۔“

”لیکن جب تمہیں ہوش آیا تو تم نے کشتی کا رخ بدلنے کا مطالبہ نہیں کیا؟“

”جی نہیں، میں ایسا عسوس کرتا تھا کہ میں بہت دور آچکا ہوں اور مجھے مڑ کر چھپنے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔“

”اور اب تم یہاں کس طرح پہنچے ہو؟“

”جناب اس کے لیے بھی اس رومی کا ممنون ہوں۔ اس نے رات کے وقت میرے لیے کشتی کا انتظام کر دیا تھا۔“

”سین نے عاصم کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔“ بیٹا! تمہاری صورت بتا رہی ہے کہ تم مجھ سے کوئی بات

چھپا رہے ہو۔“

”عاصم نے کہا۔“ مجھے اندیشہ ہے کہ میری کئی باتیں آپ کو ناقابل یقین محسوس ہوں گی۔“

”سین نے کہا۔“ عاصم تم میرے لیے اجنبی نہیں ہو۔ اور تمہیں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ میں

تمہاری کسی بات پر شبہ کر سکتا ہوں۔“

”عاصم نے کہا۔“ اگر میں یہ کہوں کہ میں چند دن قیصر کا مہمان رہ چکا ہوں۔ اور جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو وہ

ذات خود بند گاہ پر مجھے اوداع کرنے آیا تھا اور اس نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ رومی ہر قیامت پر ایرانیوں سے صلح کرنا چاہتے

ہیں۔ پھر میں نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں سپہ سالار کے پاس آپ کی درخواست لے جاؤں گا تو آپ یقین کر لیں گے۔“

سین کچھ دیر انتہائی اضطراب کی حالت میں عاصم کی طرف دیکھتا رہا، بالآخر اس نے کہا۔ ”مجھے یہ بات بھی

بیدار قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ ہر قیامت ایک مدت سے کسری کے قدموں پر گرنے کے لیے بے قرار ہے۔ لیکن ہمیں تم

سے یہ توقع نہ تھی کہ تم رومیوں کے ایلچی بن کر ہمارے پاس آؤ گے۔“

عاصم نے کہا۔ ”لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ ہاتھ باندھ کر صلح اور امن کی درخواست کرنے والے دشمن پر

دار کرنا پسند نہیں کریں گے۔“

سین نے جواب دیا۔ ”روم کے ساتھ جنگ یا صلح میری پسند یا ناپسند کا مسئلہ نہیں۔ میں کسری کا نوکر ہوں،

”میرے لیے ان کا پلا اور آخری حکم یہی ہے کہ میں قسطنطنیہ پر ایران کا جھنڈا نصب کرنے سے پہلے رومیوں کے ساتھ

کوئی بات نہ کروں گا۔“

”لیکن آپ جانتے ہیں کہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا آسان نہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ سین نے جواب دیا۔ ”لیکن کسریٰ کے حکم سے انحراف کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔“

”کہیں خود پابہ زنجیر اس کے سامنے پیش ہو جاؤں۔“

”لیکن اگر آپ کو پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو پھر کیا ہوگا۔ میں یہ سوال ایران کے ایک“

ادوالعزم سپہ سالار کا حوصلہ نسبت کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے پوچھتا ہوں کہ آپ قسطنطنیہ کے دفاعی انتظامات

دیکھ چکے ہیں۔“

”سین نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ ”اگر مجھے اس مرتبہ بھی ناکامی ہوئی تو میری سپہ سالاری کا عہد ختم ہو جائے“

گا۔ اور مجھے کسرے کے سامنے اس عہد کے تمام نقصانات کی ذمہ داری اپنے سر لیتا پڑے گی۔ شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ

ایک شکست خوردہ سپہ سالار کا انجام کتنا عورتاک ہوتا ہے۔“

عاصم نے کہا۔ ”اگر آپ کی جنگ کا مقصد صرف کسرے کے انام کی تسکین ہے تو میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتا۔“

اب آپ کے لیے میری سزا کا فیصلہ کرنا باقی ہے۔“

سین نے جواب دیا۔ ”اگر تم نے یہ باتیں اور کسی سے نہیں کہیں تو تمہیں پریشانی ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”میں نے یہ باتیں کسی اور سے نہیں کہیں۔ لیکن میں ایرانی فوج کا ساتھ چھوڑ کر رومیوں کی پناہ میں چلا گیا تھا اور

یہ جرم ایسا نہیں جسے آپ نظر انداز کر سکیں۔“

”ایک رضا کار کی حیثیت میں تم ان پابندیوں سے مستثنیٰ تھے جو ایرانی سپاہیوں پر عائد ہوتی ہیں۔ سزا قبائل“

کے بیشتر رضا کاروں کو اپس جلا چکے ہیں اور ہم نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ بلکہ انہیں انعامات دے کر نصرت کیا

ہے تمہارے متعلق عام ایرانی شاید یہ سننا پسند نہ کریں کہ تم قسطنطنیہ چلے گئے تھے اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ تم ان سے اس

بات کا ذکر نہ کرو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تمہاری مجبوری سمجھ سکتا ہوں۔ اگر تمہارا حضور ہو جانا ایک جرم ہوتا تو

بھی میں تمہاری ڈھال بننے کی کوشش کرتا۔“

”تو آپ کا مطلب ہے کہ میں اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں۔ اور جہاں چاہوں جا سکتا ہوں۔“

سین نے جواب دیا۔ ”میں تم آزاد ہو۔ تم ہمیشہ آزاد تھے۔ لیکن میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم میرا ساتھ چھوڑو گے۔“

عاصم نے قدرے متاثر ہو کر کہا۔ ”میں ناشکر گزار نہیں ہوں، آپ نے مجھے اس وقت پناہ دی تھی جب دنیا میں

ذاتی نہیں تھا۔ اور اس زمانے میں لشکر اور اسامندی کا تقاضا یہی تھا کہ میں آنکھیں بند کر کے آپ کے پیچھے

پڑوں اور آج اسامندی کا تقاضا یہ ہے کہ میں آپ کا راستہ روک لوں۔ اور چلا چلا کر یہ کہوں کہ اس جنگ کا انجام

سنت کی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اگر یہ جنگ انسانیت کی بھلائی کے لیے ہوتی اور مجھے ذرہ برابر اس بات کا یقین

ہو تو میں زمین پر قبضہ کے جھنڈے سرنگوں ہوں گے وہاں عدل و انصاف کے پرچم لہرائے جائیں گے۔ تو میں دنیا کے

فری کرنے تک کسرے کے لشکر کا ساتھ دیتا۔ لیکن کسریٰ کی فتوحات سے انسانیت کی کسی بھلائی کی توقع کرنا آگ

نے اللہ سے بھولی تلاش کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آپ قسطنطنیہ کو فتح کریں۔ یہ بھی ممکن ہے، کہ

بے بس انسانوں کی لاشوں کے انبار لگاتے ہوئے مغرب کی طرف روم کی قدیم سلطنت کی آخری عدد دے

ی آگے نکل جائیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ آپ کی تلواریں کسی ایسی تہذیب کو ختم دے سکیں، جنہوں میں دُوبی جولی

سنت کے زخم مندمل کر سکتی ہو۔ میں رومیوں کی حمایت نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں کہ بازنطینی حکمران بھی اپنے عروج

سے ادا رہیں اس زمین کو اپنے کردار و حرفوں کے خون اور آسودگی سے سیراب کر چکے ہیں۔ لیکن آج وہ ظلم ہیں،

اور وہ اس وقت تک مظلوم رہیں گے جب تک کہ روم کی سرزمین ایرانیوں کے مظالم کا حساب چکانے کے لیے

سے بڑے عزت کو ختم نہیں دینی۔ لیکن جب تک رومی مظلوم ہیں اور مجھے اس بات کا احساس ہے کہ کسریٰ کی

فتوحات کے ساتھ ساتھ ان کی مظلومیت میں اضافہ ہوتا جائے گا میری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔“

عاصم کی یہ جبارت سین کے لیے غیر متوقع تھی اور اس نے تلخ ہو کر کہا۔ ”عاصم تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم

عیسائی ہو چکے ہو۔“

یہ سب کچھ ہوائی مضبوط سکون کے ساتھ ان کی باتیں سن رہی تھی اچانک بھڑک اٹھی۔ ”عاصم بیوقوف“

بہوش کیوں ہو گئے۔ بہت سے کام لو۔ میرا شوہر عیسائیوں سے نفرت نہیں کرتا۔ صرف قیصر کی کمزوری اور

بے بسی کو ناقابلِ معافی سمجھتا ہے۔ اگر عیسائی ہونا جرم ہوتا تو اس گھر میں میرے اور میری بیٹی کے لیے کوئی جگہ

نہیں ہوتی چاہیے تھی۔ یہ عیسائیت کے دشمن نہیں بلکہ انہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ عیسائیت اس گئی

گوری حالت میں بھی جو سیت سے بہتر ہے۔ لیکن انیس کسری کا یہ حکم ہے کہ قسطنطنیہ پر ہر حالت میں توجہ نہ دیا جائے اور یہ اس حکم کی تعمیل پر مجبور ہیں۔“

سین نے نکل کر کہا۔ ”یوسیبیاقم خاموش رہو۔“

یوسیبیاق نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں ایک شکست خوردہ قوم کی بیٹی ہوں اور مجھے ایک فاتح قوم کے سپہ سالار کے سامنے زبان کھولنے کا کوئی حق نہیں۔“

پھر وہ عاصم کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ”عاصم مجھے تم پر فخر ہے۔ لیکن تمہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ تمہاری باتیں میرے شوہر کے عواظ پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔“

سین نے زخم خوردہ ہو کر کہا۔ ”یوسیبیا! یوسیبیا! خاموش رہو۔“ اور یوسیبیا اپنے آنسو پونچھتی ہوئی اٹھی اور بھاگی ہوئی برابر کے کمرے میں چلی گئی۔

سین نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبایا اور دینک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ بالآخر اس نے عاصم کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”عاصم آج دینا مجھے صرف کسرے کے ایک سپاہی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں کہ میں اس جنگ کو روکنے کی کتنی کوشش کر چکا ہوں۔“

مستقبل کے مؤرخ میری فتوحات کے تذکرے لکھیں گے لیکن یہ کون مانے گا کہ میں رومیوں سے زیادہ اپنے مینبر کے خلاف ناروا ہوں۔ اس جنگ کو روکنے کے لیے میں نے قسطنطنیہ جانے کا خطرہ مول لیا۔ اس کے بعد

جب میں رومیوں کی قید سے رہا ہو کر واپس آیا۔ تو مجھے یقین تھا کہ نوکاس کی موت کی اطلاع اور نئے قیصر کی طرف سے مصالحت کی پیشکش کسری کو مطمئن کر دے گی۔ لیکن میری یہ نیک توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ اس کے بعد میرا

ادلین قرض یہ تھا کہ میں اپنی بیوی اور بیٹی کو مجوسی کاہنوں کے تعصب سے بچانے کی کوشش کروں اور میرے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ میں اندھا دھند کسرے کے ہر حکم کی تعمیل کروں۔ اگر میں کسرے کے حکم کی تعمیل سے انکار

کر دیتا۔ تو بھی یہ جنگ نہیں رک سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا کہ مجھے عیسائیوں کا لوط دار ہونے کے جہم میں بدترین سزا دی جاتی اور میری جگہ یہ ہم کسی انتہائی سفاک آدمی کے سپرد کی جاتی۔ میں یہ دعوے نہیں کرتا کہ میں

بہت زیادہ رحم دل ثابت ہوا ہوں۔ لیکن میں ضرور کہوں گا کہ جہاں تک میرے بس کی بات تھی میں نے اپنے لشکر

پر ہشتاد و خون کی اجازت نہیں دی۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو آج تم اناطولیہ کی بستیوں اور شہروں میں ایک نصرانی زندہ نہ دیکھتے۔ مجوسی کا بہنوں اور ان کے زیر اثر امراء کو میرے خلاف سب سے بڑی شکایت یہی ہے کہ میں عیسائیوں

کا تہرہ واداری سے پیش آتا ہوں۔ مجھے کئی وفاق دار ساتھیوں اور دوستوں نے اس قسم کی اطلاعات بھیجی ہیں کہ بعض مجوسی بواب کئے بندوں مجھ پر یہ الزام عائد کر رہے ہیں کہ میرے ازواج نعلیق نے مجھے عیسائیوں کا لوط دار بنا دیا ہے اور ان

پر شمش یہ ہے کہ قسطنطنیہ فتح کرنے کے لیے میری جگہ کسی ایسے اتھاپند کو بھیج دیا جائے جس کا دل عیسائیوں کے لیے بے جذبہ سے قطعاً عاری ہو۔ میری آخری امید یہ تھی کہ کسری جنگ کی طوالت سے پریشان ہو کر کسی کسی دن صلح

کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔ لیکن یہ بھی ایک توفیق فریبی تھی۔ اب بازنطینی سلطنت کا نام و نشان مٹانے کے لیے کسری

ازمرب میں بھی ایک طاقت ور حلیف مل گیا ہے۔ شہنشاہ کا اچھی آوار تباہی کے خاقان کے پاس پہنچ چکا ہے۔ اور اگر

اپنی تمام زمینوں کا میاب ہو کر لڑنا تو قسطنطنیہ پر چڑھانی کرنے کے لیے میں شاید موسم بہار کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے۔ چند دن

ان ہمارے ایک جاسوس نے یہ اطلاع دی تھی کہ آوار اپنا حملہ کر کے قسطنطنیہ کے دروازوں تک پہنچ گئے تھے۔ اور

لڑیہ فر درست ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسرے کا اچھی ہماری توقعات سے زیادہ کامیابی حاصل کر چکا ہے۔

عاصم نے کہا۔ ”یہ خبر درست ہے۔ لیکن خاقان نے کسرے کے حلیف کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف لوٹ مار

کے لیے حملہ کیا تھا۔ اور اس حملے سے قبل اس کے آدمی کسرے کے اچھی حکومت کے گھاٹ نار کچے تھے۔ ایرج کوہ نظریہ

میں میری آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا تھا۔“

سین ایک سکتے کے عالم میں عاصم کی طرف دیکھنے لگا۔ یوسیبیا برابر کے کمرے سے نمودار ہوئی اور اس نے

عاصم سے پوچھا۔

”ایرج قتل ہو چکا ہے؟“

”ہاں“

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ سین نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے سوال کیا۔

عاصم نے جواب دیا۔ ”جناب وہ لوگ ایک انسان کو موت کے گھاٹ اتارتے وقت زیادہ سوچ بچار

کا کام نہیں لیتے یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ وہ ایران سے دور ہیں۔“

سین نے کہا: ”تیس معلوم ہے کہ ایرج کا خاندان ایران کے تمام امرا سے زیادہ بااثر ہے اور جب اس کے قتل ہو جانے کی اطلاع ملے گی تو یہ لوگ سارے ملک کو خاقان کے خلافت منتقل کر دیں گے۔“

»جناب خاقان کو ان کا اشتعال کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے سپاہی کسرے کے سپاہیوں سے زیادہ جنگ جو اور تو بخوار ہیں۔“

سین نے کہا: ”کاش میں اس بیوقوف کو وہاں جانے سے روک سکتا۔ لیکن میرے بس کی بات نہ تھی۔ اس نے مجھ سے بالابالاشمنشا کے استحکام حاصل کر لیے تھے۔ اور اس کا مقصد صرف مجھے نچو دکھانا تھا۔“

عاصم نے کہا: ”کیا اب بھی آپ کسرے کو یہ نہیں سمجھا سکتے کہ رومیوں کی دوستی آوارگی کی دوستی سے بہتر ہے۔“

سین نے جواب دیا: ”ممکن ہے کہ اب میں کسرے کی خدمت میں حاضر ہونے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو جاؤں۔“

یوسیبیا اور فسطنیہ پر امید ہو کر سین کی طرف دیکھنے لگیں۔

عاصم نے کہا: ”کیا بیچترہ فسطنیہ پر ایک ناکام حملے کے نتائج سے زیادہ ہو گا۔“

سین نے منعموم بچے میں جواب دیا: ”مجھے معلوم نہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر لڑنے کی ایک آخری منزل ہوتی ہے اور میری آخری منزل شاید یہی ہو۔ لیکن اگر میں کسرے کے پاس جا کر کھیلنے تیار رہی ہوں تو بھی تمہیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ آسان یا نرم شرائط پر صلح کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ کسرے کو مطمئن کرنے کے لیے رومیوں کو ذرا کے کئی تیغ گھونٹ حلق سے اتارنے پڑیں گے۔ صلح کے لیے کسرے کی شرائط وہی ہوں گی جو کسی مغزور یا باجگزار ملک سے منوائی جاتی ہیں۔“

عاصم نے جواب دیا: ”مجھے معلوم ہے اور یہ بات میں قیصر سے بھی کہہ چکا ہوں۔ موجودہ حالات میں اگر اسے اس بات کا یقین ہو جائے کہ ایرانیوں کے ہاتھوں اہل قسطنطنیہ کی جان و مال اور عزت کو کوئی خطرہ نہیں تو وہ آپ کے ٹھکرے کے لیے شتر کے دروازے کھول دیتے سے بھی لپٹ پوٹش نہیں کرے گا۔“

”نہیں نہیں۔“ یوسیبیا نے بے چین ہو کر کہا۔ ”جب ایرانی ٹھکرے قسطنطنیہ پر قابض ہو جائے گا۔ تو اس کی باگ ڈور جو کسی کاہنوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ وہاں انطاکیہ، دمشق و روم کی تاریخ و ہرانی سبائے گی۔ اور میرے شوہر کی

حیثیت ایک خاموش اور بے بس تماشاخی سے زیادہ نہیں ہوگی۔“

فسطنیہ نے احتجاج کیا۔ ”جی جان خدا کے لیے آپ خاموش رہیں۔“

سین نے کہا: ”بہی تمہیں احتجاج کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری ماں درست کہتی ہے۔ پھر وہ عاصم کی طرف متوجہ ہوا۔ ”میں قیصر کو اس بات کا یقین نہیں دلا سکتا۔ کہ اگر شتر کے دروازے کھول دیئے جائیں تو میرا لشکر دیوں کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کرنے کا تاہم کسرے کے پاس جانے سے پہلے میرے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ قیصر مصالحت کی خاطر کہاں تک جانے کے لیے تیار ہے۔“

”آپ قیصر کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں؟“

”قیصر کے ساتھ۔“

”جی ہاں، اگر آپ پسند فرمائیں تو ان کے ساتھ آپ کی ملاقات کا انتظام ہو سکتا ہے۔“

”کس جگہ۔؟“

”اگر آپ ان کی حفاظت کی ذمہ داری لے سکیں تو اسی کرے میں آپ کی ملاقات ہو سکتی ہے۔“

یوسیبیا اور فسطنیہ حیرت اور استحجاب کے عالم میں عاصم کی طرف دیکھنے لگیں اور سین نے اٹھ کر کرے میں ٹھنڈا شروع کر دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ رک کر عاصم کی طرف دیکھنے لگا۔

”عاصم اگر میں یہ کہوں کہ میں ہرقی کے ساتھ گفتگو کرنے کے لیے تیار ہوں تو وہ یہاں آجائے گا۔“

”ہاں۔“

”اور تم اُسے یہ اطمینان دلا سکو گے کہ اسے میرے پاس آنے میں کوئی خطرہ نہیں۔“

”ہاں۔“

”اور اگر میں اسے گرفتار کر کے کسرے کے پاس بھیج دوں تو۔؟“

”یہ سوال مجھے قسطنطنیہ میں بھی پوچھا گیا تھا۔ میں نے یہ جواب دیا تھا کہ اگر آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں تو

آپ کو ان شخص کے متعلق بے اطمینانی نہیں ہونی چاہیے جسے میں ساری دنیا سے زیادہ قابل اعتماد سمجھتا ہوں۔ وہ کسرے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میری قربانی نہیں دے گا۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”میں نے ان سے یہ کہا تھا کہ آپ مجھے یہ خیال کے طور پر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں، مادہ فیصلہ کے سامنے بعد ہی کی صورت میں آپ کو اس بات کا حق ہوگا کہ آپ میرا سفر ختم کر دیں۔“

”مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔“ میں یہ کہہ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

”عاصم۔“ اُس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”میں نہیں باؤس نہیں کہوں گا۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں، کہ تمہارے خیالات میں اتنا بڑا انقلاب کیسے آ گیا؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کو اپنی تمام سرگزشت نہیں سنائی۔ اور مجھے یقین ہے کہ جب آپ میری پوری داستان سن لیں گے تو آپ کو میری ذہنی تبدیلی پر تعجب نہیں ہوگا۔“

”بہت اچھا، تو تم ہماری داستان سننے کے بعد ہی فیصلہ کریں گے۔“

عاصم نے اپنی داستان شروع کی اور معمولی اختصار کے ساتھ سین کے ساتھ آخری ملاقات سے لے کر ملحدوں پہنچنے تک کے تمام واقعات بیان کر دیئے۔ اور اس طویل گفتگو کے اختتام پر اس نے سر اٹھایا اور کہا۔ ”اب میں آپ کے پاس یہ امید لے کر آیا ہوں کہ آپ انسانیت کو مزید تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ مجھے آپ کی مجبوریل کا احساس ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ مجھے آپ کی جرات اور ہمت پر بھروسہ ہے۔“

یوسیبیا اور قسطنطنیہ جتنی تنگ ہوں سے سین کی طرف دیکھنے لگیں۔ اور اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”عاصم اگر تمہیں مجھ پر اس قدر اعتماد ہے تو میں تمہیں باؤس نہیں کروں گا۔ عام حالات میں میں شاید صلح کا ایچی بن کر کمرے کے پاس جانے کی جرات نہ کرتا۔ لیکن ایرج کی موت کے بعد مجھے وہاں جانے کے لیے ایک معقول بہانہ مل گیا ہے۔ اور فیصلہ سے ملاقات کے بعد یہ مسئلہ اور زیادہ آسان ہو جائے گا۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ ہر تفریق بذات خود یہاں آنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو جائے گا۔“

”عاصم نے جواب دیا۔ ”ہر تفریق کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔“

یوسیبیا نے اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”لیکن ہر تفریق کو ملاقات کی دعوت دینے سے پہلے آپ کو اچھی طرح

اس بات کا اطمینان کر لینا چاہیے کہ یہاں اسے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ اور میں یہ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ہر تفریق کے

تبدیلی کی صورت میں صرف عاصم کو ہی اپنی زندگی سے محروم نہیں ہونا پڑے گا۔ بلکہ میں بھی میں رہنے کی بجائے سندھ کو برباد کرنے کو ترجیح دوں گی اور شاید میری بیٹی کا انجام بھی مجھ سے مختلف نہ ہوگا۔“

سین نے فخر خوردہ سا ہو کر کہا۔ ”یوسیبیا اگر تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں تو میں فیصلہ کر لیاں آئے کی دعوت دینے کی بجائے قسطنطنیہ جانے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن یہ بات کس وقت کے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔“

یوسیبیا نے قدر سے نام ہو کر کہا۔ ”میں نہیں میرا یہ مطلب نہ تھا۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ آپ فیصلہ کر لیاں ملانے سے پہلے ان کی حفاظت کے متعلق اچھی طرح اطمینان کر لیں۔“

سین عاصم کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مجھے معلوم نہیں کہ کس وقت کے وہاں میں مجھے کس حد تک کامیابی ہوگی۔ لیکن میں یہاں جانے کے لیے تیار ہوں۔ تم ہر تفریق کو یہ پیغام دے سکتے ہو کہ میں اس سے ملاقات کے لیے تیار ہوں۔ لیکن تم دھان کیسے جاؤ گے؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”آپ اس کی فکر نہ کریں۔ کل رات میرے لیے روٹیوں کی ایک کشتی پہنچ جائے گی اور مجھے اس کشتی کی رہنمائی کے لیے سندھ کے کنارے صرف آگ جلانے کی ضرورت ہوگی۔ اور آپ کو صرف اس بات کی احتیاط کرنا پڑے گی کہ وہاں صرف چند انسانی قابل اعتماد آدمی موجود ہوں۔“



شام کے وقت قسطنطنیہ قلعے کی فیصل پر کھڑی تھی۔ عاصم دروازے کے سامنے کچھ فاصلے پر سرود کے درختوں سے نورا ہوا اور وہ اُسے دیکھتے ہی زینے کے راستے چنچے اتر آئی اور دروازے سے چند قدم دور رک کر اس کا انتظار کرنے لگی جب عاصم اس کے قریب پہنچا تو اس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ ”آپ کہاں چلے گئے تھے؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”میں ذرا میرے لیے باہر نکل گیا تھا۔“

”آئیے میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔“ قسطنطنیہ یہ کہہ کر زینے کی طرف بڑھی۔ اور عاصم اس کے پیچھے ہو لیا۔

فیصل کے اوپر پہنچ کر قسطنطنیہ نے مغرب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھئے آج نیا چاند نوراد ہو چکا ہے۔“

عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ چاند تم سے پہلے دیکھ چکا ہوں۔“

”نہیں نہیں آپ نے مجھ سے پہلے نہیں دیکھا ہوگا۔ میں غروب آفتاب سے پہلے ہی یہاں پہنچ کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اور پہلی رات کے چاند نے ہر مہینے مجھے اسی جگہ اپنا انتظار کرتے دیکھا ہے۔۔۔۔۔ میں ہر بار اپنے دل کو یہ تیلیاں دیا کرتی تھی کہ نیا مہینہ تم ہونے سے پہلے تم واپس آجاؤ گے اور جب یہ اپنا مہینے بھر کا سفر پورا کر لیتا تھا تو نیا چاند مجھے نئی امیدوں کی روشنی دکھایا کرتا تھا۔۔۔۔۔ کل تم پھر جا رہے ہو۔ اور میں تم سے یہ وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ اب مجھے مہینوں اور برسوں تک تمہارا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔۔۔۔۔ اب مجھے طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک تمہاری راہ دیکھنا بھی دشوار محسوس ہوتا ہے۔ آج جب تم اپنی سرگزشت سنا رہے تھے تو میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ میں افریقہ کے صحرائوں اور جنگلوں میں تمہارے ساتھ تھی۔ جب تم زخمی تھے تو میں تمہارے زخموں پر ہر دم دکھا کرتی تھی۔ جب تم بیمار تھے تو میں تمہاری تیمارداری کیا کرتی تھی۔ جب تمہارے دل میں تنہائی اور بے بسی کا احساس اپنی انتہا کو پہنچ جاتا تھا تو میں نہیں آوازیں دیا کرتی تھی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اور تمہاری سرگزشت کے اختتام پر میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ میں راستے کی تمام مثالیں طے کرنے کے بعد تمہارے ساتھ واپس آئی ہوں۔ میری باتیں سن رہے ہو، عاصم تم خاموش کیوں ہو؟“

”فسطینہ! فسطینہ!“ عاصم نے رزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تمہارے دل میں یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ ہم دونوں مختلف راستوں پر چلنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔“

چند ثانیے فسطینہ کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر اس نے کرب انگیز لہجے میں جواب دیا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ میرے ہیں۔“

”لیکن تم سین کی بیٹی ہو فسطینہ، اور میں۔۔۔۔۔“

فسطینہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ سین کی بیٹی کا امتحان لینا چاہتے ہیں تو میرے ساتھ آئیے۔ میں ان کے سامنے یہ اعلان کرنے کے لیے تیار ہوں کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر تمہاری محبت ایک جرم ہے تو میں اس کے لیے ہر سزا بھگتے کو تیار ہوں۔ آئیے؟“

فسطینہ اس کا بازو پکڑ کر بچھیننے لگی۔

”نادان نہ ہو فسطینہ! تم نہیں جانتیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اگر تم میرے دل کا حال جاننا چاہتی ہو تو سنو،

اگر تمہارے دل کے تاج میرے قدموں میں ہوتے اور تم ایک غریب چرواہے یا کسان کی لڑکی ہو تیں تو بھی میں نہیں حاصل کرنا اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی سمجھتا۔“

وہ بولی۔ ”کیا یہ ایک جرم ہے کہ میں کسی کسان یا چرواہے کی بیٹی نہیں ہوں۔“

”نہیں فسطینہ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ لیکن میں اگر اس بے چارگی اور بے بسی کی حالت میں تمہاری تنگناکوں کو ایک جرم ہوگا۔ فسطینہ تم پھولوں پر چلنے کے لیے پیدا ہوئی ہو اور میرا راستہ کانٹوں سے اٹا ہوا ہے۔ میں تم کے پناہ مانگا ہوں۔ لیکن تمہاری ذلیل برداشت نہیں کروں گا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں فسطینہ اور میری محبت کا تقاضا یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے آرام و مصائب میں حصہ دار نہ بناؤں۔“

فسطینہ کی آنکھوں میں آنسو چھپک رہے تھے۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپایا۔ اللہ سسکیاں لینے لگی۔

عاصم نے کہا۔ ”مجھ کو اپنی مجبوریوں سے زیادہ تمہاری مجبوریوں کا احساس ہے۔ تم ایک غریب الوطن اور بے سارا انسان کے ساتھ بٹھکنے کے لیے نہیں بلکہ ممر میں ایوانوں کی زینت بننے کے لیے پیدا ہوئی ہو۔ میں اسے بھی قدرت کا ایک انعام سمجھتا ہوں کہ تم میرے پاس کھڑی ہو اور میں تمہارے ساتھ باتیں کر رہا ہوں۔ اور اگر میں اس سے زیادہ چاہوں تو تمہارے والدین مجھے دیوانہ خیال کریں گے۔“

اچانک کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور وہ ہر تھک کر زینے کی طرف دیکھنے لگے۔ یوسیبیا زینے سے نمودار ہوئی۔ اور اس نے کہا۔ ”تم اس سردی میں یہاں کیا کر رہے ہو؟“

فسطینہ نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”امی جان! اگر میں اباجان کے سامنے یہ کہ دوں کہ میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تو وہ مجھے کیا سزا دیں گے؟“

یوسیبیا نے جواب دیا۔ ”تمہارے اباجان تمہاری دیوانگی سے بے خبر نہیں ہیں۔ پھر وہ عاصم کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”بیٹا میں تمہاری باتیں سن چکی ہوں اور مجھے تمہاری شرافت سے یہی توقع تھی لیکن تمہیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ فسطینہ کے والدین اس کے دشمن ہیں۔ میری بیٹی کو ان ممر میں ایوانوں کی ضرورت نہیں جو انسانوں کی بجائے وحشوں کے مسکن ہیں۔ فسطینہ کے اباجان سے تمہارے دل کا حال بھی پوشیدہ نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میری بجائے

وہ تارے باتیں سن لیتے تو انہیں زیادہ سے زیادہ اس بات کی نگرہوتی کہ دندوں کی اس دنیا میں کون سا گوشہ
تمہارے لیے محفوظ ہے؟

باب ۳۳

عاصم کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا وہ دیر تک سر جھکانے کھڑا رہا اور بالآخر جب اس نے یوسیبیا کی طرف
دیکھا تو اس کی آنکھیں نیشکر کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ آپ خدا سے دعا کریں کہ
دندوں کی یہ دنیا انسانوں سے آباد ہو جائے۔ اور میں خوف کے بغیر یہ کہہ سکوں کہ میں کسی جنگل، پہاڑ یا صحرا میں بھی
فلسطینہ کی حفاظت کی ذمہ داری لے سکتا ہوں۔ جب کسرطہ اور قیصر میں صلح ہو جائے گی تو میں اپنی عزیز وطنی
اور بے چارگی کا احساس کیے بغیر فلسطینہ کے لیے ہاتھ پھیلا سکوں گا۔ لیکن سر دست آپ دعا کریں کہ مجھے اس ہم
میں کامیابی ہو۔

اگلی رات عاصم اور ایرلی فرج کے چند سپاہی سمندر کے کنارے ایک الاؤ کے گرد کھڑے تھے۔ آسمان صاف
تھا اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ ایک سپاہی نے لکڑیوں کا ایک گٹھا اٹھا کر الاؤ پر ڈال دیا اور آگ کے شعلے آہستہ آہستہ
بند ہونے لگے۔

عاصم نے آگ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ میں سپہ سالار کے پاس جاتا ہوں۔ اگر کوئی کشتی نظر آئے
تو مجھے فوراً اطلاع دو۔

ایک سپاہی نے کہا۔ جناب آپ مطمئن رہیں، لیکن ہوا کافی تیز ہے اور مجھے یقین نہیں کہ رومی اس موسم میں
رات کے وقت یہاں آنا پسند کریں گے۔

”وہ ضرور آئیں گے، تم الاؤ پر لکڑیاں ڈالتے رہو۔“ عاصم یہ کہہ کر ایک طرف چل دیا۔ کوئی دو سو قدم کے فاصلے
پر چند پرے دار مشعلیں اٹھائے ایک کٹادہ خیمے کے گرد گشت کر رہے تھے کسی نے بلند آواز میں کہا۔ ”شہر و کون ہے؟“
”میں عاصم ہوں۔“ اس نے رک کر جواب دیا اور پھر کچھ دیر توقف کے بعد دروازے کا پردہ اٹھا کر خیمے کے
اندروں داخل ہوا۔

سین نے ہوگاؤ دیکھنے سے ٹپک لگائے بیٹھا تھا اُسے دیکھتے ہی سوال کیا۔ ”وہ آگے؟“

”نہیں جناب، وہ ابھی تک نہیں آئے۔“ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو انہی سردی میں یہاں آنے کی تکلیف
اٹھانا پڑی۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ اگر آوارہ نے فلسطینہ پر حملہ نہیں کر دیا تو وہ ضرور آئیں گے۔ آج ہوا تیز ضرور ہے
لیکن ان کے موافق ہے اور انہیں ہمارے الاؤ کی روشنی میں ہلک دکھائی دے سکتی ہے۔ اگر آوارہ نے فلسطینہ پر

”بیاناتے ایک نیک کام اپنے ذمہ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ خدا تمہاری مدد کرے گا۔ چلو اب نیچے چلیں
مجھے سردی محسوس ہو رہی ہے۔“ یوسیبیا یہ کہہ کر زمین کی طرف بڑھی اور عاصم اور فلسطینہ اس کے پیچھے چل دیے۔
زمین کے درمیان پہنچ کر عاصم نے فلسطینہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور رک کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”فلسطینہ تم مجھ سے خفا
تو نہیں ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں فلسطینہ سے بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔ لیکن اگر تمہارے ابا جان کو کسرطہ کے پاس جانا پڑا تو مجھے
بھی ان کا ساتھ دینا پڑے گا۔ تم میرا انتظار کر سکو گی؟“

”ہاں۔“ اگر مجھے اس بات کا یقین ہو کہ تم ضرور آؤ گے تو میں مرتے دم تک تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔“
یوسیبیا نیچے پہنچ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ تو عاصم نے فلسطینہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور آہستہ آہستہ زمین
سے اترنے لگے۔

دو بارہ حملہ نہیں کر دیا، تو انہیں اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا، کہ اب آپ واپس نلے میں تشریف لے جائیں اور وہاں آرام کریں۔

”نہیں نہیں، جب تک مجھے اس بات کی تسلی نہیں ہو جاتی کہ تم صحیح سلامت نصحت ہو چکے ہو، میں یہاں بیٹھا مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے سپاہیوں کی طرف سے ذرا سی بے احتیاطی یہ سارا کھیل بگاڑ سکتی ہے۔ تم بیٹھ جاؤ میں تمہارے ساتھ بائیں کرنا چاہتا ہوں“

عاصم اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ نیچے میں ٹھوڑی دیر خاموشی چھانی رہی۔ بلاآخر سین نے کہا ”میری فرج کا کوئی افسر با سپاہی اب جنگ جاری رکھنے پر خوش نہیں۔ تاہم اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ میں رومیوں کے ساتھ مصالحت کی طرف مائل ہوں تو وہ میرے خلاف ایک طوفان کھڑا کریں گے۔ کئی افسر ایسے ہیں جو شہنشاہ کو مجھ سے بدظن کر کے میری جگہ لینے کی کوشش کریں گے۔ میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ یوسیا میری بیوی ہے۔ اور رومیوں اور حاسدوں کو مجھ پر رومیوں کا طرف دار ہونے کا الزام عاید کرنے کے لیے صرف ایک بمانے کی ضرورت ہے میری پہلی غلطی یہ تھی کہ میں اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف اس جنگ میں شریک ہو گیا تھا۔ اور میری آخری غلطی شاید یہ ہو کہ میں یہ جاننے اور سمجھنے کے باوجود مصالحت کرانے کی ذمہ داری قبول کر چکا ہوں کہ کسرے کے دربار میں میرا اتفاق اٹایا جائے گا۔ آج اگر مجھے یہ تسلی ہو کہ دنیا کا کوئی گوشہ میری بیوی اور بیٹی کے لیے محفوظ ہے تو میں ان تمام الجھنوں سے اپنا دامن بچا کر وہاں بھاگ جاؤں“

عاصم نے کہا۔ ”کاش انسان کو بھاگنے سے نہات مل سکتی۔ آج ساری دنیا پر وحشت اور بربریت کی حکمرانی ہے۔ آج ہرگز دور اور بے بس انسان اطمینان کے چند سانس لینے کے لیے کسی زیادہ طاقتور اور زیادہ با اختیار انسان کا سہارا تلاش کرنے پر مجبور ہے لیکن آپ ان خوش قسمت انسانوں میں سے ہیں جو تاریخ کی مین پھلنے والے قافلوں کو امید کی روشنی دکھا سکتے ہیں۔ یہ ایک معمولی واقعہ نہیں کہ قیصر نے مجھ جیسے بے بس انسان کو وسیلہ بنا کر آپ کے پاس بھیجا ہے۔“

سین نے جواب دیا۔ ”عاصم تم یہ نہیں جانتے کہ کسرے اس دنیا کے کمزور اور مغلوب انسانوں کے متعلق ایک فاتح کے ذہن سے سوچتا ہے اور اُسے اپنی ذات کے لیے کسی عظیم خطرے کا احساس ہی امن کی جانب راغب کر سکتا ہے۔ لیکن اتنی عظیم فتوحات تمہے بعد اس کی خود پسندی اور غرور کا یہ عالم ہے کہ اگر ساری دنیا کے انسان یک زبان

بزرگنا شروع کر دیں کہ جنگ کی مزید طوالت اس کے لیے کسی خطرے کا باعث ہو سکتی ہے تو بھی اس کے باہم میں ذمہ بفرق نہیں آئے گا۔ آج دنیا کی حالت دیکھ کر کوئی ذی شعور انسان یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ قدرت ہا کوئی معجزہ کسری کو فاتح عالم بننے سے روک سکتا ہے چند برس قبل صرف تمہارے ملک سے نبوت کے کسی دعوے دار نے یہ کہنے کی جرأت کی تھی کہ بلاآخر رومی ایرانیوں پر غالب آئیں گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس پیش گوئی کے بعد ہماری پے درپے فتوحات کے باعث اس پر ایمان لانے والے سادہ دل لوگ بھی اس کا مذاق اڑاتے ہو گئے۔“

”عاصم نے کہا۔ ”مکہ میں نبوت کے دعوے دار کے متعلق میں بھی بہت کچھ سن چکا ہوں، لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس نے ایرانیوں کی شکست یا رومیوں کی فتح کے متعلق کوئی پیش گوئی کی ہے؟“

سین نے جواب دیا۔ ”میں سے تاجروں کا کوئی مفاصلہ یروشلم آیا تھا اور انہوں نے راستے میں مکہ کے نبی کی یہ پیش گوئی سنی تھی جب یہ بات یروشلم کے حاکم کے کانوں تک پہنچی تو اس نے یہ سمجھا کہ دشمن کے جاسوس ہمارے سپاہیوں کے حوصلے پرست کرنے کے لیے اس قسم کی افواہیں پھیلا رہے ہیں۔ پھر تحقیقات کے بعد میں نے تاجروں سے باز پرس کی گئی تو انہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ عرب میں یہ پیش گوئی کافی مشہور ہو چکی ہے مجھے یہ تمام واقعات فرج کے ان عمدہ داروں کی زبانی معلوم ہوئے تھے جو یروشلم سے تبدیل ہو کر یہاں آتے تھے۔ مجھے ان دنوں یہ سارا قصہ ایک مذاق معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اب کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر دنیا میں کوئی ایسا انسان ہو جس کی نگاہیں حال کے پردوں سے آگے دیکھ سکتی ہوں تو کسرے کو جنگ کے نتائج سے توفزہ کر کے اُسے امن کی طرف مائل کر دینا اس کا عظیم ترین معجزہ ہوگا۔“

عاصم نے کہا۔ ”اپنا وطن چھوڑنے سے پہلے میں نے مکہ کے نبی کے متعلق عجیب و غریب باتیں سنی تھیں۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ بنجر زمین کیسے ایسی اچھائی کو تہم دے سکتی ہے جس کے اثرات صحرائے عرب سے باہر پہنچ سکیں۔ اگر وہاں کوئی نبی انسانیت کے لیے امن کا پیغام لے کر آیا ہو تو اہل عرب اس کے راستے میں اپنی خاندا نی اور قبائلی عصبیتوں کی دیواریں کھڑی کر دیں گے۔ یہ وہ صحرا ہے جس میں چھوٹے وائے چشمے ندیوں یا دیواروں کی شکل اختیار نہیں کرتے بلکہ وہیں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ روم و ایران کے تاجداروں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ کسی عظیم شکست یا بنا ہی کے خوف سے وہ اپنی تلواریں نیاموں میں ڈالنے پر مجبور ہو جائیں یا کوئی میسر معمولی انسان

انہیں امن کا راستہ دکھائے گا وہ اس کے جاہ و جلال سے مرعوب ہو کر اس کے پیچھے چل پڑیں لیکن سردارانِ عرب کو کسی بدترین بنا ہی کا خوف بھی امن کی طرف مائل نہیں کر سکتا۔ وہ صرف کسی ایسے راہنما کو قبول کر سکتے ہیں جو انہیں امن کی بجائے ہلاکت کا راستہ دکھا سکتا ہو۔ عرب کی سرزمین میں امن اور انسانیت کا نعرہ بلند کرنے والے نبی کو سب سے پہلے اپنے قبیلے کے ان شیوخ سے نبرد آزما ہونا پڑے گا جو مشرق و مغرب کے تمام شہنشاہوں سے کہیں زیادہ ظالم، مغرور اور خود پسند ہیں۔ پھر اگر اس کا اپنا قبیلہ اس کا طرفدار بن گیا تو دوسرے تمام قبائل اس کے حامیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یثرب چھوڑنے سے قبل مکہ کے نبی کے متعلق میری معلومات صرف یہ تھیں کہ خاندانِ قریش کے چند معززین کے علاوہ اس پر ایمان لانے والے گروہ کی اکثریت انتہائی بے بس، نادار اور غلٹ لوگوں پر مشتمل ہے اور باقی سارا قبیلہ اس کا مذاق اٹاتا ہے۔ اگر وہ اپنے قبیلے کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گیا تو مجھے یقین ہے کہ مکہ سے باہر اس کی آواز کسی دوسرے قبیلے کو متاثر نہیں کر سکے گی جو لوگ عرب کے حالات سے واقف ہیں وہ کسی ایسے نبی کی کامیابی کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو وہاں کے قبائل کو عدل و مساوات کا درس دیتا ہو۔ آج دنیا کا ہر مذی شعور انسان کسی نجات دہندہ کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور میں بھی کسی ایسے راہنما کا متلاشی ہوں جس کی آواز قبیلوں، نسلوں اور قوموں کی سرحدیں پھانڈ سکتی ہو۔ انسانی تاریخ کا وہ دن کتنا حسین ہوگا جب انسانوں کے درمیان ادنیٰ اور اعلیٰ، گورے اور کالے، آفا اور غلام، کمزور اور طاقتور کا امتیاز اٹھ جائیگا کبھی کبھی میں اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہوں کہ شاید انسانیت کا نجات دہندہ آچکا ہے لیکن عرب کے حالات جانتے ہوئے میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس ظلمت کو مٹانے کوئی روشنی نمودار نہیں ہو سکتی۔“

سین نے کہا: ”تم حینِ فترتِ عرب کے حالات سے مایوس ہو میں اس سے کہیں زیادہ ایران کے حالات سے مایوس ہوں۔ ایران کے مجموعی کاہن ساری دنیا پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور انہیں جب یہ معلوم ہوگا کہ میں صلح کا اچھی بن کر کسرے کے پاس آیا ہوں تو وہ میرے خلاف ایک طوفان کھڑا کریں گے۔ تاہم میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ اگر قیصر نے میرے پاس آنے کا ارادہ تبدیل نہ کر دیا تو میں کسرے کے پاس ضرور جاؤں گا۔“

مجھے یقین ہے کہ قیصر آپ کے پاس ضرور آئے گا۔ اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ صلح کے لیے آپ کی

رہش بے نتیجہ ثابت نہیں ہوگی۔“

خیمے کے باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی پھر ایک سپاہی یا پھنسا ہوا خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: ”جناب! پہنچ گئے ہیں۔ ان کا ہماز ساحل سے کچھ دور رک گیا ہے اور اب ایک کشتی ساحل کی طرف آرہی ہے۔“

عاصم نے جلدی سے اٹھ کر سین سے کہا: ”جناب آپ یہیں ٹھہریں میں انہیں لے کر آتا ہوں۔“ اور پھر وہ کسی وقت کے بغیر سپاہی کے ساتھ خیمے سے باہر نکل گیا۔



کشتی کنارے پر لگی پھر چند تانیے توقف کے بعد کلاڈیوس اور ولیرس بچے اتر پڑے۔ عاصم نے جو چند شعلہ ہمدار سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا آگے بڑھ کر کیے کے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا: ”کلاڈیوس میرا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ زیادہ آدمی آئیں گے۔“

کلاڈیوس نے جواب دیا: ”میرے ساتھ چھ آدمی اور ہیں۔ لیکن ہم نے اپنے ہماز کو اختیاراً ڈنبا پیچھے روک دیا ہے۔ اپنے باقی ساتھیوں کو یہاں لانے سے پہلے میں آپ سے مل کر اس بات کی تسلی کر لینا ضروری سمجھتا تھا کہ یہ جگہ ان کے لیے کس حد تک محفوظ ہے۔“

عاصم نے کہا: ”ایرانی لشکر کے سپہ سالار سے زیادہ آپ کے ساتھیوں کی حفاظت کا ذمہ اور کون لے سکتا ہے ایسے میں آپ کو ان کے پاس لے چلتا ہوں۔“

”سپہ سالار کہاں ہیں؟“

”وہ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ایک خیمے میں آپ کا انتظار کر رہے۔ اگر آپ کے ساتھی ہماز سے اٹھنے میں کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو مجھے یہ خیال کے طور پر ہماز پر بھیج دیجیے۔“

کلاڈیوس نے کہا: ”میں نہیں، مجھے تمہارے متعلق کوئی بداعتمادی نہیں۔ اور اب شاید قیصر بھی یہاں آنے کے لیے یہ خیال کی ضرورت محسوس نہ کریں۔ میں صرف تمہاری زبان سے یہ سننا چاہتا تھا کہ تمہیں میرے ساتھیوں کی حفاظت کے متعلق پورا اطمینان ہے؟“

عاصم نے جواب دیا: اگر مجھے یہ اطمینان نہ ہوتا تو سمندر کے کنارے آگ نہ جلاتا۔ یہاں پہنچ کر مجھے اپنی ترقی سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ سپہ سالار بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تمہارے دوستوں کو یہاں سے کلاڈیوس نے جواب دینے کی بجائے عاصم کا بازو پکڑ کر سرگوشی کے انداز میں کہا: کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آپ کے سامنے ایک طرف ہٹ جائیں۔ میں ان کے سامنے ہر سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتا۔

عاصم نے فارسی زبان میں سپاہیوں سے کچھ کہا اور وہ جھگٹے ہوئے ایک طرف چلے گئے۔ پھر اس نے کلاڈیوس کی طرف متوجہ ہو کر کہا: اس احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ یہ سپاہی سین نے اپنے انتہائی دُفادار ساتھیوں میں سے منتخب کیے تھے۔ اور اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ ان میں سے کوئی رومی زبان کا ایک لفظ بھی نہ جانتا ہو۔

کلاڈیوس نے کہا: میری احتیاط کی ایک معقول وجہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے سامنے کون ہیں؟

”نہیں لیکن میں اتنا ضرور سمجھ سکتا ہوں کہ وہ کسی معمولی حیثیت کے لوگ نہیں ہوں گے۔ بہر حال آپ انہیں یہ پیغام بھیج سکتے ہیں کہ وہ پورے اطمینان کے ساتھ یہاں تشریف لا سکتے ہیں۔“

کلاڈیوس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا: ”عاصم فرض کر دو۔ اگر آج رات قیصر بذات خود میرے ساتھ آنے کے لیے تیار ہو جاتا تو تم کس حد تک اس کی حفاظت کا ذمہ لے سکتے تھے؟“

عاصم کچھ دیر بدحواس سا ہو کر کلاڈیوس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: ”میں تمہاری تسلی کے لیے ضرر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایرانی سپاہیوں کا جو دستہ اس وقت یہاں موجود ہے وہ سپہ سالار کے انتہائی جان نثار آدمیوں پر مشتمل ہے۔ تاہم اگر قیصر کو تمہارے ساتھ دیکھ کر کسی کی نیت بد ہو جاتی تو تم لوگوں سے کہیں زیادہ ایران کے سپاہیوں کو اپنے معزز حمان کی جان بچانے کی فکر ہوئی جس میں انہیں ہوں اس کے متعلق میں پورے اطمینان کیساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ قیصر کی حفاظت کے لیے اپنی جان پر کھیل جائے گا۔“

کلاڈیوس نے کہا: ”میں سین کو نہیں جانتا۔ تاہم تمہاری باتوں سے مجھے یہ اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ وہ یقیناً کوئی بڑا آدمی ہوگا۔ ایک دغا باز آدمی اپنے سامنے کے دل میں اتنا یقین اور اعتماد پیدا نہیں کر سکتا۔“

میرے دوست اب روم اور انسانیت کی تقدیر تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اور تمہارے لئے یہ بات

سننے کے لیے بہت تھوڑا وقت ہے کہ تم اس عظیم ذمہ داری سے کہاں تک عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک وہ قیصر سے دیاہرقل کے نام سے پکارتی ہے۔ تمہارے سپہ سالار کے سامنے کھڑا ہوگا۔ اگر ایک شکست خوردہ حکمران کی یہ جسارت تمہاری توقع سے زیادہ ہے اور تم کوئی خدشہ محسوس کرتے ہو تو میں اب بھی واپس جانے کے لیے تیار ہوں۔“

عاصم کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: مجھے کوئی خدشہ نہیں تاہم مجھے یہ اعتراف ہے کہ قیصر کی یہ جرات میری توقع سے کہیں زیادہ ہے۔ سین کو تو یہ بات بھی بعد از قیاس معلوم ہوتی تھی کہ کسی حالت میں بھی وہ ان کے پاس آنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو جائے گا۔“

کلاڈیوس نے کہا: ”قیصر کا یہ فیصلہ میرے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ ہم جہاز کے بادبان کھول رہے تھے، کہ ان کا بچا بندرگاہ پر پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ وہ استسقف اعظم کے ساتھ تشریف لارہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ابھی آپ کا ہمارے ساتھ جانا مناسب نہیں لیکن انہوں نے کہا۔ اگر سین ایک تشریف دشمن ہے تو مجھے اس کے پاس جانے کے لیے کسی احتیاط کی ضرورت نہیں۔ اور اگر اس کی نیت ٹھیک نہ ہوئی تو مجھے گرفتار کرنے کے لیے وہ ایک کی بجائے ایک ہزار آدمیوں کو بھی قربان کر سکتا ہے۔ میں نصرت سے زیادہ فاصلہ طے کر لینے کے بعد بھی یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اچانک ہمیں واپسی کا حکم دیں گے۔ لیکن آج پھر وہ اس جرات اور ہمت کا مظاہرہ کر رہے تھے جو انہیں آوار کے خاقان کے پاس لے گئی تھی۔ اور مجھے یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی تھی کہ کچھ مدت قبل وہ قسطنطنیہ کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر قزاقانہ کی طرف فرار ہونے کا ارادہ کر چکے تھے۔ میں نے استسقف اعظم سے قیصر کی اس ذہنی کاپلاپٹ کے متعلق استفسار کیا تھا اور وہ یہ کہتے تھے کہ قدرت کا یہ مجرہ لاکھوں بے بس انسانوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“

عاصم نے کہا: ”آپ انہیں لے آئیں۔ میں سپہ سالار کو اطلاع دیتا ہوں مجھے یقین ہے کہ قیصر کے استقبال کے لیے وہ بذات خود یہاں آنا زیادہ پسند کریں گے۔“

”لیکن قیصر کسی اطلاع کے بغیر ان کے سامنے پیش ہونا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سین کے ساتھ جہانگ ملاقات زیادہ موثر ثابت ہوگی۔“ یہ کہہ کلاڈیوس اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا۔

دلیپس جھاگ کر کشتی پر رسوا ہو گیا اور چار ملاحوں نے چوراٹھائیے۔ عاصم اور کلاڈیوس کچھ دیر سمندر کی طرف دیکھتے رہے۔ بالآخر کلاڈیوس نے کہا۔ ”عاصم تم نے اپنی سفینہ کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ وہ کہاں ہے؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”وہ پاس ہی قطعہ میں ہے میں اس سے مل چکا ہوں اور تمہاری تسلی کے لیے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اب ہمارے درمیان کوئی پہاڑ، صحرا یا سمندر حائل نہیں۔ اور وہ نادان لڑکی اس بات پر مسرور نظر آتی ہے۔ کہ ایک جھٹکا ہوا مسافر زمانے کی خاک چھاننے کے بعد دوبارہ اس کے دروازے پر آسکلا ہے۔ اب اُسے دیکھنے اس کے ساتھ باتیں کرتے یا اس کے متعلق سوچتے ہوتے مجھے یہ محسوس نہیں ہوتا۔ کہ میں اپنے آپ کو قریب رہ رہا ہوں۔ کلاڈیوس میں اپنے مستقبل کے متعلق بہت زیادہ پر امید نہیں۔ لیکن اب میں اس سے بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میرے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ ہمارے درمیان زمان و مکان کے پردے حائل نہیں ہو سکے۔“

کلاڈیوس نے کہا۔ ”اگر وہ ابھی تک تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔ تو میں اسے نادان نہیں کہہ سکتا۔“

پندرہ سالہ لڑکے کی طرف سے کوئی مشعل اٹھائے نمودار ہوا اور عاصم نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ سالہ خود اس طرف تشریف لارہے ہیں۔“

وہ چند قدم آگے بڑھے۔ سین اور اس کے دو محافظ مشعل بردار کے پیچھے آ رہے تھے۔

سین نے عاصم کو دیکھتے ہی شکایت کے لہجے میں کہا۔ ”تم نے ہمیں بہت پریشان کیا۔“

عاصم نے کہا۔ ”جناب یہ کلاڈیوس ہیں۔ میں آپ سے ان کا ذکر کر چکا ہوں۔ اور ان کے دوسرے ساتھی جہاں سے اترنے سے قبل مجھ سے اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے لیے کشتی بھیج دی گئی ہے، وہ ابھی پہنچ جائیں گے۔“

سین نے کلاڈیوس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم عاصم کے ہر دوست کو اپنا دوست نہیں سمجھتے ہیں۔“

کلاڈیوس نے احساندہی سے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ میری خوش قسمتی ہے۔“

سین کچھ اور کے بغیر آگے بڑھا اور لاؤکے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

عاصم نے کہا۔ ”یہاں ٹھنڈی ہوا میں آپ کو تکلیف ہوگی۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آپ کشتی کے واپس آتے

نیچے میں آرام فرمائیں۔“

سین نے جواب دیا۔ ”نہیں میرے لیے یہ آگ زیادہ آرام دہ ہے۔ لیکن ہمارے آدمی کہاں چلے گئے؟“

”جناب وہ ہیں اُس پاس کھڑے ہیں، میں نے عمداً انہیں یہاں سے ہٹا دیا ہے۔“

سین کلاڈیوس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم ہمیں بتا سکتے ہو کہ صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے قیصر نے اپنے

بھائیوں کو کس حد تک اختیارات دیے ہیں۔“

”جناب قیصر اپنی رعایا کو مزید تباہی سے بچانے کے لیے آپ کی ہر ایسی شرط ماننے کے لیے تیار ہے،

جسے پورا کرنا اس کے بس میں ہو۔ اور میں آپ کو، یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ میرے ساتھی اپنے حکمران کی طرف

سے پورے اختیارات لے کر آئے ہیں۔“

سین کچھ دیر خاموشی سے کلاڈیوس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ کسری نے

منح کی بات چیت کے لیے مجھے کوئی اختیار نہیں دیا میرا تم لوگوں کے استقبال کے لیے یہاں آنا بھی اس کے

حکام کی خلاف ورزی ہے۔“

کلاڈیوس نے مایوس سا ہو کر جواب دیا۔ ”مجھے معلوم ہے لیکن آپ ایک ڈوبتے ہوئے انسان کو تنکوں کا

سہارا لینے سے منع نہیں کر سکتے۔ روم کا شکست خوردہ حکمران آپ کی وساطت سے ایران کے عظیم فاتح کے

ٹائون تک صرف یہ آواز پہنچانا چاہتا ہے کہ میں بارمان چکا ہوں۔ اور یہ امید ہمارا آخری سہارا ہے کہ شاید وہ

ایک گزے ہوئے دشمن پر استغری ضرب لگانے کی ضرورت محسوس نہ کریں۔“

”مجھے معلوم نہیں کہ وہ کان جو تواروں کی جھنکار اور زخمیوں کی چیخیں سننے کے عادی ہو چکے ہیں تمہاری نڈر

سے کہاں تک متاثر ہوں گے۔ بہر حال میں تمہارے قیصر کو مایوس نہیں کروں گا۔ لیکن تمہارے ساتھی

کب آئیں گے۔“

”شاید وہ آ رہے ہیں۔“ عاصم نے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ان کی نگاہیں سمندر کی طرف بندول ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد کشتی کنارے کے قریب پہنچ چکی تھی۔

دلیں اور اس کے سامنے کیے بعد دیکھتے کشتی سے اترے۔ کلاڈیوس اور اصرہم نے آگے بڑھ کر ان کا تیرہ قدم کیا۔ لیکن سین الاڈ کے سامنے کھڑا رہا کشتی سے اترنے والے کچھ دیر دینی زبان میں مہم اور کلاڈیوس کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد آگے بڑھے۔ ایک طویل قامت آدمی جو ایک بھاری قبائلیوں کا اپنے ساتھیوں سے دو قدم آگے تھا سین نے آگ کی روشنی میں اس کے پر وقار چہرے پر نگاہ ڈالی اور مہوت سا ہو کر رہ گیا۔

کلاڈیوس نے کہا: ”جناب یہ ہمارے شہنشاہ ہیں۔“

سین نے منظر اسی حالت میں دو زانو ہو کر ہرقل کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور پھر اٹھ کر ادب سے سر جھکاتے ہوئے کہا: ”عاجیہ! آپ کو یہاں آنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں آپ سے ملاقات کیے بغیر کسرے کے پاس جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اب آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں کسی تاخیر کے بغیر کسرے کی خدمت میں حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ اور مجھے معلوم ہے کہ وہاں پہنچ کر مجھے کیا کرنا ہے۔“

ہرقل نے کہا: ”اگر قدرت کو ہماری بھلائی مقصود ہے تو ہمیں یقین ہے کہ آپ اپنی مہم میں کامیاب ہوں گے۔ ہمیں صرف اس بات کا ملال ہے کہ ہم اس سے قبل آپ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔“

سین نے کہا: ”مجھے کسرے کا یہی حکم تھا کہ میں صلح کے لیے کوئی گفتگو نہ کروں۔ اور یہ بات میرے دہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ آپ کی طرف سے ایک ایسا آدمی صلح کا پیغام بر بن کر آئے گا جسے دیکھ کر میں اپنے شہنشاہ کی حکم عدوی پر آمادہ ہو جاؤں گا۔“ یہاں میرا ایک چھوٹا سا خیمہ آپ کی شان کے نشانیاں ہیں۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ آپ خود تشریف لارہے ہیں تو میں اس سے کوئی بہتر انتظام کرتا۔ بہر حال اب آپ وہیں تشریف لے چلیں۔“

ایک سفید ریش بزرگ صورت آدمی نے کہا: ”خدا نے آپ کو ایک عظیم کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ آپ اس حاکم کی منشا پر چل رہے ہیں جس کے سامنے دنیا کے کسی حکمران کو سر اٹھانے کی مجال نہیں۔ دنیا کے

یوں مظلوم اور بے بس انسانوں کی دعائیں آپ کے ساتھ ہوں گی۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ ناکام نہیں لوٹیں گے۔ یہ عمر سیدہ آدنی قسطنطنیہ کا استقباط عظیم سر جس تھا اور سین کو اسے پہچاننے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ ”اچھا! دو زانو ہو کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔“ مقدس باپ میرے لیے دعا کیجیے۔ میں یقین اور اعتماد کی نعمتوں سے محروم ہو چکا ہوں۔ اور مجھے معلوم نہیں کہ میری منزل کہاں ہے؟“

سر جس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”میرے بیٹے! میں دعا کرتا ہوں کہ باپ بیٹا اور رُوح اللہ میں تمہاری راہنمائی کریں۔ اور تم ستم رسیدہ، مایوس اور بددل انسانوں کو امن کا پیغام دے سکو۔“

سین اٹھ کر ہرقل سے مخاطب ہوا: ”چلیے عاجیہ! یہاں ایک چھوٹا سا خیمہ آپ کے شانیاں نشان تو نہیں۔ بہر حال وہاں ہم زیادہ اطمینان سے باتیں کر سکیں گے۔“ ہرقل نے کہا: ”چلیے، لیکن میں زیادہ دیر آپ کے پاس نہیں ٹھہر سکوں گا۔ طلوع سحر سے قبل میرا دل اس پہنچ جانا ضروری ہے۔“

خونڈی دیر بعد وہ خیمے کے اندر داخل ہوئے۔ اور سب لوگ ادب کے ساتھ ہرقل کے سامنے بیٹھ گئے۔ خیمے کے اندر کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ بالآخر سین نے کہا: ”عاجیہ! موجودہ حالات میں صرف آپ کے ایلچی کو کسرے کے دربار تک پہنچانے کا ذمہ لے سکتا ہوں۔ لیکن میری سب سے بڑی الجھن یہ ہے کہ صلح کے لیے کسرے کی شرائط بہت سخت ہوں گی۔ میں ایک سپاہی کی حیثیت میں انہیں یہ سمجھانے کی ہر امکانی کوشش کروں گا کہ ہمارے لیے جنگ کی طوالت سود مند نہیں ہوگی۔ لیکن صلح کی شرائط کو نرم کرنا یا آپ کے لیے قابل قبول بنانا میرے بس کی بات نہیں ہوگی۔“

”یہ بات ہمیں معلوم ہے اور ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے کہ ہمارے ایلچی کو کسرے کے سامنے ہمارے اسامات کی ترجمانی کا موقع مل جائے۔ موجودہ حالات میں ہمارے ایلچی کو ہمارے شہنشاہ سے رحم کی جھبک مانگتے ہوئے بھی شرم محسوس نہیں ہوگی۔ اور ہم اسے بہر قیبت پر صلح کرنے کے مکمل اختیار رات دیکر آپ کے ساتھ روانہ کریں گے۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ یہاں سے کب تک روانہ ہوں گے۔“

سین نے جواب دیا: ”میں دو دن کے اندر اندر تیار ہو جاؤں گا۔ اور اس عرصہ میں آپ اپنے ایلچی کو میرے پاس بھیج سکتے ہیں۔“

ہرقل نے ایک صحراؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا اپنی مہیاں موجود ہے۔ ان کا نام سامن ہے۔ میرے انتہائی قابل اعتماد دوست ہیں۔ میں تمہارے سامنے انہیں یہ ہدایت کرتا ہوں کہ ایران کے ساتھ صلح کرنا ہمارے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور ہم اس کے لیے آخری حد تک جانے کے لیے تیار ہیں۔ کلاڈیوس اور ولیریس بھی اس کے ساتھ جائیں گے۔ کسرے کے لیے چند تحائف ہماری کشتی میں پٹے ہوئے ہیں۔“ سین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”اگر یہ لوگ ناکام لوٹے تو میرا انجام بھی شاید زیادہ قابل رشک نہ ہو میں آپ سے صرف یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ آپ آبنائے باسفورس کے پار میری بیوی اور بیٹی کو بچھپانے کے لیے کوئی جگہ دے سکیں گے۔“

ہرقل نے جواب دیا۔ ”اگر یہ لوگ ناکام لوٹے تو آبنائے باسفورس کے پار ہمارا کوئی شہریا سستی محفوظ نہیں ہوگی۔ اگر ایرانیوں کی تلواریں ہماری شاہرگ تک نہ پہنچ سکیں تو شمال مغرب سے وحشی قبائل ہمیں اپنے گھوڑوں تلے روند رہے ہوں گے۔ اگر خدا نے ہمیں نکل تباہی کے لیے پیدا نہیں کیا تو یہ لوگ ناکام نہیں لوٹیں گے۔ اب صرف پردیز کی انسانیت اور رحم دلی ہم سب کا آخری سہارا ہے۔ اور اگر پرویز اس درجہ مغرور ہو چکا ہے کہ ہم ہار مان کر بھی اسے متاثر نہیں کر سکتے تو ہمیں یہ دعا کرنی چاہیے کہ خدا ہمارے لیے موت کے دروازے کھول دے اور ہمیں ذلت اور رسوائی کی اس زندگی سے نجات دے۔“

”نہیں نہیں۔“ سر جیس نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔ ”ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ فیصہ کو ظلم کی ان اندھی طاقتوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کی ہمت دے۔ جو برسوں سے قدرت کے انتقام کو پکار رہی ہیں۔ جب ظلم اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو بالآخر قدرت کی آن دیجی اور ان جاتی قومیں ایک ایسے طوفان کی طرح نمودار ہوتی ہیں جو سنگسار چٹانوں کو تنگوں کی طرح پیلے جاتا ہے۔ خدا کسی بے بس اور مجبور انسان کو یقین اور ایمان کی نعمتوں سے سرفراز کرتا ہے اور اس کے کمزور ہاتھ ظالم اور جاہل شہنشاہ کے تاج فوج لیتے ہیں۔ اگر کسریٰ کے ساتھ صلح کی تمام تدبیریں ناکام ہو جائیں تو ہمیں صرف یہ دعا کرنی چاہیے کہ خدا فیصہ کو ایک ایسے حکمران کی ذمہ داریوں سے عمدہ برآ ہونے کی توفیق دے۔ جن پر لاکھوں انسانوں کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔“

ہرقل نے سین سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”آپ پرویز کو میری طرف سے یہ پیغام دے سکتے ہیں کہ اگر میرے لیے ایران کے راستے بند نہ ہوتے اور مجھے یہ اطمینان ہوتا کہ میرا احترام شکست اسے رحم پر آمادہ کر سکتا ہے تو میں ننگے سر اس کے دربار میں حاضر ہونے سے دریغ نہ کرتا۔ اب میں ایک چور کی طرح اس کے سپہ سالار تک رسائی حاصل کی ہے۔ لیکن اگر میرا یہ اقدام اس کے غرور کی تسکین کے لیے کافی نہ ہو تو میں اپنی درمی سہی سلطنت کی مکمل تباہی دیکھنے کی بجائے اس کے سامنے سرنگوں ہونا زیادہ آسان سمجھتا ہوں۔ میں کسرے سے اپنے کھوتے ہوئے علاقے واپس نہیں جانا چاہتا۔ میری درخواست صرف یہ ہے کہ آبنائے باسفورس کے پار میری درمی سہی سلطنت کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ میں اطمینان سے خود بخوار قبائل کا سامنا کر سکوں۔“

سین نے کہا۔ ”میں نے آپ کے اچھے کو کسرے کے دربار میں پیش کرنے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ اولاً میں اسے پورا کروں گا۔ پھر اگر مجھے اپنی طرف سے کچھ کہنے کا موقع ملا تو میری کوشش یہی ہوگی کہ کسرے آبنائے باسفورس عبور کرنے کا ارادہ ترک کر دے لیکن اپنی کامیابی کے متعلق میں بہت زیادہ پر امید نہیں ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ جو سی کاہن میرے عوام کے متعلق سنتے ہی ایک طوفان کھڑا کر دیں گے۔ تاہم میں آپ کے ساتھ ایک وعدہ کر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر مجھے اس ہم میں ناکامی ہوئی تو آپ مجھے ایرانی لشکر کے سپہ سالار کی حیثیت سے اس محاذ پر نہیں دیکھیں گے۔“

ہرقل نے کلاڈیوس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میرے خیال میں ہماری ملاقات کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ میں اب سین سے کچھ اور کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تم جہاز سے نجات کا صندوق لے آؤ۔ ہمارے لیے طلحہ صحرا سے قبل واپس پہنچنا ضروری ہے۔“

کلاڈیوس نے حاصم کی طرف دیکھا اور وہ دونوں اٹھ کر نیچے سے باہر نکل گئے ایک ساعت بعد ہرقل نے کشتی پر سوار ہو کر اپنے جہاز کا رخ کیا۔ سین کچھ دیر سمندر کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر جب کشتی رات کی تاریکی میں درپوش ہو گئی تو اس نے سامنے کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”میرے خیال میں اب ہمارے لیے قلعے میں پہنچ کر آرام کرنا بہتر ہوگا۔ آپ کے لیے گھوڑے موجود ہیں اور میرے آدمی آپ کا سامان لے آئیں گے۔ آپ کو اتنی جگہ آرامی کے بعد سفر کرنے میں تکلیف نہیں ہوگی۔“

سائمن نے جواب دیا۔ ”ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی“

سین نے ایک سپاہی کو گھوڑے لانے کا حکم دیا اور پھر چند ثانیے توقف کے بعد سائمن سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے آپ سے کوئی یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کہے گا کہ آپ کون ہیں۔ تاہم جب تک آپ کسرے کے سامنے پیش نہیں ہوتے۔ آپ کو ہر ممکن احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ آپ اناطولیہ کے یہودی تاجروں کے جھیس میں میرے ساتھ سفر کریں گے۔ آپ کے لیے مناسب لباس کا انتظام کر دیا جائے گا“



فسطینہ قلعے کی فصیل پر کھڑی باہر کی سمت بیٹوں اور دادیوں میں بل کھاتی ہوئی شکر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک حدنگاہ پر ایک ٹیپے کی اوٹ سے چند سوار نمودار ہوئے اور اس کی ساری حیات سمٹ کر نکلا ہوں میں آگئیں۔ کچھ دیر بعد اچانک اس کا مغموم چہرہ مسرت سے چمک اٹھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ عاصم انکے ساتھ تھا۔ اس کی رات بھر کی دعائیں قبول ہو چکی تھیں اور وہ نشکر کے آنسوؤں سے جھگی ہوئی مسکراہٹوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ نیچے اترنے کے امداد سے زینے کی طرف بڑھی۔ اچانک کچھ سوچ کر رک گئی۔ پھر وہ اپنی حرکت بوج کے ایک ستون کی آڑ سے باہر بھاگنے لگی۔ سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے قلعے کے اندر داخل ہوئے تھوڑی دیر بعد فیروز ہا پنتا ہوا زینے سے نمودار ہوا۔ اور اس نے کہا ”بیٹی وہ آگئے ہیں۔ عاصم بھی ان کے ساتھ ہے اور تمہاری امی تمہیں بلاتی ہیں۔“

فسطینہ فیروز کے ساتھ نیچے اتری تو سین رہائشی مکان کے برآمدے میں کھڑا اس کی مال سے کہہ رہا تھا ”میرے مہمان بھوکے ہیں۔ آپ فوراً کھانا بھجوانے کا انتظام کریں اور اگر آپ نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا تو ہم سب ایک جگہ بیٹھ کر کھائیں گے۔“

یوسبیا نے کہا ”ناشتا تیار ہے اور ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے“

”فسطینہ کہاں ہے؟“

”وہ آپ کے پیچھے کھڑی ہے۔“

سین نے مرکز دیکھا اور فسطینہ آگے بڑھ کر اپنے باپ سے پرٹ گئی۔

یوسبیا نے سوال کیا۔ ”آپ نے عاصم کو فسطینہ کیوں نہیں بھیجا؟“

”اُسے وہاں بھیجنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ رات قیصر سے میری ملاقات ہو گئی۔“

”کہاں؟“

”سندر کے کنارے میرے خیمے میں ان کی آمد خلاف توقع تھی۔ دن میں ان کے لیے کوئی بہتر انتظام کرنا۔ اور“

تین ہی اپنے ساتھ لے جانا۔ اب تم ان کے ایلچی سے ملاقات کرو گی۔ اور میں دو تین دن کے اندر اندر ان کے ساتھ دست گرد روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ میرے ساتھ نہیں جا سکیں گی۔ اور میرا ارادہ تھا کہ عاصم کو آپ کے پاس چھوڑ دوں لیکن وہ میرے ساتھ جانے پر رضد ہے اور میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ شاید سفر میں مجھے اس کی ضرورت پڑے۔ دوڑے حالات میں میرے لیے عاصم سے زیادہ قابل اعتماد ساتھی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ یہاں چھوڑ کر جانا میرے لیے بے حد صبر آزما ہو گا۔ لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایران کی نسبت یہ جگہ تمہارے لیے زیادہ محفوظ ہو گی۔ اور ویسے ہی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ میں تم کو ساتھ لے جا کر جو سی کاہنوں کو چرانے کی کوشش نہ کروں۔ اب تم کھانا لگو اور میں مہمانوں کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔“

سین یہ کہہ کر واپس ہٹا۔ اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا مہمان خانے کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد سین اور مہمان دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یوسبیا اور فسطینہ کمرے میں داخل ہوئیں اور وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ فسطینہ اپنی مال کے احاطہ پر اپنا بہترین لباس پہن کر آئی تھی اور رویوں کی مرعوب اور خاموش نگاہیں اسے خراج تحسین پیش کر رہی تھیں۔

سین نے رومی مہمانوں سے ان کا تعارف کرانے کے بعد یوسبیا کو اپنے دائیں اور فسطینہ کو بائیں ہاتھ بٹھایا۔

فسطینہ کھانے کے دوران کبھی کبھی در دیدہ لگاہوں سے عاصم کی طرف دیکھتی اور اس کے خوبصورت چہرے پر

یالک مرغی دوڑ جاتی۔ یوسبیا دسترخوان پر بیٹھی تھی ہی اپنے رومی مہمانوں سے بے تکلف ہو چکی تھی۔ بار بار اس بات پر

ہلانہا افسوس کر رہی تھی کہ وہ قیصر اور استغف اعظم کی قدم بوسی کی سعادت حاصل نہ کر سکی۔

ممالک کلاڈیوس نے فسطینہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”مجھے آپ سے مل کر جو خوشی حاصل ہوئی ہے وہ میں سبانی

میں کر سکتا۔ ایک اجنبی ہونے کے باوجود میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے متعلق آپ کے والدین اور عاصم کے بچہ میری معلومات سب سے زیادہ ہیں۔“

عاصم نے اپنے دل میں ناخوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔ اور وہ سراپا احتجاج بن کر کلاڈیوس کی طرف دیکھنے لگا اس نے عاصم کی طرف توجہ دینے بغیر اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”بالیوں سے لے کر صحرائے فوہنگ اور پھر فوہنگ سے قسطنطنیہ تک ہمارا سفر بہت طویل تھا۔ ہم نے سینکڑوں دن اور سینکڑوں راتیں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے گزار دی ہیں۔ اور عاصم کی گفتگو کے بہت کم لمحات آپ کے ذکر سے خالی ہوتے تھے۔“

یو سیسیا مضطرب ہو کر کبھی اپنے شہر اور کبھی عاصم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تاہم سین کے پھرے سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اچانک فسطیہ نے گردن اٹھائی اور ایک غیر متوقع اطمینان کے ساتھ کہا۔ ”آپ کے دوست کو ہمارے ساتھ باتیں کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تاہم آپ ہمارے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ ان کی بیشتر گفتگو آپ کے متعلق تھی۔ ہمارے لیے فرس اور ان کی بیٹی بھی اجنبی نہیں۔“

دلیریں تے قدرے برأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھی عاصم کا دوست ہونے کا فخر حاصل ہے لیکن مجھے دوسرے کاموں نے مجھے قابل ذکر نہیں سمجھا ہو گا۔“

فسطیہ مسکرائی۔ ”نہیں، میں آپ کے متعلق بھی بہت کچھ سن چکی ہوں۔“
سین نے اپنی بیوی کی پریشانی سے متاثر ہو کر کہا۔ ”ہم عاصم کے شکر گزار ہیں کہ اس نے بدترین حالات میں بھی ہمیں ظر موش نہیں کیا۔“

کلاڈیوس نے کہا۔ ”آپ کو فراموش کرنا عاصم کے بس کی بات نہ تھی۔ بیماری کے ایام میں ان کی باتوں سے مجھے بار بار ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کے ساتھ ان کا رشتہ فقط آپ کی یاد تک محدود ہے۔ بحری سفر کے دوران میری بیوی مجھ سے اکثر یہ کہا کرتی تھی کہ وہ لوگ جو عاصم کو اس قدر عزیز ہیں یقیناً عام انسانوں سے مختلف ہوں گے۔ اور آپ کو دیکھ کر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔“

عاصم انتہائی اضطراب کی حالت میں کلاڈیوس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن کلاڈیوس اس کی نگاہوں کے خلاف مشورت کی طرف توجہ دینے کی بجائے اپنے میزبانوں کو اور زیادہ متاثر کرنے کے لیے عاصم کے ساتھ اپنی رفاقت

کے ایام کے مختلف واقعات سنا رہا تھا۔ بالآخر عاصم نے کہا۔ ”میرے خیال میں اب ہم سب کو آرام کی ضرورت ہے۔ تیار رہ لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔“

تھوڑی دیر بعد مہمان خانے کے ایک کمرے میں عاصم کو نہانی میں کلاڈیوس سے باتیں کرنے کا موقع ملا، تو اس نے برجستگی سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو سین کے سامنے میری بیچارگی اور بے بسی کی تصویر کھینچنے کی ضرورت نہ تھی۔“

کلاڈیوس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”عاصم میں نے صرف ایک دوست کا فرض ادا کیا ہے اور نہیں یہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ وہ لوگ میری باتوں سے کوئی غلط نتیجہ اخذ کریں گے۔ سین ایک حقیقت پسند آدمی ہے اور وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ تمہارے متعلق اس کی بیٹی کے جذبات کیا ہیں۔ آج چند باتوں سے مجھے یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ اب میں ان کے ساتھ تمہارے اور فسطیہ کے مستقبل کے متعلق کھل کر بات کر سکتا ہوں۔“
”تم ان سے کیا کہنا چاہتے ہو؟“ عاصم نے اور زیادہ مضطرب ہو کر سوال کیا۔

”میں ان سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عاصم اور فسطیہ ایک دوسرے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔“
”نہیں نہیں، ابھی ان باتوں کا وقت نہیں آیا۔ میں اس وقت سین کی بیٹی کو ایک ویلان دنیا اور غیر متعلق مستقبل کے سوا اور کیا دے سکتا ہوں؟“

”تم اپنے دل کی دشمنوں میں اس کے لیے وہ عیش و عشرت کی تعمیر کر سکتے ہو جو ایک عورت کو مر مر میں ایرانوں سے زیادہ دلکش محسوس ہوتے ہیں۔ اور فسطیہ جسے میں نے آج دیکھا ہے ایران کے سپہ سالار کی بیٹی ہونے کے باوجود صرف ایک عورت تھی۔ وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے قیصر اور کسرے کے سارے خزانے تمہارے قدموں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور اس کے والدین یہ جانتے ہیں کہ وہ تمہارے سوا کسی اور کی طرف نہیں دیکھے گی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج تک ایران کا کرنی شہزادہ اُسے اپنے محل میں جگہ دے چکا ہوتا۔“

عاصم نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”میں ڈرتا ہوں کلاڈیوس۔“
”تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ فسطیہ تمہیں شکر دے گی؟“
”نہیں۔“

”تم سین سے ڈرتے ہو؟“

”نہیں نہیں، کلاڈیوس! میں صرف اپنے مقدر سے ڈرتا ہوں۔“

”میرے دوست تمہارا مقدر تین رات کی بھیناک تارکیوں سے نکال کر صبح کی روشنی میں لے آیا ہے اور اب تمہیں بند کر کے مستقبل کا راستہ ٹوٹنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم مجھے اجازت دو تو میں سین سے بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”میں نہیں منع نہیں کر سکتا۔ لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ابھی اس موضوع پر سین سے گفتگو کا وقت نہیں آیا۔ اگر ہم اس ہم سے کامیاب ہو کر واپس آئے تو میں کسی جھجک کے بغیر سین کے سامنے ہاتھ پھیلا سکوں گا۔“

سین دو دن آبنائے باسنورس کے کنارے اپنے مستغفر کا معائنہ کرنے اور فوج کے افسردہ کو ضروری ہدایت دینے میں مصروف رہا۔ تیسرے روز نروب آفتاب کے وقت اس نے واپس پہنچتے ہی کلاڈیوس اور اس کے ساتھیوں کو اطلاع دی کہ ہم علی الصباح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔

چنانچہ اگلے روز طلوع آفتاب سے ایک ساعت قبل عاصم اور اس کے ساتھی ایرانی سواروں کے ایک دستہ کے ساتھ قلعے کے دروازے پر کھڑے سین کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک فیروز بھاگتا ہوا آیا۔ اداس نے عاصم سے کہا۔ ”آقا آپ کو بلاتے ہیں۔“ عاصم کچھ کے بغیر فیروز کے ساتھ ہویا۔ سین قلعے کے اندر اپنے رہائشی مکان کے باہر سے اپنے کھڑا اپنی بیوی اور بیٹی سے الوداعی باتیں کر رہا تھا۔ عاصم اس سے چند قدم دور رک گیا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے قریب بلاتے ہوئے کہا۔ ”عاصم! میں نصحت ہونے سے پہلے اپنی بیوی اور فسطینہ کی موجودگی میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کل تک میرا ہی خیال تھا کہ میں اس ہم سے فارغ ہونے کے بعد فسطینہ کے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کر لوں گا۔ لیکن رات بھر سوچنے کے بعد میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شاید مجھے وہاں روک لیا جائے اور میں جلد واپس نہ آسکوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس ہم کے نتائج سرسبز ہماری توقعات کے خلاف ہوں۔ اور میرے لیے واپسی کا راستہ ہمیشہ مسدود ہو جائے۔ ویسے بھی میری عمر کے آدمی کو اپنے حصہ کا کام ادا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس لیے میں نصحت ہونے سے پہلے تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس دن تم واپس آئے تھے میں نے اسی دن فیصلہ کر لیا تھا کہ فسطینہ تمہاری ہے۔ اور اگر تم مجھے صلح کے اہلی کی حیثیت سے دست برد

رخ کرنے پر آمادہ نہ کرتے تو آج اپنی بیٹی کی شادی میری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہوتا اور میں تم سے صرف پوچھتا کہ روئے زمین کا وہ کونسا گوشہ ہے جہاں تم امن اور سکون کی زندگی بسر کر سکتے ہو۔ اب میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ کسریٰ کے دربار سے امن اور سکون کے متلاشیوں کے لیے یہ خوش خبری لیبر اؤں کی یہ دنیا تمہاری ہے اور اس کی ساری مسرتیں تمہارے لیے ہیں۔ لیکن اگر میری یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو میرے لیے زندگی کا آخری اطمینان یہ ہو گا کہ ان کی حفاظت کے لیے ایک قابل اعتماد ساتھی اور دوست دار دست موجود ہے۔ عاصم میں تم سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ اگر کسی آزمائش کا وقت آیا تو تم فسطینہ اور اس کی ماں کو واپس نہیں کر دو گے۔ اور یہ تمہارے ضمیر کی روشنی میں اپنے لیے سلامتی کا راستہ تلاش کر سکیں گی۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ اپنی شہرت اور ناموری کے لیے زندہ رہنے کی کوشش کی ہے لیکن آج جب کہ میں اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں، مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ میں موت کے دروازے پر دستک دے رہا ہوں۔ عاصم میرے ساتھ وعدہ کر دو کہ اگر مجھے کوئی خطرہ پیش آیا تو تم ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرو گے اور میری بیٹی کو زندگی کی وہ رانچیں عطا کر سکو گے جو میں کسرے کا دوست اور یاران کا سپہ سالار ہونے کے باوجود عطا نہیں کر سکتا۔“

سین کی گفتگو کے دوران عاصم کی آنکھیں بند تریج آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔ اور پھر جب اس نے جواب دینے کی کوشش کی تو الفاظ کی بجائے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اس کی ترجمانی کر رہے تھے۔ اس نے فنگر اور احساس نامندی کے علاوہ بے بسی اور بے چارگی کے احساس سے مغلوب ہو کر کہا۔ ”میں یہ سمجھتے سے قاصر ہوں کہ کسرے کے دربار میں آپ کو کیا خطرہ پیش آ سکتا ہے۔ تاہم میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ فسطینہ اور اس کی والدہ کو مجھ سے کسی بدعہدی، بے وفائی یا بزدلی کی شکایت نہیں ہوگی۔“

”میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“ سین یہ کہہ کر اپنی بیوی اور فسطینہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اب مجھے صرف تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔“

”خدا آپ کے ساتھ ہو، ویسے ہی اللہ نے زندگی ہونی آواز میں کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی چھلکتی ہوئی آنسوؤں سے آنسو اُڑ آئے۔“

فطینہ نے اپنی ماں کے الفاظ دہرائے اور سسکیاں لیتی ہوئی اپنے باپ سے لپٹ گئی۔ ”ابا جان !
 میں آپ کا انتظار کروں گی۔ آپ ضرور آئیں گے۔ شہنشاہ آپ کا دشمن نہیں ہو سکتا۔“
 مخوڑ می دیر بعد سین اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر ایران کا رخ کر رہے تھے۔

باب ۳

یہ روز اپنے عروج کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اس کی عظیم سلطنت، بحیرہ اسود سے لے کر صحرائے فوج اور کوہ البر سے لے کر شمالی پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے پرانے دارالسلطنت مدائن کے ساتھ اس کی زندگی کی چند تلخ داستانیں وابستہ تھیں۔ اور وہ اس پر رونق شہر کو اپنے لیے منحوس خیال کرتا تھا۔ چنانچہ آرمینیا، شام اور فلسطین میں اپنی فتوحات کے پرچم گاڑنے کے بعد اس نے وجہ کے پار، مدائن سے کوئی ساٹھ میل شمال کی طرف اپنے لیے ایک نئے دارالحکومت کی تعمیر شروع کر دی تھی۔ اس نئے شہر کا نام دست گرد تھا اور کسرنے نے مفتوحہ ممالک کے مال غنیمت اور باجگزار ریاستوں کے خراج سے جو خزانے جمع کیے تھے وہ دست گرد کی تعمیر پر صرف ہو رہے تھے۔ اس کے پاس ان قبیلوں کی کمی نہ تھی جو فن تعمیر میں طیبہ، بابلین، روم، ایتھنز اور بعلبک کی عظمت رفتہ کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان قبیلوں کے خون، پسینے اور آنسوؤں اور ان کے لٹے ہوئے شہروں کی دولت سے کجگلاہ ایران اپنے لیے وہ عظیم عشرت کدہ تعمیر کر رہا تھا، جس کے سامنے پرسی پولس اور مدائن کے محل بے حقیقت نظر آتے تھے۔ دست گرد کے عظیم محل کی دست، دکھی اور رعنائی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ سنگ مرمر کے چالیس ہزار ستون جو سونے چاندی اور ہاتھی دانت سے مزین تھے، اس کی چھتوں کو سارا دے رہے تھے۔ دیواروں کے ساتھ تیس ہزار تصویریں آویزیں تھیں۔ بڑے گنبد کی چھت کے ساتھ ایک ہزار ستہری فانوس جھللاتے تھے۔ تہ خانے کے ایک سو کمرے صرف قیمتی لباس اور سونے، چاندی اور جواہرات کے خزانوں کے لیے مخصوص تھے۔ اس محل کی چار دیواری کے اندر بارہ ہزار غلام اور خدمت گزار موجود تھے اور تین ہزار وہ حسین و جمیل لڑکیاں تھیں جنہیں مفتوحہ ممالک سے جمع کیا گیا تھا محل سے باہر چھ ہزار مسلح سوار ہر وقت پہرہ دیتے تھے۔ شاہی رعب و جلال کی نمائش کے لیے نو سو ساٹھ ہاتھیوں

سے کام لیا جاتا تھا۔ اردگرد میلوں تک زرخیز زمین کو باغات اور شکار گاہوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اور ان پر بیخ شکار گاہوں میں انواع و اقسام کے وہ پرندے اور جانور جمع کیے گئے تھے، جن کے شکار سے پر دیر کبھی کبھی اپنا پیٹ بھلایا کرتا تھا۔ ایران کا مغرب اور میانش حکمران جب کبھی دست گرد سے باہر نکلتا تھا تو اس کے سفر کا سامان بارہ ہزار اونٹوں پر لادا جاتا تھا۔

غرض ایران کے اس نئے دارال حکومت یا ایرانی حکمران کے اس بے مثال مشنرت کدے کے اندر اور باہر وہ سب کچھ موجود تھا جس کی ایک جاہر حکمران کو تینا ہر سکتی تھی۔ اور جو ایک مظلوم اور بے بس رعایا اسے دے سکتی تھی۔ قہر شاہی سے باہر دست گرد کی بیشتر آبادی محفوظ فوج کے سپاہیوں اور حکومت کے عہدے داروں پر مشتمل تھی۔ اور کسرے اس نئے دارال حکومت میں اپنے آپ کو ان با اثر امراء اور مجوسی کاہنوں کی سازشوں سے محفوظ پاتا تھا۔ جو دہان کے حوام کو اپنا آکر کار بنا کر حکومت کا تختہ الٹ دیا کرتے تھے۔ اس کے دل و دماغ پر اپنے باپ کے بوترناک انجام کا یہ اثر تھا کہ وہ دنیا کے کسی انسان کو میان تک کہ اپنے بیٹوں کو بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا تھا۔ حکومت کے انتہائی با اختیار افسر یا فوج کے بڑے بڑے جرنیل ایک دن اس کے دربار میں ہوتے کی کرسیوں پر رونق افروز دکھائی دیتے اور اگلے دن کسی ادنیٰ جاسوس کی شکایت پر قید خانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پہنچ جاتے۔ ایک دن ایک خوشامدی اپنی چرب زبانی کے بل بوتے پر اپنے حریفوں کو چھپاتا ہوا درباریوں کی اگلی صف میں جا کھڑا ہوتا اور اگلے دن اُسے کسی بڑے خوشامدی اور زیادہ چرب زبان کیلئے اپنی جگہ خالی کرنا پڑتی۔ غرض دست گرد کے امراء، کاہن اور اہل کار ایک دوسرے کے خلاف بقا کی جنگ لڑتے تھے۔ اور پر و پر جو صورت ان لوگوں کے اتحاد کو اپنے لیے خطرناک سمجھتا تھا پوری آزادی اور اطمینان کے ساتھ ان پر حکومت کر رہا تھا۔

یہ تھا جنھوں نے مصائب کے دور میں کسریٰ کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے گر جو جوشی سے بغل گیر ہو کر کسریٰ پر قدم کیا اور پھر کی ترقی کے بغیر ایک ہی سانس میں کئی سوال کر دیئے: ”آپ کیسے آئے؟ آپ کی جنگ کے متعلق یقیناً کوئی اہم خبر لائے ہوں گے۔ آپ کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں قبیلہ نے آپ کو واپس تو نہیں بلایا؟“

سین نے جواب دیا: ”میں ایک مزدوری کام سے آیا ہوں اور کسی تاخیر کے بغیر تہہ نہا کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔“

تورج، سین کا ہاتھ پکڑ کر ایک کشادہ کمرے میں لے گیا اور عمامہ ان کے پیچھے ہو لیا۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے اور تورج نے کہا: ”میں ابھی محل کے داروغہ کو اطلاع بھجوا دیتا ہوں۔ لیکن اگر آپ مجھ جگ سے کوئی بری اطلاع لے کر آئے ہیں تو میں آپ کو رات کے وقت انہیں پریشان کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ اس وقت وہ رقا صاؤں، گویوں اور نقالوں کے ساتھ جی بھلا رہے ہوں گے۔“

سین نے جواب دیا: ”اس وقت میں بھی آرام کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ محل کے داروغہ کو رجب کے وقت اطلاع دینا زیادہ موزوں ہوگا۔“

تورج نے سوال کیا: ”آپ نے مجھ جگ کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟“

”میں مجھ جگ کے متعلق کوئی نئی خبر لے کر نہیں آیا۔ ابھی تک آہٹائے باسوس ہمارے لشکر اور قسطنطنیہ کے درمیان حائل ہے۔“

”تو پھر آپ کی آمد میرے لیے ایک عمامہ ہے۔ آپ اپنی مرضی سے تشریف لائے ہیں یا کسریٰ نے آپ کو معافی کا حکم بھیجا تھا۔“

”میں اپنی مرضی سے آیا ہوں۔“

”معاف کیجئے میں آپ کے ساتھی کو پہچان نہیں سکا۔ یہ کون ہیں؟“ تورج نے عام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ ایک عرب ہیں۔ اومان کا نام ماصم ہے۔ یہ فلسطین اور مصر کی جنگوں میں ہمارا ساتھ دے



ایک شام سین اور عاصم اپنے رومی ساتھیوں کو دست گرد کے شاہی مہمان خانے میں چھوڑ کر کسرے کی محافظ فوج کے سپہ سالار تورج کی قیام گاہ میں داخل ہوئے۔ تورج سین کے ان پرانے دوستوں میں سے

چکے ہیں۔ اور میں ان کی دوستی پر فخر کر سکتا ہوں۔“

تورج نے کہا: ”معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئے۔“

عاصم نے کہا: ”میں قیصر روم کی طرف صلح امداد دہشتی کی پیشکش لے کر آیا ہوں۔ اس کے دلچسپ مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور کسری کے ساتھ ان کی ملاقات کے بعد دست برداری میں عمیر اکام ختم ہو جائے گا۔“

تورج کو اپنے کاؤن پر اعتبار نہ آیا۔ وہ کچھ دیر ایک سیکٹے کے عالم میں عاصم کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: ”قیصر کے دلچسپ مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور آپ نے انہیں شہنشاہ کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ داری قبول کی ہے؟“

”جی ہاں میں انہیں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔“

”میں اس سے بڑی حماقت کا تصور نہیں کر سکتا۔“

سین نے مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا: ”اگر یہ حماقت ہے تو اس کے نتائج سیر ذات تک محدود رہیں گے۔ میں کسی دوست کو اپنے جرم میں حصہ دار نہیں بناؤں گا۔ آپ یہ بھول جائیں کہ میں نے آپ سے قیصر کے ایچیوں کا ذکر کیا ہے؟“

لیکن شاہی مہمان خانے میں انہیں کیسے جو مل گئی؟“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ شاہی مہمان خانے کے منتظمین نے انہیں صرف تاجروں کے بھیس میں دیکھا ہے اور جو تاجر کسری کے لیے سخاوت لے کر آتے ہیں۔ ان کے متعلق زیادہ چھان بین نہیں کی جاتی۔“

”اور آپ کسری کو یہ اطلاع دینا چاہتے ہیں کہ یہ تاجر درحقیقت قیصر کے ایچی ہیں۔“

”ہاں اور آپ کی تلی کے لیے میں اپنی ہم کی تمام تفصیلات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔“

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ آپ میرے ملا دار ہیں۔ میں اپنے عزیز ترین دوست کو ان معاملات سے الگ تنگ رکھنا چاہتا ہوں۔“

”مہبت اچھا سنا ہے۔ شاید اس کے بعد میں آپ کو کوئی نیک مشورہ دے سکوں۔“

سین نے مختصراً قیصر کے ساتھ اپنی ملاقات کی روڈ بیان کر دی۔ لیکن احتیاطاً اس سارے

نصیے سے عاصم کا تذکرہ حذف کر دیا اور اس کی جگہ قیصر کے ایک ایچی کا نام لے دیا۔

جب اس نے اپنی روڈ ختم کی تو تورج کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھا اس کی طرف دیکھتا

رہا۔ بالآخر اس نے کہا: ”سین اگر میں اس وقت خواب نہیں دیکھ رہا اور تم واقعی میرے سامنے

بیٹھے ہوئے ہو۔۔۔ اگر قیصر کا کوئی ایچی تمہارے پاس تھا اور قیصر سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی تو

اگر تم مجھے اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھتے ہو تو میرا مشورہ ہے کہ تم جس راستے سے یہاں آئے ہو اسی

راستے واپس چلے جاؤ۔ میں بھی تمہاری طرح جنگ جاری رکھنے کے حق میں نہیں ہوں۔ ہم تسلطینہ کو فتح کرنے

کے لیے جتنے سپاہیوں کی قربانی دیں گے وہ ہمارے لیے کئی اور ملک فتح کر سکتے ہیں، لیکن کسری کے سامنے

امن اور صلح کی تجاویز پیش کرنا ایک حماقت ہے۔ کاش تمہیں یہ معلوم ہوتا کہ اس میں کتنی تبدیلی آچکی ہے

وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی نصیحت یا مشورہ سننا پسند نہیں کرتا۔۔۔ یہاں اجازت کے بغیر تمہاری

اگرچہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔“

سین نے اٹھتے ہوئے جواب دیا: ”مجھے انہوس ہے کہ میں نے یہاں آکر آپ کو پریشان کیا۔“

میں اب آپ کو تکلیف دینے کی بجائے مہمان خانے میں قیام کر دوں گا۔ اور یہ بات کسی پر ظاہر نہیں ہو

گی کہ میں یہاں آیا تھا۔ لیکن کسری کے پاس ضرور جاؤں گا۔“

تورج زخم خوردہ سا ہو کر اٹھا اور سین کا ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی کسری پر بٹھاتے ہوئے بولا: ”میرے

دوست! میرا یہ مطلب نہ تھا تم میرے پاس ٹھہرو گے۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ سمجھتے ہوئے

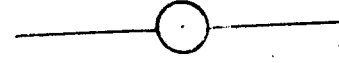
بھی تمہاری تائید کر دوں گا کہ تم غلطی کر رہے ہو۔“

عاصم نے جواب دیا: ”نہیں، ہم صرف اس شرط پر آپ کے پاس ٹھہریں گے کہ آپ اس

مسئلہ سے بے تعلق رہیں۔“

”اگر تمہاری خوشی اسی بات میں ہے تو مجھے یہ شرط منظور ہے۔“

تھوڑی رعبہ تلوگ ایک پر تکلف دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے اور توجہ اپنے درست کے ساتھ اس زمانے کی باتیں کر رہا تھا جب انھوں نے پردین کے ساتھ زراہ ہو کر دم کے ایک سرحدی تلے میں پناہ لی تھی۔



اگلے دن سین شاہی ایران کے ایک کشادہ کمرے میں اپنے فرمانروا کی مسند کے سامنے کھڑا تھا پردین کے دائیں اسی دو حسین و جمیل لوٹیاں سونے کی صراحی اور ساغر اٹھائے کھڑی تھیں۔ محل کا دروازہ چند اہل کار اور مسلح سپاہی سین سے چند قدم پیچھے دروازے کے قریب کھڑے تھے پردین نے کچھ دیر اپنی سفاک نگاہوں سے سین کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے دائیں طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا اور ایک لوٹیا نے سنہری طشت جس میں ازخانی شراب کا ساغر چھلک رہا تھا، آگے بڑھا دیا۔ پردین نے جواہرات سے مرصع ساغر اٹھا کر شراب کے چند گھونٹ پیئے اور اسے دوبارہ طشت میں رکھتے ہوئے سین کی طرف متوجہ ہوا۔

مجاہد تک ہمیں علم ہے تمہیں قسطنطنیہ فتح کرنے سے پہلے اپنا محاصرہ کرنے کی اجازت نہ تھی اگر ہماری ہم مدلی کی وجہ یہ ہے کہ تم کوئی خوشی کی خبر لائے ہو تو تمہیں کل یہاں پہنچنے ہی ہمارے سامنے پیش ہونا چاہیے۔ سین نے جھکتے ہوئے کہا۔ "عالیجاہ! یہ غلام آپ کی حکم مدلی کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لاسکتا میں ایک اہم خبر لایا ہوں۔ میں نے یہ عرس کیا تھا کہ میرا کسی ناخیر کے بغیر حضور کی قدم بوسی کیلئے حاضر ہونا ضروری ہے۔ پردین نے کہا: قسطنطنیہ کی فتح کے سوا ہمارے لیے کوئی اور خبر اہم نہیں ہو سکتی۔"

"عالیجاہ! میں شرمناک ہوں کہ میں قسطنطنیہ کی فتح کا مزدور لے کر نہیں آیا۔ لیکن میں آپ کو یہ خوشخبری دے سکتا ہوں کہ ہم نے جس مقصد کے لیے تلوار اٹھائی تھی وہ حاصل ہو چکا ہے۔ قبضہ بارمان چکھا ہے اور وہ مزید تباہی سے بچنے کے لیے ہماری ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہے۔ اگر اس کے لیے دست برد کارا سے مسدود نہ ہوتا تو وہ بذات خود یہاں پہنچ کر آپ سے صلح کی بھیک مانگتا۔"

کسریٰ کی حالت اس درد سے کسی تھی جو ذمہ کھانے کے بعد گہری نیند سے بیدار ہوا ہو۔ اس نے

بڑی شکل سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا: "ہم نے تمہیں قیصر کو یا بہ زنجیر یہاں لانے کا حکم دیا تھا اور تم اس کے ایچی بن کر آگے ہو۔ تمہیں یہ حرمت کیسے ہوئی؟"

"عالیجاہ! میں کئی سال کی ناکام کوششوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم آہنائے باسفور کا پانی ایرانی سپاہیوں کے خون سے سرخ کیے بغیر قسطنطنیہ پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ اگر اس جنگ کا مقصد ایران کا لوہا منوانا ہے تو ہمیں یہ مقصد حاصل ہو چکا ہے۔ اگر تیسرے ایران کے ایک ادنیٰ باغیزار کی حیثیت سے آپ کی پناہ میں آجائے اور اسے آپ کی شرائط منظور ہوں جو کسی شہت خوردہ دشمن کی شہ رگ پر تلوار رکھ کر نروائی جاسکتی ہے تو مجھے اسی جنگ جاری رکھنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا جس کے نتائج کے متعلق سر دست کوئی بات پرے لیتے ہیں کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ رومیوں کی موجودہ بے بسی کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شمال مغربی سرحدوں پر وحشی قبائل نے تباہی اُ۔ بربادی کا ایک طوفان بپا کر رکھا ہے اور وہ ہلاکت سے بچنے کیلئے ہماری پناہ میں آنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ وحشی ہمیشہ کے لیے ان کے دشمن بنے رہیں۔ قیصر ہم سے ایسے ہو کر ان کی طرف دیکھے گا اور یقین ہے کہ کسی دن وہ آپس میں صلح کر لیں اور ہمیں ان کی متحدہ فوج کا سامنا کرنا پڑے۔ شاید آپ کو یہ علم نہ ہو کہ ایرج جو خاقان کے پاس دوستی کا پیغام لے کر گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ کسریٰ نے اضطراب کی حالت میں ساتی کے طشت سے شراب کا جام اٹھایا اور جلدی سے خالی کرنے کے بعد کہا۔ "یہ ناممکن ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا، خاقان میں یہ حرمت نہیں ہو سکتی۔"

"عالیجاہ! اگر آپ کو یقین نہیں آتا۔ تو میں اس شخص کو آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں جس نے اپنی آنکھوں سے اسے قتل ہوتے دیکھا تھا۔"

"تم یہ سمجھتے ہو کہ ایرج کے قتل کی خبر سن کر ہم مرعوب ہو جائیں گے؟"

"نہیں عالیجاہ! میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ رومی اگر ہماری شرائط مان لیں تو ان پر احمقانہ کیا جاسکتا ہے لیکن اگر کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔"

پردین نے سوال کیا۔ "تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہر قتل ہماری تمام شرائط مان لے گا؟"

"عالیجاہ ہر قتل کے ایچی حضور کی قدم بوسی کے لیے یہاں پہنچ چکے ہیں اور وہ صلح کی شرائط طے کرنے

کے لیے مکمل امتیازات لے کر آئے ہیں۔“

کسریٰ کی دنگول کا سارا خون مٹھ کمر اس کے چہرے میں آگیا اور اس نے غصے اور اضطراب سے لرنڈی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”وہ کس طرح یہاں پہنچ گئے — وہ کہاں ہیں؟“

سین نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”عالیجاہ! وہ میرے ساتھ آئے ہیں اور شاہی مہمان خانے میں ٹھہرے ہیں۔“
کسریٰ کی نگاہیں سین سے مٹھ کمر اس سے چند قدم پیچھے محل کے داروغہ پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ لرنڈا ہوا آگے بڑھا اور سراپا التجا بن کر چلا آیا۔ ”عالیجاہ! میں بے قصور ہوں۔ مہمان خانے کے ناظم نے مجھے صرف یہ بتایا تھا کہ سپہ سالار کے ساتھ چند معمول تاجر آئے ہیں اور وہ جہاں پناہ کو تحائف پیش کرنا چاہتے ہیں۔“
کسریٰ کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ کچھ دیر بے حس بیٹھا سین کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے سوال کیا۔ ”تم کب سے قیصر کے ساتھ صلح کی بات کر رہے تھے اور تمہارے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اسے ہماری ہر شرط قبول ہوگی۔“

”عالیجاہ! اگر صرف قیصر کے ایلچی میرے پاس آئے تو میں انہیں منہ دگانے کی جرأت نہ کرتا۔ میں اس لیے یہاں حاضر ہوا ہوں کہ قیصر بذاتِ خود آپ کے اس ادنیٰ غلام کے پاس حاضر ہوا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے اس کا پسینا آپ تک پہنچانے میں کرنا ہی کی تو آپ شاید مجھے قابلِ معافی نہیں سمجھیں گے۔“

کسریٰ اٹھ کر کھڑا ہو گیا — ساتی نے جلدی سے آگے بڑھ کر شراب کا جام پیش کیا۔ لیکن اس نے غصے سے ہاتھ مارا اور سنہری جام چند قدم دور جا کر چند ٹلنے بعد دوبارہ مندر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”میرے پاس آیا تھا۔“
”ہاں عالیجاہ! میں جھوٹ نہیں کہتا۔ میری روانگی سے تین دن قبل ہند کے کنارے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔“
”جب وہ تمہارے پاس آیا تھا تو ہماری فوج کہاں تھی؟“

”فوج پڑاؤ میں تھی عالیجاہ! اور ہماری ملاقات پڑاؤ سے کچھ دور ہند کے کنارے ہوئی تھی۔“
”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ہر قتل کے ساتھ پہلے سے خفیہ ملاقات کا انتظام کر رکھا تھا۔“
”عالیجاہ! میں نے اس کے پلچوں کے ساتھ ملاقات کرنا قبول کیا تھا اور ہر قتل کو اس ملاقات کے بعد کر

نا آتا لیکن وہ انتظار نہ کر سکا اور رات کے وقت جب اس کے ایلچی میرے پاس پہنچے تو ہر قتل ان کے ساتھ تھا۔ اور تم اسے گرفتار نہ کر کے، تمہیں ہمارا یہ حکم یاد نہ رہا کہ ہم اسے پابندِ بخت دیکھنا چاہتے ہیں۔“
”عالیجاہ! وہ اپنے ہتھیار پھینک کر میرے پاس آیا تھا اور میں یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ ان حالات میں آپ اس کی گرفتاری پسند فرمائیں گے؟“

”اسے یہ اطمینان تھا کہ تم اسے گرفتار نہیں کرو گے؟“

”عالیجاہ! وہ یہ جانتا تھا کہ میں ایک شہنشاہ کا خادم ہوں اور میرا شہنشاہ ایک گے ہوئے دشمن پر ماتہ بٹانا پسند کرے گا۔“

”تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ ایک عیسائی عورت کے شوہر سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا — تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہر قتل کی محبت نے تمہیں ہمارا افسار بنا دیا تھا۔“
”عالیجاہ!“

”خاموش، تم ہمیں دھوکا نہیں دے سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ قسطنطنیہ اب تک صرف تمہاری غلامی کے باعث فتح نہیں ہوا۔ تم ابتدا سے اس جنگ کے مخالف تھے۔ ہم نے مقدس کاہنوں کے شہوہ کے خلاف تم پر اعتماد کیا اور تم نے ہمیں رعایا کے سامنے شکر سا دیا۔ اب تم واپس جا کر ہمارے دشمن سے اس غلامی کا صلہ حاصل نہیں کر سکتے۔“
سین نے سراپا التجا بن کر کہا۔ ”عالیجاہ! میں غدار نہیں ہوں۔ میرے بال آپ کی خدمت میں سفید ہوئے ہیں۔ میں نے دشمن کے کئی شہروں اور کئی قلعوں پر آپ کی فتوحات کے پرچم نصب کیے ہیں۔“

”خاموش!“ پروردین بلند آواز میں چلایا۔ ”اس غدار کو یہاں سے لے جاؤ۔ اس کی کھال آنا دو اور لاش مغربی دروازے سے باہر لٹکا دو اور دشمن کے جو جاسوس اس کے ساتھ آئے ہیں انہیں حراست میں لے لین۔“
سین کے عالم میں کھڑا تھا۔ کسریٰ کے سامنے پیش ہوتے وقت اسے یہ خدشہ ضرور تھا کہ وہ ٹھنڈے دل سے صلح اور امن کی باتیں نہیں سنے گا اپنی مہم کی ناکامی کی صورت میں وہ اپنے عہدے سے معزول ہونے کے بعد قیدی یا نظر بند ہونے کے لیے بھی تیار ہو کر آیا تھا۔ تاہم یہ امید اس کا آخری سہارا تھی کہ پروردین کا غصہ عارضی ثابت ہوگا۔ اور جب جنگ کی طوالت سے اکتائے ہوئے فوجی مشیر اور مصائب

دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پردیز جس کی قوت گویائی ستوڑی دیکھنے کے لیے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک لکپی لینے کے بعد چلایا۔ ”اسے لے جاؤ۔ اسے لے جاؤ اور ہمیں کسی تاخیر کے بغیر اطلاع دی جائے کہ ہمارے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے۔“

اکن کی آن میں سپا ہیروں کی تنگی تلواریں سین کے بدن کو چھو رہی تھی لیکن وہ اپنے گردوش سے بے پروا ہو کر پردیز کی طرف دیکھ رہا تھا اور مغرور بادشاہ کو اس کی نگاہیں اس کے الفاظ سے زیادہ خونخوار محسوس ہوتی تھیں۔ داروغہ نے سین کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا لیکن اس مرتبہ اس نے مزاحمت کی ضرورت محسوس نہ کی وہ مڑا اور نیچی تلواروں کے پہرے میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

پردیز کے دماغ میں ابھی تک سین کے الفاظ گونج رہے تھے اس نے اپنا سجاری تاج اتار کر ایک لوٹھی کے حوالے کیا اور کچھ دیر سوچ کر مٹھیا رہا۔ پھر اچانک چلانے لگا۔ ہمیں شراب دو۔ ہمیں اتنی شراب دو کہ ہم زندگی کے سارے غم بھول جائیں۔ ہمیں یہ خاموشی پسند نہیں۔ یہاں رقص و سرود کی محفل آراستہ کرو۔ اور شراب کے دریا بہا دو۔“

اور قریباً ایک ساعت بعد جب رقص و سرود کی یہ محفل اپنے شباب پر تھی، توجرج بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ رقصاؤں کے جھرمٹ سے گزر کر مرند کے قریب پہنچے ہوئے بولا: ”عالیجاہ! میں اس گستاخی کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن شہر میں کہرام مچا ہوا ہے اور میرے لیے یہ بات ناقابل یقین ہے کہ آپ سین کی موت کا حکم دے چکے ہیں۔“

پردیز نے مدہوشی کے عالم میں اس کی طرف دیکھا اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنا ہم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو!“

توجرج نے شراب کا جام اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ ”عالیجاہ! میں سین کیلئے حکم کی التجا لے کر آیا ہوں۔“

”وہ غدار ابھی تک زندہ ہے؟“

”عالیجاہ آپ اس کی جان بچا سکتے ہیں۔“

”اس کی جان اب کوئی نہیں بچا سکتا۔ تم یہاں بیٹھ جاؤ!“

اس کی تائید میں آواز بلند کریں گے تو وہ اس کی سبزیاں اتارنے پر مجبور ہو جائے گا۔ بدترین حالات میں بھی ایک وحشیانہ موت کی سزا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ وہ پردیز کی طرف اس بچے کی طرح دیکھ رہا تھا جسے طنزاً کھانے کے بعد پیار کی توقع ہو۔ سپاہی، داروغہ اور دوسرے افسر جو وہاں موجود تھے دم بخود ہو کر کھینچن اٹھیں پردیز کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اگر کسی اور کا معاملہ ہوتا تو وہ اس پر ہیکے دندوں کی طرح جھپٹ پڑتے لیکن ایرانی لشکر کا ایک بہادر برنیل اور پردیز کے بچپن کا دوست اس لیے ہی کی حالت میں بھی عام انسانوں سے مختلف دکھائی دیتا تھا۔

پردیز کے لیے یہ صورت حال غیر متوقع تھی۔ وہ چلایا۔ ”دیکھتے کیا ہو، اسے لے جاؤ۔“

وہ آگے بڑھے۔ داروغہ نے سین کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”چلیے!“

اور سین نے اچانک ایسا محسوس کیا کہ اس پر چاروں اطراف سے آگ کے دھکتے ہوئے انگاڑا کی بارش ہو رہی ہے اس نے داروغہ کا ہاتھ جٹک دیا اور بلند آواز میں چلایا۔ ”ہرگز کے بیٹے! میں تمہارا اس وقت کا ساتھی ہوں جب اس دنیا میں تمہارے لیے کوئی مہائے پناہ نہ تھی۔ تم میری کھال اترا سکتے ہو۔ میری بوٹیاں فوج تھے ہو لیکن مجھے یہ کہنے سے نہیں روک سکتے کہ تم ظالم ہو اور تمہارا انجام اپنے باپ سے مختلف نہیں ہوگا۔ تم ان کے دشمن اور انسانیت کے قاتل ہو اور مجھے مرتے وقت اس بات کا افسوس ہوگا کہ میں تمہارے مظالم میں شریک تھا۔ میں اس بھیت کے ساتھ مروں گا کہ میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر چکا ہوں۔ اور تم اس خوف اور اضطراب کے ساتھ زندہ رہو گے کہ زندگی کا ہر سانس تمہیں ایک عبرتناک تباہی کی طرف لے جا رہا ہے اور مرتے وقت تمہاری جینیں میری سسکیوں سے زیادہ دردناک ہوں گی۔ میں مستقبل کے اتنی پران آنڈھیوں کے آنڈ دیکھ رہا ہوں جو تمہاری سلطنت کو خس و خاشاک کی طرح اڑا لے جائیں گی۔ قانونِ قدرت میں ہر ظالم کی سزا کا دن موعین ہے اور تمہاری سزا کا دن دور نہیں۔ جس طرح سین کے لیے ایک وحشیانہ سزا کا حکم غیر متوقع تھا۔ اسی طرح سین کی یہ تقریر پردیز کے لیے غیر متوقع تھی۔ اس کا غصہ، اضطراب اور اضطراب خوف میں تبدیل ہوا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کیلئے ایسی بن چکے تھے۔ اور وہ ہر اسے گرفتار کرنے کے لیے آگے بڑھے تھے تہذیب کی حالت میں کبھی ایک اور کبھی

”عالیجاہ!“

”بلیٹہ جاؤ! یہ ہمارا حکم ہے اور تم جانتے ہو کہ ہماری حکم عدولی کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔“

تورج انتہائی اضطراب کی حالت میں منہ سے کچھ دوڑائیں طرف ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور پرویز نے کچھ دیر خاموشی سے اس کی طرف گھور گھور کر دیکھنے کے بعد کہا: ”تمہیں ہماری شراب پسند نہیں؟“
تورج نے جلدی شراب کا جام خالی کرنے کے بعد کہا: ”عالیجاہ! سین آپ کا جاننا ہے پرویز نے جھلا کر کہا۔ یہ ابھی تک سین کا ذکر کر رہا ہے اسے اور شراب دو۔“

ایک لونڈی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنی صراحی سے تورج کا خالی جام بھر دیا اور اس نے باول خواستہ چند اور گھونٹ پی لے۔

پرویز نے کہا: ”ہم تمہیں سین کی جگہ تسلطظنیہ کی مہم پر بھیج رہے ہیں لیکن یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں۔ تم جی بھر کر شراب پیو۔ پھر تمہیں سین کا خیال نہیں سٹائے گا۔ تمہیں یہ رقص پسند نہیں آیا۔“
”مجھے یہ رقص بے حد پسند ہے عالیجاہ! تورج نے یہ کہہ کر شراب کا جام دوبارہ منہ کو لگا لیا اور اسے خالی کرنے کے بعد ساقی کی طرف بڑھا دیا۔

تیسرا جام طلق سے اتارنے کے بعد تورج کا رخ واضطراب دور ہو چکا تھا۔ لونڈی چوتھی مرتبہ اس کا جام بھرنے کے لیے آگے بڑھی تو تورج نے اس کے ہاتھ سے صراحی چھین لی اور یکے بعد دیگرے دو اور جام بھر کر خالی کر دیئے۔ اس عرصہ میں ایک اور لونڈی پرویز کو ایک نیا جام پیش کر چکی تھی۔ پرویز نے چند گھونٹ پینے کے بعد خمارا کو دنگا ہوں سے تورج کی طرف دیکھا اور کہا: ”تم ہمارے پاس ایک غدار کے لیے رجم کی درخواست لیکر آئے تھے؟“
”نہیں عالیجاہ!“ اس نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا۔

”لیکن تم یہ کہتے تھے کہ شہر میں کھرام مچا ہوا تھا۔“

ایک آنانیہ کے لیے تورج کے دماغ سے شراب کا نشہ اتر گیا اور اس نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

”نہیں عالیجاہ! آپ کی رعایا کسی غدار کے حق میں آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔“

”ہمیں صرف اس بات کا انسوس ہے کہ ہمارے کانوں تک اس غدار کی چیخیں نہیں پہنچ سکتیں۔“

لیکن معلوم ہے کہ اس نے ہمیں دھکیاں دی ہیں؟“

”نہیں عالیجاہ! اگر میں یہاں موجود ہوتا تو اسے زبان کھولنے کا موقع نہ دیتا۔“

”تمہیں ایسے موقعوں پر غیغ حاضر نہیں رہنا چاہیئے۔ تم کہاں تھے؟“

”عالیجاہ! اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا کہ اس کے ساتھ آپ کی ملاقات تمہیں میں ہوگی تو میں یقیناً یہاں موجود نہ ہوتا۔“

”اب تمہیں ہمارا یہ حکم ہے کہ اگر دست گرد میں اس کا کوئی حامی نظر آئے تو اسے کسی تاجیکہ لہجہ میں تہمتیں ڈال کر پھینک دو۔“

”عالیجاہ! میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ دست گرد میں کوئی انسان

آپ کے غدار کا حامی نہیں ہو سکتا۔“

پرویز نے کہا: ”یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ دست گرد مدائن سے دوڑ رہا ہے اور وہاں سے ہمارے

دشمن اس طرف کا رخ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس طرف اگر مدائن کی ساری آبادی اٹھائے

تو صرف ہمارے ہاتھی انہیں کھل دینے کے لیے کافی ہوں گے۔“

”عالیجاہ! آپ کے نام کی ہیبت مسلح افواج اور ہاتھیوں سے کہیں زیادہ ہے۔“

کسری نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: ”کسی زمانے میں تم گایا کرتے تھے اور ہمیں تمہارا ایک گیت بہت پسند

”ہاں عالیجاہ! جب ہم نے رومیوں کے ایک سرحدی قلعے میں پناہ لی تھی تو آپ مجھ سے اکثر وہ گیت سنا کرتے تھے۔“

”ہم آج پھر وہ گیت سنا چاہتے ہیں۔“

”لیکن عالیجاہ! اب مجھے گانا نہیں آتا۔“

”ہم تمہیں حکم دیتے ہیں۔“

”عالیجاہ! میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ گیت سین نے کھا تھا۔“

پرویز نے تھملا کر کہا: ”ہمارے سامنے اس کا نام نہ لو۔ وہ جس نے یہ گیت کھا تھا بھلا کس

کا ساتھی تھا اور وہ جسے ہم نے آج موت کی سزا دی ہے ایک غدار ہے۔ تم گاؤ۔ رقص بند کرو۔“

تورج مذہب سا ہو کر رقصاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ پرویز چلایا: ”یہ رقص بند کرو۔“

رقصا میں رقص بند کر کے ایک طرف ہٹ گئیں اور تورج نے اپنی مغموم آواز میں گیت شروع

کیا۔ پردوں کے پیچھے سے اس کی بے جان لے کے ساتھ اُدس و باب کی تائیں بند ہونے لگیں۔ توج کے گیت کا منہ پر یہ تھا:

”ہم بے سروسامانی کی حالت میں مدائن سے نکلے ہیں۔

لیکن ہم اپنی فتوحات کے پرچم لہراتے ہوئے واپس آئیں گے۔

اور ایران کی تاریخ ہمارے خون سے لکھی جائے گی۔

بہرام ایک غاصب ہے اور پردیز ہمارا شہنشاہ ہے۔

نوشیروان کا تاج صرف پردیز کے سر پر زیب دیتا ہے۔

اور ساسانیوں کی عظمت صرف اس کے دم سے قائم ہے۔

دجلہ اور ذرات کی لہریں گواہ ہیں کہ ہم پردیز کے جاں نثار ہیں۔

اور روئے زمین کی آخری حد تک اس کا ساتھ دیں گے۔

ہم مدائن کے اُچڑے ہوئے ایوانوں کو دوبارہ آباد کریں گے۔

ہم اپنے خون اور انسوؤں سے ایران کے مقدر کی سیاہی دھو دیں گے۔

ہم اپنی ٹہلیوں سے پردیز کے نئے قلعے تعمیر کریں گے۔

اور ہم دنیا بھر کے تاج توج کر اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیں گے۔“

توج کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کر

رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے اور وہ پردیز کی نگاہوں سے بچنے کے لیے سر جھکانے

ہوئے تھا۔ اس نے گیت ختم کرتے شراب کا ایک جام بھرا اور منہ کو لگایا۔ آنسوؤں کے موٹے موٹے

قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپکے اور شراب کے جام میں جاگرے۔

پردیز بولا۔ ”توج! آج ہمیں تمہارا گیت پسند نہیں آیا تمہاری آواز تمہاری صورت سے زیادہ جھونڈی ہے۔“

توج نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔ ”عالیجاہ! مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میری آواز آپ کو

پسند نہیں آئے گی۔ میں نے صرف آپ کے حکم کی تعمیل کی تھی۔“

پردیز رقصاؤں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم کیا دیکھ رہی ہو۔“ گاڈانا چو!۔“

رقصاؤں اور مینوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور تھوڑی دیر بعد جب یہ محفل اپنے شباب پر تھی، محل کا دار در

جھکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور آگے بڑھ کر سہمی ہوئی آکا میں بولا۔ ”عالیجاہ! آپ کے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے۔“

محفل پر اچانک سناٹا طاری ہو گیا۔ رقصائیں دم بخود ہو کر شہنشاہ کی طرف دیکھنے لگیں۔ پردیز

چند تانیہ داروغہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر چانک اس نے شراب سے لبالب جام اپنے منہ کو لگایا اور

ارغوانی شراب کی حدائیں اس کی باجھوں سے نکل کر اس کی تبا کو داغدار کرنے لگیں۔ پھر اس نے خالی جام

دیار کے ساتھ دے مارا اور کہا۔ ”اس نے لوگوں کے سامنے ہماری توہین کی ہوگی۔ تمہیں کھال اتارنے سے

پہلے اس کی زبان توج لینی چاہیے تھی۔“

”عالیجاہ! ہم نے اسے زیادہ دیر چینیے کا موقع نہیں دیا۔“

”اس نے ہمارے متعلق کیا کہا تھا۔“

”کچھ نہیں عالیجاہ! مرتے وقت اس کی دماغی حالت ٹھیک نہ تھی۔“

پردیز نے جھنجھلا کر کہا۔ ”ہم یہ سننا چاہتے ہیں کہ اس نے کیا کہا تھا؟“

”عالیجاہ وہ یہ کہتا تھا کہ عرب کے کسی نبی کی پیش گوئی پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے۔“

”ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے؟“

”عالیجاہ! وہ یہ کہتا تھا کہ عرب کے نبی کی پیش گوئی کے مطابق رومی عنقریب ہم پر غلبہ کریں

گے۔ ایران میں ظلم کے پرچم سر نہکیں ہو جائیں گے اور دست گرد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی

عالیجاہ! ہمارا خیال تھا کہ وہ جان دیتے وقت بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرے گا لیکن موت کے خوف

سے وہ ایک دیوانے کی طرح چلا رہا تھا۔ جو لوگ اس کی چیخ دیکھا سن کر وہاں جمع ہو گئے تھے جنہیں

اس کی غلاری کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہا۔“

”اس نے ہمارے متعلق اور کیا کہا تھا۔“

”عالیجاہ! میں اس کے الفاظ دہرانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔“

پر دیر غضب ناک ہو کر چلا آیا۔ ”ہم تمہیں حکم دیتے ہیں۔“

”عالیجاہ! وہ یہ کہتا تھا کہ مجھے اپنی موت کا افسوس نہیں۔ بلکہ اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے اپنی ساری زندگی ایک ظالم کی خدمت میں بسر کی ہے۔ آج میں اپنے اعمال کی سزا بگت رہا ہوں۔ لیکن مجھے یہ اطمینان ہے کہ میرے قاتل کا انجام مجھ سے زیادہ عبرتناک ہوگا۔ اس نے لوگوں کو بغاوت پر اکسانے کے لیے یہ بھی کہا تھا کہ ایران اپنے ظالم حکمران کی ہوس ملک گیری کی تسکین کیلئے ان گنت قربانیاں دے چکا ہے اور اگر تمہارے نزدیک اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے خون کی کوئی قیمت ہے تو تمہارے لیے صلح اور امن کا دروازہ کھلا ہے۔ درز میں وہ وقت دیکھ رہا ہوں جب ایران کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ بہ چکا ہوگا۔ تم رحم کی بھیک مانگو گے۔ لیکن تمہاری التجا میں ٹھکرا دی جائیگی۔“

— عالیجاہ! یہ ممکن تھا کہ چند احمق اس کی باتوں سے گمراہ ہو جاتے لیکن ہم نے اسے زیادہ دیر بچے کا موقع نہیں دیا۔ پر دیر نے پوچھا۔ ”وہ عرب کا بانی کون ہے جس نے ہمارے متعلق پیش گوئی کی ہے۔“

”عالیجاہ! مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ سین نے لوگوں کو عرب کرنے کے لیے یہ بات کہی ہوگی۔ عرب کے کئی طاقت ور قبائل ہمارے حلیف ہیں اور جب تک یمن پر مہلہ قبضہ ہے عرب کے کسی حصے کے لوگ بھی ایک ایسے نبی کے ساتھ تعاون کی جرأت نہیں کریں گے جو حضور کے متعلق اس قسم کی پیش گوئیاں کرتا ہے۔“

”ہرقل کے ایلچی ایک غدار کے انجام کو دیکھ کر بھاگ کر نہیں گئے؟“

”عالیجاہ! انہیں شاید ابھی تک یہ پتا نہیں چلا کہ سین اپنے جرم کی سزا بگت چکا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ابھی تک مہمان خانے میں اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک عرب ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ گزشتہ رات اس نے مہمان خانے کی بجائے سین کے ساتھ توج کے باقیام کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اس کے متعلق کچھ جانتے ہوں۔“

پر دیر توج کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے دماغ سے اچانک شراب کا نشہ اتر گیا۔

”عالیجاہ! اس نے عاجز ہو کر کہا۔“ میں نے سین کو حضور کا ایک دغا دار خادم سمجھ کر اپنے ہاں ٹھہرایا تھا اور یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ ایک غدار بن چکا ہے اور اس نے

کے متعلق بھی مجھے سین کی زبانی یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ فلسطین اور مصر کے معرکوں میں ہمارا ساتھ دے چکا ہے۔ سین نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ حبشہ کی مہم میں حصہ لینے والے عرب رضا کاروں کا سالار تھا۔ عالیجاہ! ایسے آدمی کے لیے آپ کا ایک جاں نثار اپنے گھر کا دروازہ بند نہیں کر سکتا تھا۔“

پر دیر نے کہا۔ ”ہم نے یہوشلم کی جنگ کے ایام میں ایک عرب نوجوان کو سین کے ہمراہ دیکھا تھا اور شاید ہم نے اسے انعام بھی دیا تھا۔ اگر یہ وہی ہے تو اسے بھاگنے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔ ہم کسی مناسب وقت پر اس سے ملاقات کریں گے ممکن ہے کہ ہمیں سین کی سازشوں کے متعلق مزید معلومات حاصل ہو سکیں۔ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے گرفتار کر لو۔“

توج نے پہلی بار قدرے جرات سے کام لیتے ہوئے سوال کیا۔ ”عالیجاہ! قیصر کے ایلچیوں کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے؟“

”اس وقت ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ سرِ دست ہمارا یہی حکم ہے کہ ان میں سے کسی کو بھاگنے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔ آج تم ایک غدار کا انجام دیکھ چکے ہو۔ کل ہمیں یہ اطلاع نہیں ملنی چاہیے کہ اس کے ساتھی تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک کر ڈرا رہ چکے ہیں۔“

توج کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پر دیر کی چہیتی ملکہ اچانک عقب کے دروازے کا پردہ اٹھا کر گھر میں داخل ہوئی اور اس نے مسند کے قریب پہنچ کر حکمانہ انداز میں کہا۔ ”شہنشاہ عالی تبار کو تھیلے کی ضرورت ہے۔“

حاضرین مجلس پریشانی کی حالت میں کبھی پر دیر اور کبھی ملکہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پر دیر نے اضطراب کی حالت میں ملکہ کی طرف دیکھا لیکن اس کی نگاہوں کا احتجاج ملکہ شریں کو متاثر نہ کر سکا وہ قدرے برہم ہو کر چلائی۔ ”تم نے سنا نہیں کہ عالم پناہ کو تھیلے کی ضرورت ہے۔“

حاضرین کے بعد دیر کے وہاں سے کھسکنے لگے اور ان کی آن میں کرہ خالی ہو گیا۔

ملکہ نے کرب ایچہ ایسے ہی سوال کیا۔ ”عالم پناہ! کیا یہ درست ہے کہ آپ سین کو موت کی سزا دے چکے ہیں۔“

پر دیر نے آدردہ ہو کر جواب دیا۔ ”ملکہ بیٹھ جاؤ، ہمیں پریشان نہ کرو۔“

”تو یہ درست ہے۔“

”ہاں یہ درست ہے لیکن ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ گستاخ کون ہے جو اس وقت تھا؟“

آرام میں غل مل رہا ہے۔“

ایران کی ملکہ ایسی باتوں سے بے خبر نہیں رہ سکتی۔ میرے محل کے دروازے ان لوگوں کے لیے بند نہیں ہو سکتے۔ جو یہ محسوس کر کے میری طرف دوڑتے ہیں کہ میں ان کے حکمران کو کسی غلطی سے روک سکتی ہوں۔ عالیجاہ! مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ سین جیسے جاں نثار کی موت کا حکم دے سکتے ہیں۔“

”ملکہ تم اس غدار کے متعلق کچھ نہیں جانتیں۔ جب تمہیں سارے حالات معلوم ہوں گے تو تمہیں یہ اطمینان ہو جائے گا کہ سین کے متعلق ہمارا فیصلہ درست تھا لیکن اس وقت بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمارے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے۔“

”میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرے شوہر کو دوست اور دشمن کی تیز نہیں رہی۔“

”ہمیں پریشان نہ کر دشریں، ہمیں آرام کی ضرورت ہے۔“ پر دیزیر یہ کہہ کر سند سے اٹھا اور عتب کے کمرے کی طرف چل دیا اور دشریں کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھپکنے لگے۔

باب

جس وقت محل کا داروغہ پر دیزیر کو سین کی موت کی اطلاع دے رہا تھا، کلاڈیوس اور عام شاہی جہان خانے کے دروازے پر کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور سامن اور ولیرس بے چینی کی حالت میں جہان خانے کے کٹاؤں میں ٹہل رہے تھے۔

کلاڈیوس نے کہا: ”عام! انہیں بہت دیر ہو گئی۔ میں بہت پریشان ہوں۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس وقت کس کے ہتھکڑیاں لگی ہو رہی ہیں!“

عام نے جواب دیا: ”پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ وہ بچپن کے دوست ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کسریٰ نے اُسے کھانے کے لئے روک لیا ہو گا۔“

”لیکن انہوں نے کہا تھا کہ اگر شہنشاہ کا طرز عمل حوصلہ افزا ہوتا تو میں یہ کوشش کروں گا کہ تمہیں آج ہی بلا لیا جائے۔“

عام نے کہا: ”ون کے وقت کسریٰ کی مغفلیں اتنی طویل نہیں ہوتیں، ممکن ہے کہ سین وہاں سے فارغ ہونے کے بعد توریج کے پاس چلے گئے ہوں۔ کاش میں تمہارے پاس آنے کی بجائے وہیں ٹھہر کر ان کا انتظار کرتا!“

”توریج ان کے ساتھ نہیں گیا تھا؟“

”نہیں، توریج کو شہر سے باہر فرج کے پڑاؤ میں کچھ کام تھا۔ اس نے سین سے یہ کہا تھا کہ میں دلچسپی پر جہان خانے میں تمہارے ساتھیوں سے ملاقات کروں گا۔ اب ممکن ہے کہ وہ شہنشاہ کے دربار میں چلا گیا ہو اور وہیں سے سین کو اپنے ساتھ لے کر گھر پہنچ گیا ہو۔“

” لیکن میں یہ عرس کرتا ہوں کہ اگر کوئی اچھی خبر ہوتی تو وہ ہمارے پاس مزد آتے۔“

عالم نے کہا: ”میں تو راج کے ہاں جا کر تیار کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہاں میرے لیے کوئی اطلاع آئی ہو۔ ان کا گھر شہر کی دوسری طرف ہے۔ میں گھوڑے پر جاتا ہوں۔“

” میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ گاڑیوں سے یہ کہہ کر عالم کے ساتھ اطمینان کی طرف چل دیا۔ صحن سے گزرتے ہوئے وہ سامان اور دیوڑھیوں کے قریب دے اور عالم کے کہا: ”میں تو راج کے گھر جا رہے ہیں لیکن ہے کہ وہ شہنشاہ سے ملاقات کے بعد وہاں پہنچ گئے ہوں۔“

سامان نے کہا: ”عام حالات میں سین کو سیدھا ہمارے پاس آنا چاہیے تھا۔ میرے خیال میں ہمیں ادھر ادھر بھاگنے کی بجائے یہیں ان کا انتظار کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ ابھی تک ان کی ملاقات جاری ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ابھی تک محل کے دروازے پر کھڑے اذن باریابی کے منتظر ہوں۔ میں اس جہان خانے میں کئی بادشاہوں کے انہی دیکھ چکا ہوں جو کئی کئی سفینوں اور جہازوں سے ملاقات کے لئے کسریٰ کے حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔“

عالم کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اچانک ایک سرسبز سوار صحن میں داخل ہوا۔ اور وہ مضطرب سے ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

یہ سوار سین کے ان سپاہیوں میں سے ایک تھا۔ جو شہر سے باہر لشکر کے پڑاؤ میں ٹھہرے تھے وہ عالم اداس کے ساتھیوں کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے کود پڑا۔ اور چلایا: ”آپ نے سپہ سالار کے متعلق کچھ سنا؟“ وہ اضطراب کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ بالآخر عالم نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

”تمہاری صورت تمہاری ہی ہے کہ تم کوئی اچھی خبر نہیں لائے۔“

سپاہی نے کرب انیچ کر لیے میں کہا: ”وہ مر چکے ہیں؟“

وہ دیر تک سکے کے عالم میں اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر اچانک عالم نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ سپاہی کے کندھے پر رکھ دیئے اداسے بیدردی کے ساتھ ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا: ”میں تمھیں چوتے ہوئے کچھ نہیں ہو سکتا تم پڑاؤ میں تھے اور وہ کسریٰ کے پاس گئے ہوئے تھے۔ پڑاؤ میں ان کی موت کی افواہ کسی دشمن نے اڑائی ہوگی؟“

سپاہی کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا: ”بش با خبر غلط ہوتی۔ جب پڑاؤ میں کھرام چاہتا تو ہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ یہ خبر غلط ہے لیکن میں شہر کے ایک دروازے میں ان کی لاش دیکھ چکا ہوں۔“

عالم نے ایک ڈوبتے ہوئے انسان کی طرح فکروں کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ ”تمہیں یقین ہے کہ تمہاری آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا؟“

”میں نے جو لاش دیکھی ہے اسے پہچانا ناممکن ہے۔ وہ کھال کے بغیر تھی اور گدھ اسے نوح رہے تھے

لیکن وہاں جین ہونے والے لوگ چلا رہے تھے کہ یہ سین کی لاش ہے۔ سین کے چند دیرینہ دوست جنہیں میں جانتا ہوں، وہاں موجود تھے اور وہ رورہے تھے۔ میں ان سے تمام واقعات پوچھ کر آیا ہوں۔ میں اس جلاوٹ سے بھی مل چکا ہوں جسے زندہ ان کی کھال اتارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ فوج کے ایک افسر نے مجھے ان کے کپڑے بھی دکھائے تھے جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں ان کے ساتھ آیا ہوں تو وہ سب گرج مچ ہو گئے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ سین شہنشاہ کا خدار کیسے بن گیا۔ اگر وہ بغاوت پر آمادہ ہو چکا تھا تو یہاں کیوں آیا تھا؟ کیا یہ درست ہے کہ وہ قیصر کے ساتھ مل گیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے جنوں کی حالت میں کیا کچھ کر ڈالا؟ پاس

ہی ایک کاہن لوگوں کو یہ سمجھا رہا تھا کہ اگر ایران کے لشکر کی قیادت اس خدار کو نہ سونپی جاتی تو اب تک تسطیظیہ فتح ہو چکا ہوتا۔ ہم نے شہنشاہ کو بار بار یہ سمجھائے کی کوشش کی تھی کہ ایک روحی عورت کا خادما ایران کا دفا دار نہیں ہو سکتا۔ لیکن کسریٰ اس خدار کے خلاف کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ میں پوری قوت کے

ساتھ چلایا۔ یہ جھوٹ ہے سین خدار نہیں تھا۔ خدار وہ ہیں جو ایران کے ایک عظیم سپاہی کی موت پر خوشیاں منا رہے ہیں۔ بعض لوگ میری بوٹیاں نوحنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن ایک افسر نے سپاہیوں کی مدد سے انہیں ایک

طرف دھکیل دیا اور پھر مجھ سے کہا: ”میں سین کا دوست ہوں اور تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن اب اس جگہ شور مچانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر تم اس جگہ سین کے ساتھ چندا اور بے لگاہوں کی لاشیں نہیں

دیکھنا چاہتے تو یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اس وقت تمہارے ساتھیوں کے لئے پڑاؤ سے زیادہ کوئی جگہ محفوظ نہیں۔ چنانچہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے بھاگ نکلا۔ لیکن تھوڑی دیر جا کر میں نے عسوس کیا کہ آپ کو اطلاع

دنیا مزدی ہے۔ اور میں انہیں چھوڑ کر آپ کے پاس آ گیا ہوں۔

عام نے کرب کی حالت میں اپنی مٹھیاں بیچتے ہوئے کہا: اگر سین قتل ہو چکا ہے تو اس کا ماتل پڑیں نہیں بلکہ میں ہوں۔ میں نے ہی اے موت کا راستہ دکھایا۔ میں نے ہی اے صلح کا ایچی بن کر یہاں آنے پر مجبور کیا تھا۔ کاش میں اس کے ساتھ ہوتا۔ کاش اس سے پہلے میری کھال اتاری جاتی اور میں اس سے یہ کہہ سکتا کہ میں جو ہم میں ہی نہیں بلکہ سزا میں بھی تمہارے ساتھ شریک ہوں۔ سین کو اپنے مستقبل کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ اسے غلطیوں سے روانہ ہوتے وقت بھی اس بات کا یقین تھا کہ وہ موت کے دروازے پر دستک دینے جا رہا ہے۔

کلاڈیوس نے دلیریس سے مخاطب ہو کر کہا: تم اھلیل سے عام کا گھوڑا لے آؤ جلدی کرو۔

دلیریس اھلیل کی طرف بھاگ گیا اور کلاڈیوس نے عام کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: عام! اب تمہیں ہمت سے کام لینا پڑے گا، تم جس مقصد کے لئے یہاں آئے ہو اس کی تکمیل کے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ لیکن موجودہ حالات میں میں تمہیں ایک لمحہ کے لئے بھی یہاں ٹھہرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ خدا کیلئے تم یہاں سے نکل جاؤ اور سین کی بیوی اور بیٹی کی حفاظت کی فکر کرو۔ ورنہ مجھے شبہ ہے کہ سرخ سین کے دشمنان قتل کو جائز ثابت کر لے کیلئے انہیں بھی کسی سازش میں لوٹ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر تم کسی تاخیر کے بغیر وہاں پہنچ جاؤ تو تمہارے لئے انہیں باسغوس کے پار پہنچا دینا مشکل نہیں ہوگا۔ وہاں کوئی تم پر شک نہیں کریگا۔ اگر تم سے پہلے سین کے قتل کی خبر وہاں پہنچ گئی تو غلطیوں کے دروازے تمہارے لئے بند ہوں گے اور تم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکو گے۔ یہاں وہ کہ تم ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ مجھے بدترین حالات میں بھی کسرے سے یہ توقع نہیں کہ وہ ہمیں موت یا قید کی سزا دے گا۔ ہم ایک بار مانتے والے حکمران کے ایچی ہیں۔ ہمارے ساتھ بڑی سے بڑی بدسلوکی ہو سکتی ہے کہ ہمیں دھکے دے کر دست گرد سے نکال دیا جائے لیکن تمہارا معاملہ سے مختلف ہے تم سین کے دوست ہو اور وہ تمہیں کسی نیک سلوک کا مستحق نہیں سمجھیں گے۔ اگر ہمارا انجام انتہائی عبرت ناک ہو تو ہمیں تم ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

لیکن عام کے ذہنی اور جسمانی قوتے شکل ہو چکے تھے۔ اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کلاڈیوس کی

رہنما دیکھ رہا تھا۔

کلاڈیوس نے اسے چھوڑتے ہوئے کہا: عام اگر تم کو اپنی جان کی پروا نہیں تو کم از کم میں یہاں کر رہا ہوں اس بنا پر اسٹینہ کا آخری سہارا ہو۔

عام نے چند بار اسٹینہ کا نام دہرایا اور اس کے دل میں زندگی کی نئی نکل دھڑکیں بیدار ہونے لگیں۔ پھر اس نے راکر دیکھ دیریس اس کا گھوڑا لے آؤ گا۔ اس نے اپنا کھجنگ کراس کے ہاتھ سے گھڑے کی باگ پکڑ لی لیکن پھر تذبذب کی حالت میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

کلاڈیوس چلایا: اب سرچے کا وقت نہیں عام، خدا کے لئے جلدی کرو!

سپاہی نے اپنے گھوڑے پر کودتے ہوئے کہا: چلیے میں آپ کے ساتھ جلتا ہوں!

عام ایک گری سانس لینے کے بعد گھوڑے پر سرار ہو گیا۔ لیکن ابھی وہ بیرونی دروازے سے چند قدم دور تھے کہ بند مسلح سپاہی نمودار ہوئے اور نیرے تان کراس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

اگر عام کو بھاگ نکلنے کی کوئی امید ہوتی تو شاید وہ دو چار آدمیوں کو پکھل ڈالنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ لیکن آج وہ قوت فیصلہ جو اسے پہاڑوں سے ٹکر لینے پر آمادہ کر دیا کرتی تھی جواب دے چکی تھی اور وہ خون جو حضرات کے وقت اس کی رگوں میں بہتی ہو کر ڈھٹا تھا، منجمد ہو چکا تھا۔ پیادہ سپاہیوں سے پیچھے کشتہ بڑھ کر بھی چند سوار دیکھائی دے رہے تھے اس نے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور ایک ثانیہ صبرت حال کا جائزہ لینے کے بعد اپنے ساتھی سے کہا: اب بھاگنے کی کوشش بے سود ہے۔

ایک خوش وضع نوجوان جو ان سپاہیوں کا افسر معلوم ہوتا تھا آگے بڑھا اور اس نے کہا: تم باہر نہیں جا سکتے؟

”ایک آدمی کا راستہ روکنے کے لئے تمہیں اتنی فوج جمع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔“ عام یہ کہہ کر اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔ افسر نے کچھ کہے بغیر ایک سپاہی کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکھلی۔ دوسرا سپاہی عام کے ساتھی کی طرف بڑھا اور وہ بھی اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔

نوجوان افسر نے کہا: انہیں قید خانے میں لے جاؤ!

سپاہیوں نے عام اور اس کے ساتھی کو ایک تنگ گھیرے میں لے لیا تو کلاڈیوس نے جو اپنے ساتھیوں

کی طرح دم بخود کر رہے نظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک آگے بڑھ کر ایرانی انسر سے سوال کیا۔ ”کیا میں ان کی گرفتاری کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

انسر نے بے پروائی سے جواب دیا ”میں تمہیں صحت یہ بتا سکتا ہوں کہ اگر تمہارے ساتھیوں میں سے کسی اور نے جھاگے کی کوشش کی تو تم اُسے بھی قید خانے میں بھیجے بغیر رہو گے۔“

کلاڈیس نے کہا۔ ”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جھاگے کی نیت سے یہاں نہیں آئے اور اگر آپ عام کو ہمارے پاس پھوڑ دیں تو ہم اس کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں۔“

عام نے گھور کر کلاڈیس کی طرف دیکھا اور ردی زبان میں کہا۔ ”یہاں میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ لیکن تمہارے جتنے کام ابھی باقی ہیں لیکن ہے کہ سین کی موت پر ایرانی لشکر کے سرکردہ افسروں کا رد عمل کسریٰ کو تمہاری باتیں سننے پر مجبور کر دے۔ اس لئے میری حمایت میں زبان کھول کر اپنی مشکلات میں اضافہ کرنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

انسر نے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر ”تم کیا دیکھ رہے ہو۔ اسے لے جاؤ!“

عام سپاہیوں کی نگلی تلواروں کے پیرے میں چند قدم چلنے کے بعد اچانک رکا اور افسر کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے بلڈ آواز میں بولا۔ ”میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں!“

انسر غصے سے آگے بڑھ کر بولا۔ ”مجھے انسر ہے کہ میں تمہاری کوئی مردہ کر سکوں گا۔“

عام نے کہا ”مجھے معلوم ہے لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس غریب سپاہی کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے سین کے محافظت کے ساتھ پڑاؤ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں اس نے سین کے قتل کی اطلاع نہی شہر میں جا کر اس خبر کی تصدیق کی اور یہ سمجھ کر میرے پاس چلا آیا کہ میں سین کا ایک وفادار دوست اور ساتھی ہوں۔ یہ بات اس کے ذہن میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ سین کے کسی دوست کو اس کی موت کی اطلاع دینے کے بعد یہ اس معیت میں چھینس جائے گا۔ اس لئے آپ اسے میرے ساتھ شامل نہ کریں!“

انسر کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہوا ”تم اسے پڑاؤ میں لے جاؤ اور وہاں اسے کڑی نگرانی میں رکھو۔ پھر میاروں کو اس کے باقی ساتھیوں کے متعلق بھی یہ ہدایت کر دو کہ وہ ناکلم ثانی ان میں سے کسی کو بھی پڑاؤ سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دیں۔ اور یہ گھوڑے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ تمہارے ساتھ پانچ سپاہی کا ذہن ہے۔“

پھر ذہ عام کی طرف متوجہ ہوا۔ اب تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟“

”ہاں، اگر ہر کے تو آپ ان معزز رویوں کو بلا کر کوئی تکلیف نہ دیں۔ یہ قیصر کی طرف سے صلح کا پیغام لیکر

آئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ کسریٰ کو صلح اور امن کی اہمیت محسوس کرنے میں زیادہ دیر نہ لگے۔“

انسر نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں صحت یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ کسریٰ کے حکم کے بغیر ان لوگوں کا بال تک بیکانہیں ہوگا لیکن شرط یہ ہے کہ ان میں سے کوئی جھاگے کی کوشش نہ کرے۔“

عام نے احسانمندی سے ایرانی افسر کی طرف دیکھا اور سپاہیوں کے پیرے میں وہاں سے چل دیا۔



عام پانچ دن سے دست گرد کے قلعہ نما قید خانے کی تنگ دھاریک کوٹھڑی میں پڑا ہوا تھا اور سخت و

اضطراب کے یہ ایام اسے مہینوں اور برسوں سے زیادہ طویل محسوس ہوتے تھے۔ یہ قید خانہ سینکڑوں ذبحہ انسانوں کا

فرقان تھا اور یہاں کئی لوگ ایسے تھے جو طویل قید کی صعوبتوں کے باعث ذہنی توازن سے محروم ہو چکے تھے اور عام

س پاس کی کوٹھڑیوں سے ان کے سبب تہقے اور روح فرسا چینی سنا کرنا تھا اپنی زندگی کے بدترین اذیتوں میں بھی

اس نے امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ لیکن اب وہ سارے چراغ جو اس نے اپنے آنسوؤں سے روشن کیے تھے بچھ

چکے تھے۔ وہ اپنے ماضی کی ساری پونجی اس قید خانے سے باہر چھوڑ آیا تھا اور مستقبل کے متعلق اس کے حوصلے اور

دل سے اس کو کھٹری کی چادر لوارہی کے اندر محسوس ہو کر رہ گئے تھے۔ ماضی کے جن ناہموار راستوں پر اس نے اپنے پاؤں

کے نشان چھوڑے تھے وہ سب اس جگہ پہنچ کر ختم ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی چند لمحات کیلئے اس کی بے چین روح ہزاروں

میل دور مان حین اور دل کش نخلستانوں، وادیوں اور میدانیوں کے طوائف کرتی جہاں سرست ہر آئیں آنادی کے

زکرت لاتی تھیں درخت جھومتے اور چھوٹا کھلتے تھے۔ لیکن اچانک اس کو کھٹری کی دیواریں اس کی نگاہوں کے

سامنے حائل ہو جاتیں اور وہ دنیا جس پر سورج اپنے نور کے خزانے لٹا تھا جیسے جانڈ کی مٹی پائنتیاں و لکشی اور

مٹائی عمارت کرتی تھیں اور جس پر ستاروں کی مسکراہٹیں پچھا اور ہوتی تھیں، اسے ماضی کا ایک عجول ہوا خواب اور

ایک دم محسوس ہونے لگتا تھا۔ پھر جب اس کا دم گھٹنے لگتا تو وہ اٹھ کر تنگ چادر لوارہی کے اندر ٹھہرا شروع کر دیتا۔

ہر روز ایک بار اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلتا اور پیریار عاصم کو کھانا اور پانی دے کر پے جاتے۔ شرح کے
 دن اس نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن تیسرے دن قید خانے کا ایک افسر اس کے پاس آیا۔ اور اس نے کہا۔ جس
 درج کا حکم ہے کہ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہ دی جائے اور ہم نے تمہارے لیے عام قیدیوں سے بہتر خوراک کا انتظام کیا
 ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ یہاں فافذ کشتی سے صرف وہ قیدی مرنے کی کوشش کرتے
 ہیں جو چاروں طرف سے دیوس ہو چکے ہوں۔ اگر توجرج جیسے لوگ تمہارے ہم درو ہیں تو تمہیں اس قدر دیوس نہیں ہونا
 چاہیے۔ جو شخص سین کا ساشی رہ چکا ہو اسے اس قدر بدولی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ فوج میں سین
 کے بے شمار ساشی تمہاری رہائی کی کوشش کریں گے۔ اگر تم اس دنیا کی تمام دلچسپیوں سے منہ نہیں موڑو یا تو تمہیں
 زندہ رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کسرنے کو اپنی دل سے تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ ہم نے کئی وزیروں اور سپہ
 سالاروں کو تختہ دار پر لٹکتے دیکھا ہے اور کئی خوش نصیب قیدیوں پر انعامات کی بارش ہوتے دیکھی ہے۔

عاصم نے غمی ہو کر کہا۔ ”آپ توجرج کو میرا یہ پیغام دے سکتے ہیں کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“
 ”میں توجرج کو تمہارا پیغام پہنچا دوں گا۔ لیکن موجودہ حالات میں شاید وہ کھلے بندوں تم سے ملاقات نہ کر سکیں شاید
 تم کو چند ہفتے یا چند مہینے انتظار کرنا پڑے۔ جو سکتا ہے کہ کسی دن وہ تمہاری رہائی کا حکم لے کر یہاں پہنچ جائیں۔“
 قید خانے کا افسر عاصم کے ظلمت کدہ میں امید کی بجلی سی روشنی چھوڑ کر چلا گیا۔ پناہ سجدہ اس نے پہلے بار پیٹ بھر
 لکھنا لکھایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر اپنی رہائی کی تدبیریں سوچنے لگا۔



چھ روز چار مسلح پیریاروں نے عاصم کو اس کی کوٹھڑی سے نکالا اور قید خانے کے داروغہ کی قیام گاہ کے ایک
 کشادہ کمرے میں لے گئے۔ وہاں داروغہ کے علاوہ توجرج اور ایک عمر رسیدہ آدمی جو اپنے لباس سے ایلان کے طبقہ
 اس کے نمائندگی کرتا تھا، اس کے منتظر تھے۔

توجرج نے پیریاروں کو ہاتھ سے اتار دیا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ پھر وہ عاصم کی طرف متوجہ ہوا۔ تم
 ایس کو اچھی طرح جانتے ہو؟

آپ پاس کی کوٹھڑیوں سے اُسے کسی کا سبب تہمت یا کسی کی جھیا نک چیخ سنانی دیتی اور وہ درحال سہا کر بیٹھا۔
 ”کیا میں زندہ رہوں گا! کیا زندگی بھی ہے! کیا میرے لئے اس سے بہتر موت نہیں ہو سکتی تھی! آؤ میں یہاں
 کیوں آیا تھا؟ جب تک مجھے سین کے نقل کی اطلاع نہیں ملی تھی مجھے یہ اطمینان تھا کہ میں کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے
 رہا ہوں۔ لیکن اب مجھے یہ ساری باتیں ایک مذاق معلوم ہوتی ہیں۔ میں ایک ایک قدم چل کر اپنی تباہی کی آخری
 منزل تک پہنچا ہوں۔ آخر روم اور ایران کی جنگ یا صلح سے میرا کیا تعلق تھا! میں نے یہ کیوں سوچا کہ میں اس دنیا کی
 ساری مصیبتوں کا علاج کر سکتا ہوں! یہ میرے بس کی بات نہیں اور میں کو بھی اس بات کا یقین تھا کہ روم اور ایران
 میں مصالحت کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ خلع دن سے روزانہ ہوتے وقت اس کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ مرے
 دروازے پر دستک دینے جا رہا ہے وہ کون سا جذبہ تھا جو اسے یہاں تک لے آیا تھا؟ اگر میں اس کے پاس نہ آتا، اگر
 صلح کا اچھی نتیجہ پر اسے آمادہ نہ کرتا تو یہ حالات کیوں پیدا ہوتے!!“

پھر انتہائی کرب کی حالت میں وہ اپنی مٹھیاں بچھ کر چلا تا۔ میں سین کا تاق ہوں میں نے اسے وہ منزل
 دکھائی تھی جہاں موت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ میں کیا کر سکتا تھا!
 جب ذہنی اذیت ناقابل برداشت ہو جاتی تو پھر ایک بار تصورات کی دنیا میں کوئی جائے پناہ تلاش کرنا۔
 اس کی روح خلع دن کے طلوع کا طوفان کرنے لگتی۔ قسطنطنیہ کسی گوشے سے نمودار ہوتی اور سرسبز اور انکسار بن کر کہتا۔
 ”قسطنطنیہ میں تمہارا جرم ہوں کاش میں تمہارے باپ کو دوست گرد جانے کا مشورہ نہ دیتا۔ مجھے معاف کر دو قسطنطنیہ میری
 طرف دیکھو اس دنیا میں تمہارے سوا میرا کوئی نہیں۔ میں سب کچھ کھو چکا ہوں۔ لیکن تم میری ہو۔ تم میری جا ہو
 اب میں روم اور ایران کی بجائے صرف تمہارے متعلق سوچوں گا۔ قسطنطنیہ مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو
 نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہاری سسکیاں نہیں سن سکتا۔“

پھر جب اس کی آواز چیزوں میں تبدیل ہونے لگتی تو وہ دہشت زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ اس کے خیالات
 کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور حسین پسوں کے موتی بھر جاتے۔ باہر کی دنیا پھر ایک بار کوٹھڑی میں دیواروں کے ادھر دوپوش
 ہو جاتی۔ لیکن کچھ دیر بعد اسے پھر یہ محسوس ہونے لگتا کہ قسطنطنیہ اس کی روح کی گہرائیوں سے نکل کر ایک جھیا نک
 خلا کو پُر کر رہی ہے اور اس کے آنسو اور اس کی مسکراہٹیں اس کے دل میں زندہ رہنے کی خواہش بیدار کر رہے ہیں۔

جی ہاں، وہ سین کے کسی دوست یا رشتہ دار کا بیٹا تھا اور میں اس سے کئی بار ملا تھا۔

تین معلوم ہے کہ وہ قتل ہو چکا ہے؟

جی ہاں، وہ اوس کے ہاتھوں میری آنکھوں کے سامنے قتل ہوا تھا۔

تو ج نے بوڑھے آدمی کی عزت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ ایرج کے والد ہیں اور اپنے بیٹے کے قتل کی افواہ سننے کے بعد ملاقات سے یہاں پہنچے ہیں۔

عاصم نے بوڑھے سے مخاطب ہو کر کہا۔ مرتے وقت آپ کے بیٹے کا سر میری گود میں تھا۔ مجھے افسوس ہے

کہ میں اس کی جان نہ بچا سکا۔

بوڑھا کچھ دیر کرب کے عالم میں عاصم کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ایرج نے مجھے بنایا تھا سین کے گھر میں ایک عرب کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ پھر شاید تم جہنہ کی تم پر چلے گئے تھے اور اس کے بعد لاپتا ہو گئے تھے۔ اگر تم وہی ہو تو میں تمہاری اطلاع پر یقین کر سکتا ہوں۔ لیکن اگر میرے بیٹے کو تین لوگوں نے قتل کیا تھا تو تم وہاں کیسے پہنچ گئے تھے؟

عاصم نے جواب دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ میں جہنہ کے راستے میں زخمی ہو گیا تھا۔ اور میرے ساتھی مجھے

سخت بخار کی حالت میں پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ پھر جب میں بے ہوش تھا تو ایک رومی غلام اوقطبی ملاج مجھے باہر لے

پہنچانے کی بجائے دریا کے نیل کے راستے سمندر تک لے گئے اور وہاں سے مجھے ایک رومی ہمارے سوار کر کے قسطنطنیہ

پہنچا دیا گیا۔ یہ رومی غلام ایک نہایت بااثر خاندان کا چشم و چراغ تھا اور قسطنطنیہ میں میرے ساتھ اس کا بتاؤ نہایت

فیاضانہ تھا۔ قسطنطنیہ سے مجھے اس کے ساتھ اس شہر میں جانا چاہا۔ قیصر اور آدار تباہل کے خاتون کی دوستانہ

ملاقات ہونے والی تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس جگہ ایرج کے ساتھ میری آخری ملاقات ہوگی۔

بوڑھے نے کہا۔ لیکن تم کہتے ہو کہ میرا بیٹا آدار کے ہاتھوں قتل ہوا ہے؟

جی ہاں۔ وہ قیصر پر اپنا کھلم کھلا کرنے کی نیت سے وہاں حج ہوئے تھے۔ لیکن رومیوں پر حملہ کرنے سے پہلے

انہوں نے آپ کے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ ایرج خاتون کے پاس ایک اچھی کی حیثیت سے گیا تھا۔ اس کا کوئی ساتھی بھی وہاں

نہیں آیا۔

میں نے کہا۔ ہاں کسی اور ایرانی کو نہیں دیکھا ممکن ہے کہ وہ ایرج سے پہلے قتل کیے جا چکے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

وہ اپنی تک خاتون کی قید میں تھی۔ وحشی آدار کے مخاطبہ، اخلاق میں ایک اچھی حکومت کے گھاٹ اتار دینا ایک معمولی بات

ہے۔ اگر سین جیسے آدمی کو اس جرم میں قتل کیا جا سکتا ہے کہ وہ قیصر کے اہلیوں کو کسریٰ کی شرائط پر صلح کے لئے لانا

کرنے یہاں لے آیا تھا تو آدار نے ایرج کو قتل کرنے کا بھی کوئی جواز نکال لیا ہو گا۔ ممکن ہے کہ انہیں ایرج کی کسی

بات پر شبہ ہو گیا ہو۔

عاصم کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ اگر اس نے ایرج کے ساتھ اپنی ملاقات کی تفصیلات ظاہر کرنے کی

کوشش کی تو میلہ زیادہ الجھ جائے گا۔ اور اس پر حلح کے ثبوت کئے جائیں گے۔

چنانچہ تو ج اور ایرج کے باپ کے متعدد سوالات کے جواب میں اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ جناب

میں یہ نہیں جانتا کہ آپ کا بیٹا ہر قلیل کیوں آیا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ سین اس کے دشمن کیوں ہو گئے۔ میں صرف

یہ جانتا ہوں کہ اس نے سین سپاہیوں کے زخم سے نکل کر اس طرف بھاگنے کی کوشش کی تھی جہاں رومی سپاہی

کھڑے تھے۔ لیکن قتل اس کے کہ رومی اس کی کوئی مدد کر سکتے وہ ایک سین سوار کے زینے سے زخمی ہو کر گر پڑا۔ اس

کے بعد خاتون کے طوفانی دہشتے وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے رومیوں پر حملہ کر دیا۔ اب رہا یہ سوال کہ انہوں نے آپ

کے بیٹے کو قتل کیوں کیا۔ اس کا صحیح جواب صرف وہ لوگ دے سکتے ہیں جو ایرج کے ساتھ گئے تھے۔ لیکن میرا خیال

ہے کہ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں ہو گا۔

بوڑھے نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میرے بیٹے کو رومیوں نے قتل کیا ہو؟

عاصم نے تدرے پریشان ہو کر جواب دیا۔ اگر رومی اس قتل کے مجرم ہوتے تو مجھے کھڑکھڑا کے قتل کا الزام

میں نے کیا سزا دیا تھی؟

تم رومیوں کے ساتھی ہو۔

عاصم نے کرب انگریز لہجے میں جواب دیا۔ میں صرف سین کا ساتھی تھا اور میں یہ سمجھتا تھا کہ سین کے دوست

بہرہ دوست اور سین کے دشمن میرے دشمن ہیں۔ لیکن سین مر چکا ہے اور اب میرا کوئی دوست یا دشمن نہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں ایرج کی موت کے اسباب کے متعلق آپ کی تسلی نہیں کر سکا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اے یقین نے قتل کیا اور مرتے وقت جب میں نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی تھی تو میرے متعلق اس کے تاثرات ایک دوست اور بھائی کے تاثرات سے مختلف نہ تھے۔ ہم دونوں کو اس بات کا افسوس تھا کہ زندگی میں ہم ایک دوسرے کے قریب کیوں نہ آسکے۔ میں نے یہ باتیں آپ کو عرض کرنے کے لیے نہیں کیں۔ یہ یہ جانتا ہوں کہ اب آپ کی خوشی یا نا اہلگی میری قسمت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔“

”مجھے یقین ہے کہ تم بھوت نہیں کہتے اور میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میں اس شخص کی کوئی مدد نہیں کر سکتا جس نے میرے بیٹے کو مرتے وقت سہارا دیا تھا۔ ایرج کا باپ یہ کہہ کر مجھ سے عاصم کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو اُتر آئے اور وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔“

تورج نے قید خانے کے داروغہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”مقام انہیں دو دروازے تک چھوڑ آؤ۔ میں قیدی سے چند ضروری باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔“

داروغہ نے تورج کے حکم کی تعمیل کی اور وہ قدرے توقف کے بعد عاصم سے مخاطب ہوا۔ ”جب ایک آدمی تیرے کمزور میں اپنا سر دے چکا ہو تو اس کے بہترین دوست بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ میں سین کے معاملے میں بے بس تھا۔ لیکن تمہارا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ تم اگر ہوش سے کام لو تو شاید اپنی جان بچا سکو۔ اگر تم میری نصیحت پر عمل کرو تو ممکن ہے کہ شہنشاہ کچھ عرصہ بعد تمہیں قید سے آزاد کرنے پر بھی رضامند ہو جائے۔ میری بات توڑ سے سنو۔ سین کا خون رانگلا نہیں گیا۔“

میں ملک کے کئی شہروں سے اس قسم کی اطلاعات ملی ہیں کہ شہنشاہ کے بعض دشمن سین کو مظلوم ثابت کر کے لوگوں کو بغاوت پر اکسا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ فوج میں ایک محضرابیسا ہے جو جنگ کی طوالت سے تنگ آ چکے۔ کل شہنشاہ نے پہلی بار دست گرد کے اہل اور فوج کے اعلیٰ افسروں سے یہ مشورہ لینے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ روم کے اچھروں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اور ہماری اکثریت نے یہ رائے دی تھی کہ شہنشاہ اولیٰ تو ان سے ملاقات کریں۔ ورنہ انہیں حفاظت سے واپس بھیج دیں۔ دست گرد کے بڑے کاہن کے علاوہ صرف چند اہل ایسے تھے جنہوں نے رومیوں کے لیے قتل یا قید کی سزا کا مطالبہ کیا تھا۔ شہنشاہ نے ملاقات کی تجویز منظور کر لی ہے۔ اور

رومیوں کے متعلق یہ حکم دے دیا گیا ہے کہ سرد دست ان کے ساتھ انسانی سمسز ممانوں کا سا سلوک کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ شہنشاہ انہیں بہت جلد شرف باریابی عطا کریں گے۔ اور اگر رومیوں نے ان کی تمام شرائط مانیں تو صلح ہو جائے گی۔ اب تمہارا سکہ رہ جاتا ہے۔ میں آج قیصر کے آدمیوں سے ملا تھا اور وہ یہ کہتے تھے ہم سب سے پہلے شہنشاہ کی خدمت میں تمہاری رہائی کی درخواست پیش کریں گے۔ لیکن میں نے انہیں یہ سمجھایا تھا کہ اگر تم نے اس قسم کی کوئی درخواست کی تو وہ ٹھکرا دی جائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ عاصم کی طرح تم بھی شہنشاہ کے زیرِ عقاب آ جاؤ۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم سرد دست شہنشاہ کے سامنے عاصم کا ذکر تک نہ کرو۔ جب صلح کی شرائط طے ہو جائیں گی تو ممکن ہے کہ عاصم کے حق میں تمہاری آواز بھی موثر ثابت ہو۔ اب شاید وہ تمہاری حمایت میں بان کھول کر اپنی الجھنوں میں اضافہ کرنے کی غلطی نہ کریں۔ لیکن تمہیں اس بات سے باخبر نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے تمہارے بچاؤ کا ایک راستہ نکالا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم حقیقت پسندی سے کام لو۔“

قید خانے کا داروغہ کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن تورج نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا ”آپ کچھ دیر اہل باہر ٹھہریں۔ میں قیدی سے ایک ضروری بات کر رہا ہوں۔“

داروغہ لٹھے پاؤں باہر نکل گیا اور تورج دوبارہ عاصم کی طرف متوجہ ہوا۔ ”میں نہیں بتا چکا ہوں کہ سین کے قتل پر مختلف شہروں کے عوام کے رد عمل کے متعلق جو اطلاعات آرہی ہیں ان کے باعث شہنشاہ کا فی پریشان دکھائی دیتے ہیں تم اگر چاہو تو شہنشاہ کی تمام پریشانیوں کو دور کر سکتے ہو۔“

عاصم نے سوال کیا۔ ”میں شہنشاہ کی پریشانیوں کیسے دور کر سکتا ہوں۔؟“

”تم ایک مدت سے سین کے سامنے ہو۔ اور اس کے متعلق تمہاری ہر بات درست مانی جائے گی تم جانتے ہو کہ شہنشاہ رعایا کے سامنے اپنی غلطیوں کا اعتراف نہیں کیا کرتے۔ اور انہیں ہر وقت ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو عوام کے سامنے ان کا ہر اقدام صحیح ثابت کر سکیں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ عاصم نے مضطرب ہو کر سوال کیا۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اپنی جان بچانے کے لیے بھرے دربار میں یہ کہنا پڑے گا کہ سین واقعی ایک باغی دروغ باز تھا اور اس نے رومیوں کو بچانے کے لیے مجھ پر ہمارے لشکر میں بددلی اور بائیس پھیلا دی تھی۔ تم

یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ سین دل سے بیسائی ہو چکا تھا۔ اور اس کے زیر اثر کئی سپاہی مدعوئوں کے حامی بن گئے تھے۔ ایک تالیف کے لیے عام کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آگیا۔ اور وہ کرب انگیز لہجے میں پلویا نہیں نہیں ہمیں اپنی موت سے پیسے مرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں اس شخص پر غلاظت نہیں پھیکنوں گا، جس کے ساتھ عقیدت، محبت اور وفاداری کا رشتہ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔“

تورج نے کہا۔ ”بے خوف نہ بنو۔ سین کے ساتھ تمہاری عقیدت اور محبت صرف تمہیں ہلاکت کا راستہ دکھا سکتی ہے۔ اُسے واپس نہیں لاسکتی۔ اگر تم سین کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دو تو وہ تمہارے قید خانے کا دروازہ کھول کر یہ نہیں کے گا کہ اب تم آزاد ہو۔ اور اگر تم اس کی مذمت کرو تو وہ تمہارے مصائب میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ اس کی موت کے بعد اس کے ساتھ تمہارے سارے رشتے ختم ہو چکے ہیں۔ لیکن کسریٰ زندہ ہے اور اُسے تمہاری زندگی اور موت پر پورا اختیار ہے۔ اگر تم اپنے لیے نہیں تو ان لوگوں کے لیے زندہ رہنے کی کوشش کرو جنہیں تمہاری ضرورت ہے تم سین کی یہ کوہ سہارا دے سکتے ہو۔ اس کی بیٹی کے آنسو پونچھ سکتے ہو۔“

عام نے جواب دیا۔ ”ایک گراہوا آدمی کسی کا سہارا نہیں بن سکتا۔ اب تک میں ہی سمجھتا تھا کہ اس دنیا میں موت سے بھیانک کوئی چیز نہیں۔ لیکن آپ مجھے ایک ایسی زندگی کا راستہ بنا ہے جسے میں جو موت سے زیادہ بھیانک ہے اگر آپ کو میرا امتحان مقصود ہے تو مجھے اپنے شہنشاہ کے سامنے لے چلیے۔ میں بھروسے دہا میں یہ اعلان کروں گا کہ میں سین کا دوست ہوں اور میں اس کے قاتل سے اپنے لیے رحم کی بھیک نہیں مانگ سکتا۔ تم سین کی طرح میری کھال اتار سکتے ہو لیکن کوئی اذیت، کوئی تحریف اور کوئی لاپرواہی مجھے اس عظیم انسان کے خلاف زبان کھولنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ میں آپ کا ننگ گزاروں کہ آپ میرے زندہ رہنے کو اس قدر اہمیت دے سہے ہیں۔“

لیکن میں ایسی حقیر زندگی کا بوجھ نہیں اٹھتا۔“

تورج کچھ دیر تکی بازگشت کر عام کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ اچانک اپنی کرسی سے اٹھ کر آگے بڑھا اور عام کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے دوست میں بے بس ہوں۔ اگر میں کسریٰ کی طرح با اختیار ہوتا، تو میرا پلا حکم یہ ہوتا کہ اس قیدی کی بیڑیاں اتار دی جائیں اور ایران کے سارے خزانے اس کے ساتھ لائیں۔“

ڈھیر کر دینے جائیں۔“

عام نے کہا۔ ”اگر آپ مجھ سے خفا نہیں ہوئے تو میری یہ درخواست ہے کہ آپ سین کی بیوی اور بیٹی کو مصیبت سے بچانے کی کوشش کریں۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ان کا انجام سین سے زیادہ عبرتناک نہ ہو۔“

”میں تم سے خفا نہیں ہوں بلکہ مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ سردست کسریٰ کی توجہ سین اور اس کی بیوی کی طرف مبذول نہیں ہو سکتی۔ اور ہم اس بات کی پوری کوشش کریں گے کہ ان پر کوئی مصیبت نہ آئے۔ میں تمہارے مستقبل کے متعلق بھی بہت زیادہ مایوس نہیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ صلح کے بعد تمہارے لیے تمہیں رہا کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ کسریٰ محاذ جنگ کی لمان مجھے دینا چاہتا تھا۔ لیکن رومیوں کے ساتھ بات چیت کا فیصلہ کرنے کے لیے مجھے چند دن کے لیے روک لیا گیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ صلح کے بعد محاذ جنگ پر میری ضرورت نہیں ہوگی۔“ تورج نے یہ کہہ کر تالی بجائی۔ قید خانے کا دروازہ اور صلح سپاہی اندر داخل ہوئے۔ اس نے عام کو لے جانے کا حکم دیا۔

ساری دولت سمٹ کر اس دربار میں جمع ہو گئی ہے۔ وہ یہ اُمید لے کر آئے تھے کہ شاید کبکلاہ ایران کی القاب میں سُن کر صلح کی شرائط نرم کرنے پر آمادہ ہو جائے، لیکن ابھی وہ مسند سے چند قدم دُور تھے کہ سپاہیوں نے اُن کی گردنیں دیوچ لیں اور انہیں زبردستی سر بسجود ہونے پر مجبور کر دیا۔ پھر چند ثانیے بعد کسریٰ کے ہاتھ کا اشارہ پا کر سپاہیوں نے انہیں بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھا دیا اور وہ دم بخود ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

نقیب رومی زبان میں چلا آیا۔ تم فاتح عالم کے دربار میں کھڑے ہو۔ اگر جان عزیز ہے تو اپنی تسلیح لگا ہیں بچی کرو۔“

اُنہوں نے حکم کی تعمیل کی لیکن چند ثانیے بعد سامن نے قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔
”عاجباہ! ہم ہرقل کی طرف سے“

نقیب دوبارہ چلا آیا۔ خاموش تمہیں فاتح عالم کے ساتھ ہم کلام ہونے کی جرأت نہیں کرنی چاہیے۔
سامن کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔

پرویز کے وزیر نے شہنشاہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”فاتح عالم! آپ کا ادنیٰ غلام صلح کی شرائط کا اعلان کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔“

کسریٰ نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور وزیر نے یہ اعلان کیا۔ ”فاتح عالم، فرمانروائے اعظم خسرو پرویز نے صلح کے لیے روم کے حکمران ہرقل کی التجا قبول فرماتے ہوئے اُس کے باختیار نمایندوں کے ساتھ حسب ذیل شرائط طے فرمائی ہیں۔“

ہرقل شام، فلسطین، مصر، آرمینیا اور ایشیائے کوچک کے تمام مفتوحہ علاقوں پر شہنشاہ ایران کی حکمرانی تسلیم کرتا ہے۔ فاتح عالم یہ اعلان فرماتے ہیں کہ وہ باسفورس کے مغرب میں رومی سلطنت کے کسی اور حصے پر قبضہ نہیں کریں گے اور اس کے بدلے رومی انہیں، ایک ہزار ٹالنت سونا، ایک ہزار ٹالنت چاندی، ایک ہزار حریر کی قبائیں، ایک ہزار بہترین گھوڑے اور ایک ہزار رومی دوشیزائیں بطور خراج پیش کریں گے۔ اگرچہ ماہ کے عرصے میں یہ شرائط پوری نہ کی گئیں تو یہ معاہدہ کالعدم سمجھا جائے گا۔

پرویز نے رومی ایلیچیوں کو شرف باریابی عطا کرنے سے پہلے اُن کے سامنے صلح کی شرائط پیش کرنے کی ذمہ داری اپنے وزراء اور فوج کے چہرہ داروں کے علاوہ اُن عجمی کاہنوں کو سونپ دی تھی جو عیسائیوں کی تبدیل اپنا مذہبی فریضہ خیال کرتے تھے۔ اور ان لوگوں نے چند دن غور و فکر کے بعد ہرقل کے ایلیچیوں کے سامنے جو مسودہ پیش کیا تھا، وہ ایسی توہین آمیز شرائط پر مشتمل تھا جو صرف ایک ظالم فاتح اپنے پاؤں میں گرے ہوئے دشمن کی شاہرگ پر تلوار رکھ کر منوا سکتا تھا۔ لیکن رومیوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

جب پرویز کو اُس کے نمائندوں نے یہ اطلاع دی کہ ہرقل کے ایلیچی زہر کے تلخ گھونٹ اپنے وطن سے اُتارنے پر آمادہ ہو گئے ہیں تو اُس نے ایک دن پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنا دربار منعقد کیا، اور ہرقل کے ایلیچی بے بس قیدیوں کی طرح دباؤ لائے گئے۔

ایک بلند چوڑے پر جو ہمیش قیمت قالینوں سے آراستہ تھا، شہنشاہ کی مسند کے قریب سونے کے آئینہ میں مقدس آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور چوڑے سے نیچے سلطنت کے اکابر حسب مراتب صغیر باندھے کھڑے تھے۔ ملکہ شیریں شہنشاہ کے پہلو میں رونق افروز تھی۔

رومیوں کے لئے یہ وسیع مال جس کے ستون اور دیواریں سونے اور چاندی سے مرتین، فرش پیش قیمت قالینوں سے آراستہ تھے اور جس کی چھت لاتعداد فانوسوں سے سجائی گئی تھی، ایک طلسم کہ تھا۔ وہ حاضرین دربار کی قبائیں اور جواہرات سے مرصع ٹوپیاں دیکھتے اور انہیں ایسا محسوس ہوتا کہ دنیا کی

اب شہنشاہ عالم ہرقل کے اپنی سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ انہیں یہ شرائط قبول ہیں؟

ساتن نے کسریٰ کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "عالیجاہ! ہرقل کو آپ کے احکام کی تعمیل سے انکار نہیں ہوگا۔ لیکن روم کے حالات آپ سے پوشیدہ نہیں۔ ہرقل کو اتنا خراج جمع کرنے کے لیے زیادہ مہلت کی ضرورت ہوگی۔"

ملکہ نے شہنشاہ کو اپنی طرف متوجہ کر کے کچھ کہا اور وہ پہلی بار ساتن سے مخاطب ہوا۔ "اگر ہرقل نے ہمیں اس بات کا اطمینان دلا دیا کہ وہ نیک نیتی سے ہماری شرائط پورا کرنا چاہتا ہے تو ہم اس کی درخواست پر اُسے مزید مہلت دینے کے متعلق سوچیں گے۔"

ساتن نے کہا۔ "عالیجاہ! میں آپ کو یہ اطمینان دلا سکتا ہوں کہ ہرقل آپ کی شرائط تسلیم کرنے میں پس و پیش نہیں کرے گا اور اس سلسلہ میں ان کے اپنے ہاتھ کی تحریر آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔" پرویز نے کہا۔ "تم ہرقل کو ہماری طرف سے یہ پیغام دے سکتے ہو کہ اگر اُس نے جیل جونی سے کام لیا تو ہمارے سپاہی دنیا کے آخری کونے تک اُس کا پیچھا کریں گے اور قسطنطنیہ کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے گا۔"

ساتن نے جواب دیا۔ "عالیجاہ! ہرقل کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ آپ کی ناراضگی بدلے لیے کس قدر تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر فاتح عالم مجھے اجازت دیں تو میں ایک التجا کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"عالیجاہ! ایک عرب نے دستگردنگ ہماری راہنمائی کی تھی اور اب وہ آپ کی قید میں ہے۔ اُس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ روم اور ایران کی صلح کا خواہش مند تھا۔ میری التجا ہے کہ اُسے اکر دیا جائے۔ پرویز نے غصہ ناک ہو کر کہا۔ "وہ عرب ایران کے ایک ایسے خدرا کا دوست تھا جسے موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ اور ہم تمہیں اُس کی حمایت میں زبان کھولنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ تم جاسکتے ہو؟"

ساتن نے سر جھکا کر سلام کیا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اٹھنے پاؤں باہر نکل آیا۔

دستگرد کا بڑا کاہن آگے بڑھا اور مسند کے قریب کھڑا ہو کر بولا۔ "عالیجاہ! میں آپ کو رعایا کی طرف سے اس عظیم فتح پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اب ایران کے فرزند فخر کے ساتھ سر اڑنچا کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ قیصران کے شہنشاہ کا ایک حقیر غلام ہے۔"

ایک ذریعہ نے بلند آواز سے نعرہ لگایا۔ "فاتح عالم! آپ کا اقبال بلند ہو اور آپ کے دشمن ذلیل و خوار ہوں۔" اور حاضرین دربار اُس کی تقلید میں آوازیں بلند کرنے لگے۔ کسریٰ کا اقبال بلند ہو۔ کسریٰ کے دشمن ذلیل و خوار ہوں۔"

پرویز نے اچانک ہاتھ بلند کیا اور وہ خاموش ہو گئے۔ اُس نے کہا۔ "ہم اس کامیابی کی خوشی میں ایک ہفتہ کے لیے جشن عام کا حکم دیتے ہیں۔"

اگلی صبح قیصر کے اہلی دستگرد سے روانہ ہو چکے تھے۔



ایک رات یوسیدیا اپنے بستر پر سو رہی تھی اور قسطنطنیہ اُس کے قریب دوسرے پلنگ پر تکیے سے ٹیک لگائے کثیرہ کاری میں مصروف تھی۔ کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی اور اُس نے چونک کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"بیٹی دروازہ کھولو، میں فیروز ہوں۔"

قسطنطنیہ نے ریشمی کپڑا ایک طرف رکھ دیا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ عجز سیدہ نوکر تذبذب کی حالت میں یوسیدیا کے بستر کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے چچا! اتنی جان کو جگا دوں؟"

"نہیں اس وقت انہیں بے آرام کرنا ٹھیک نہیں۔ تم میرے ساتھ آؤ، دست گرد سے ایک آدمی آیا ہے اور وہ کوئی ضروری پیغام دیتا چاہتا ہے۔"

ایک ثانیہ کے لیے قسطنطنیہ کا سارا وجود لرز اٹھا اور پھر اُس نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش

کرتے ہوتے پوچھا " کہاں ہے وہ؟ "

" بیٹی میں اُسے کونے کے کمرے میں چھوڑ آیا ہوں "

فطینہ کمرے سے باہر نکلی تو شدتِ اضطراب سے اُس کے پاؤں لڑکھڑاہے تھے۔
اچانک اُس نے رُک کر سوال کیا۔ " پچا تم نے اس سے ابا جان کے متعلق نہیں پوچھا؟ "
" میں نے اُس سے کئی سوال کئے ہیں۔ لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ میں صرف سین کی بیٹی یا میری

سے کوئی بات کر سکتا ہوں "

" اگر وہ کوئی اجنبی ہے تو میں اتنی جان کو جگکا دیتی ہوں "

" بیٹی وہ کلا ڈیوس ہے "

" کلا ڈیوس! وہی جو ابا جان کے ساتھ گیا تھا؟ "

" ہاں! "

" تم نے پہلے یہ کیوں نہیں بتایا؟ " فطینہ یہ کہہ کر کمرے کی طرف بڑھی۔ کلا ڈیوس کمرے
کے اندر ٹھل رہا تھا۔

" آپ کب آئے، ابا جان کہاں ہیں؟ آپ تنہا کیوں آئے، آپ کے ساتھی کہاں ہیں؟ " فطینہ
نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر دیئے اور پھر سراپا التجا بن کر کلا ڈیوس کی طرف دیکھنے لگی۔

چند ثانیے کلا ڈیوس کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر اُس نے بھرتائی ہوئی آواز میں کہا۔

" آپ کے ابا جان اور عاصم ہمارے ساتھ نہیں آسکے۔ میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ

غروبِ آفتاب کے وقت یہاں پہنچا ہوں۔ ہم نے باہر پڑاؤ میں قیام کیا ہے۔ ہم علی الصبح رکتی پر

سوار ہو جائیں گے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید میں جانے سے پہلے آپ کو نہ دیکھ سکوں۔ تلخ کے محافظ

نے مجھے بڑی مشکل سے رات کے وقت اندر آنے کی اجازت دی ہے۔ آپ کی اتی جان کیسی ہیں؟ "

" اُن کی طبیعت کئی دنوں سے خراب ہے آج وہ سو گئی تھیں اور میں نے انہیں جگانا مناسب

نہیں سمجھا لیکن اگر ضروری ہو تو میں انہیں بلا لاتی ہوں۔ "

۶۱۳

" نہیں، نہیں، انہیں تکلیف نہ دیکھیے۔ آپ بیٹھ جائیں، میں آپ سے چند ضروری باتیں
کہنا چاہتا ہوں۔ "

فطینہ اضطراب کی حالت میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی، کلا ڈیوس کچھ دیر پریشانی کی حالت
میں دروازے کے سائے فیروز کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اُس نے کہا۔ " کچھ کہنے سے پہلے میں
یہ جانتا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے نوکر پر کہاں تک اعتماد کر سکتی ہیں۔ "

فطینہ نے جواب دیا۔ " ابا جان نے فیروز کی وفاداری پر کبھی شک نہیں کیا، اور میں اسے
پچا فیروز کہا کرتی ہوں۔ "

کلا ڈیوس نے کچھ سوچ کر کہا۔ " آپ کو معلوم ہے کہ میں عاصم کا دوست ہوں۔ "

" مجھے معلوم ہے اور میں آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ لیکن تم اس کے لیے آپ میری قربت
برداشت کا امتحان نہیں۔ "

کلا ڈیوس نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ فطینہ کے سر پر رکھ دیئے اور انتہائی کرب انگیز لہجے
میں کہا۔ " میری بہن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے لئے کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔ میرے پاس

اتنا وقت بھی نہیں کہ میں تمہیں تسلی دے سکوں۔ میری ذمہ داری تمہاری اور تمہاری والدہ کو ایک
بہت بڑے خطرے سے نکالنے ہے اور اس ذمہ داری سے میں اس صورت میں عمدہ براہِ راست

ہوں کہ تم حوصلے اور بہت سے کام لو۔ میں یہ جانتا ہوں کہ میں

اُسے سننے اور برداشت کرنے کے لیے ایک پہاڑ جیسے دل کی ضرورت ہے۔ لیکن حالات کا

تعاوض یہ ہے کہ تمہارا پیٹھ پیٹھ ہمارے سینے میں دبی رہیں اور تمہاری

فطینہ سننے کے عالم میں کلا ڈیوس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور

کہ اُس کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے۔ " فطینہ! اُس نے قدرے توجہ سے

نہیں آئے گا۔ اُسے پوزے تڑپ کر دیا ہے۔ عاصم کو قید کر لیا گیا ہے

ہو کر تمہارے پاس پہنچ جائے لیکن دستِ گرد میں تمہارے باپ

دوستوں کو اس بات کا خدشہ

ہے کہ شاید تمہارے متعلق بھی پرویز کی نیت ٹھیک نہ ہو۔ مجوسی کا ہن اُسے ہر وقت تمہارے خلاف مشتعل کر سکتے ہیں۔ تمہارے خلاف اُن کا یہی کہہ دینا کافی ہو گا کہ تم عیسائی ہو۔ اب پرویز کی سلطنت میں تمہارے باپ کے کسی عزیز یا ساتھی کی زندگی محفوظ نہیں۔ کاش کوئی ایسی صورت ہوتی کہ تم تمہیں اپنے ساتھ قسطنطنیہ جاتے لیکن یہ ممکن نہیں۔ ایران کے سفیر ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔ پرسوں رات اگر تم کسی ہمانے یہاں سے نکل سکو تو شہر سے باہر قریباً تین میل، جنوب کی طرف سمندر کے کنارے ایک اُجڑی ہوئی خانقاہ کے قریب چند آدمی تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اگر میں کسی وجہ سے اُن کے ساتھ نہ آسکا تو میری جگہ ویسوں وہاں موجود ہو گا۔ ہمارا جہاز ساحل سے دو گھنٹہ پہلے سے دور تھا۔ اس لیے رات کے وقت ایک کشتی بھیج دی جائے گی۔ آپ میری باتیں سن رہی ہیں۔“

فسطینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دیر تک پتھر کی بے جان مورتی کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ پھر چونک اُس نے ایک بھر پھری لی اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

کلاڈیوس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تمہارے باپ کی آخری خواہش یہی ہو سکتی تھی کہ تم مجوسیوں کے انتقام سے بچ کر کسی محفوظ جگہ پہنچ جاؤ۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ قسطنطنیہ کب تک محفوظ رہ سکے گا۔ لیکن میں تمہارے ساتھ یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ جب تک باسفورس کا پانی ہمارے خون سے سُرخ نہیں ہو جاتا اور جب تک قسطنطنیہ کی گلیوں اور بازاروں میں ہماری لاشوں کے انبار نہیں لگ جاتے ہم تمہاری جان اور عزت کی حفاظت کریں گے۔ کم از کم تمہیں یہ شکایت نہیں ہوگی کہ تمہارے کسی سپاہی نے اپنے زندگی میں سین کی بیوی اور بیٹی کی بے بسی کا منظر دیکھا ہے۔“

سین نے جس مقصد کے لیے قربانی دی ہے وہ صرف اس حد تک پورا ہوا ہے کہ پرویز نے ہمارے ساتھ گفتگو کرنا قبول کر لیا تھا۔ لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ صلح کے لیے اُس کی توہین آمیز شرائط انتہائی بزدل رومیوں کے لیے بھی ناقابل قبول ہوں گی۔ ہمارے لیے دستِ گرد سے زندہ واپس آنے کی یہی ایک صورت تھی کہ ہم پرویز کے سامنے تسلیمِ خم کر دیں لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اب اس کی بجائے روم اور ایران کے درمیان ایک فیصلہ کن معرکے کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ آپ کے لیے یہ سمجھنا

مشکل نہیں کہ جنگ کی صورت میں ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔

ابھی تک یہاں سین کی موت کے متعلق کوئی سرکاری اطلاع نہیں پہنچی۔ دستِ گرد سے جو ایرانی ہمارے ساتھ آئے ہیں انہوں نے صرف ایرانی فوج کے چند بڑے عمدہ داروں سے باتیں کی ہیں اور قائم مقام سپہ سالار نے انہیں بڑی سختی سے یہ ہدایت کی ہے کہ وہ علم سپاہیوں سے اس حادثے کا ذکر نہ کریں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بہت جلد یہ خبر سارے لشکر میں مشہور ہو جائے گی اور اس کے بعد تمہارے لیے قلعے سے باہر نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دو چار دنوں تک پرویز کا ایچی تمہیں دستِ گرد پہنچانے کا حکم لے کر آجائے اور یہاں تمہارے باپ کے بہترین دوست بھی تمہارے لیے کچھ نہ کر سکیں۔ اس لیے ابھی یہ بات کسی پر ظاہر نہیں ہونی چاہیے کہ تمہیں اپنے باپ کی موت کی اطلاع مل چکی ہے۔ میری بہن! میں یہ جانتا ہوں کہ اس وقت تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ لیکن یہ جگہ آنسو بہانے کے لیے موزوں نہیں ہے۔“

فسطینہ نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آتا کہ پرویز نے میرے باپ کو قتل کر دیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنی جان! کہا کرتی ہیں کہ وہ بچپن کے دوست تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ اگر آپ کی باتیں درست ہیں تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گی۔“

کلاڈیوس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو چکی تھیں۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”فسطینہ تمہارا باپ مر چکا ہے۔ لیکن عاصم زندہ ہے، اور تمہیں اس کے لیے زندہ رہنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے، کہ ربائی کے بعد وہ تمہاری تلاش میں دُنیا کا کونہ کونہ چھان مارے گا۔ کیا تم یہ گوارا کرو گی، تم ایک قیدی کی حیثیت میں دستِ گرد پہنچا دی جاؤ اور کسریٰ کے محل کی دیواریں مرتے دم تک عاصم اور تمہارے درمیان حائل رہیں، تمہیں معلوم ہے کہ اب بھی وہاں تم جیسی تین ہزار لڑکیاں موجود ہیں، جن کی فریادوں کے والدین، اُن کے بھائیوں یا شوہروں کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی؟“

فسطینہ نے شدتِ کرب سے اپنی مٹھیاں پہنچ لیں۔

کلاڈیوس قدرے توقف کے بعد فیروز کی طرف متوجہ ہوا۔ ”میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔“

اگر تم سین کے وفادار ہو تو تم ان کی مدد کر سکتے ہو۔ پرسوں لات میرے آدمی تمہیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کریں گے، اور یہ ان کی پہلی اور آخری کوشش ہوگی۔ اس کے بعد ہمیں شاید دوسرا موقع نہ مل سکے۔ اگر فوج کا کوئی بڑا افسر تمہارے آقا کا وفادار ہے تو وہ میری باتوں کی تصدیق کرنے کا فیروز کی آنکھوں سے آنسو جھہ رہے تھے، اُس نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ فوج کا کوئی افسر مجھ سے یہ خبر چھپانے کی کوشش نہیں کرے گا، لیکن مجھے تصدیق کی ضرورت نہیں۔ میرے آقا کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ دست گرد سے واپس نہیں آئیں گے۔ اب اگر پرسوں تک کوئی اور حادثہ پیش نہ آگیا تو ہم بندر کے کنارے آپ کی کشتی کا انتظار کریں گے۔ میں وہ پرانی خانقاہ کٹی باؤ دیکھ چکا ہوں۔ کلاڈیوس نے فسطینہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی والدہ کو تسلی نہیں دے سکا۔ لیکن اگر وہ یہاں موجود ہوتیں تو شاید میرا کام اور زیادہ مشکل ہو جاتا۔ اب مجھے اجازت دیجئے؛ فسطینہ نے اُس کی طرف دیکھا، لیکن کوشش کے باوجود اُس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ کلاڈیوس ایک ثانیہ کے بعد خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا اور فیروز اس کے پیچھے ہولیا۔

باب ۳

سلطنت روما کی صدیوں کی عظمت خاک میں مل چکی تھی اور کچلاہ ایران تیسرے ایلیوں سے انتہائی تہین آمیز شرائط منوانے کے بعد روئے زمین کا مغرور ترین انسان بن چکا تھا۔ عوام فتح کا جشن منانے تھے اور ان سات دنوں میں ان کے میکدے شراب سے خالی ہو چکے تھے۔ کسری کے مفتوحہ ممالک کی افواج کو اپنے حکمران کی کامیابی کی اطلاع دانا تاخیر سے ملی۔ تاہم انھوں نے بھی جشن کی رسومات پورے جوش و خروش سے ادا کیں۔ بے بس عوام کے لیے یہ دن قیامت کے دن تھے۔ شراب سے بدست سپاہیوں کی ٹولیاں ان دنوں بھوکے بیٹریوں کی طرح انسانوں کی لہٹیوں میں گھومتی تھیں اور رحمت اور بربریت کے جگر خراش منانے والوں کو گوں نے اپنی شکست کے ایام میں دیکھے تھے وہ پھر ایک بار پوری شدت کے دہرائے جا رہے تھے۔ ایٹائے کوچک مصر اور شام کی فضائیں ظالموں کے قہقہوں اور مظلوموں کی چیخوں سے لبریز تھیں۔

کسری کے لیے اس جشن کے بعد بھی ہر دن جشن کا دن تھا۔ وہ عام طور پر شراب سے مدہوش رہتا تھا اور جب کبھی شراب کا نشہ کم ہونے لگتا یا رقص و موسیقی کی محفلوں سے اسے کچھ آکٹا ہٹ محسوس ہوتی تو وہ ان خوشامدیوں اور جی حضوریوں کو اپنے گرد جمع کر لیتا جو کھینچو اور دارا کی فتوحات کے ساتھ اس کی کامیابیوں کا موازنہ کر کے اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ ان میں سے کوئی آپ کا ہم پلہ نہیں تھا۔ عجوبی کاہن بظاہر اسے ایک دیوتا کا رتبہ دیتے تھے لیکن انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ سلطنت صوفیہ اور سلطنت روما کے دوسرے عظیم گرجوں کو آتش کدوں میں تبدیل نہیں کر سکتے۔

ایک دن مین کا ایرانی گورنر سالانہ لگان کی رقم سرکاری خزانے میں جمع کرانے کے لیے دست گرد پچھا

پر دینے اس کی آمد کی اطلاع ملے ہی اسے اپنے پاس طلب کیا اور مین کے حالات پوچھنے کے بعد سوال کیا "ہم نے سنا ہے کہ عرب کے کسی باشندے نے خدا کا نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ تم اس کے متعلق کیا جانتے ہو؟" گورنر نے جواب دیا۔ "عالیجاہ! میں نے صرف یہ سنا ہے کہ یہ نبی مکہ میں پیدا ہوا ہے اور اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس پر خدا کا کلام نازل ہوتا ہے۔"

"تمہیں یہ معلوم ہے کہ اس نبی نے رومیوں کے ہاتھوں ہماری شکست کی پیش گوئی کی ہے؟" میں نے یہ سنا ہے عالیجاہ! لیکن آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اہل مکہ نے نبوت کے اس دعویدار اور اس پر ایمان لانے والے چند نادار اور بے بس لوگوں کو دہاں سے نکال دیا ہے اور اس نے وہاں سے کئی منزل دور یثرب میں پناہ لی ہے اس کے بعد مکہ سے جو اطلاعات میرے پاس پہنچی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اس کے اپنے قبیلے کے لوگ اس کے خون کے پیاسے ہیں اور وہ اسے یثرب میں بھی چین نہیں لینے دیں گے۔ عالیجاہ! شام سے مکہ کے راستے میں آنے والے تاجر مجھے عرب کے حالات سے باخبر رکھتے تھے اور میں ان کی زبانی اکثر یہ سنا کرتا تھا کہ جب مکہ میں ہماری فتوحات کی خبریں پہنچتی ہیں تو وہاں کے لوگ اس نبی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اب حضور کے دوبارہ میں تیسرے ایلیوں نے جس بے جا رنگ کا ثبوت دیا ہے اس کے بعد عرب کا کوئی ذی شعور آدمی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اہل روم دوبارہ سر اٹھاسکیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ جب یثرب میں بھی اس معاہدے کی اطلاع پہنچے گی تو وہاں بھی مکہ کے نبی کا مذاق اڑایا جائے گا لیکن عالیجاہ! میں ان لوگوں کی جسارت پر حیران ہوں جنہوں نے آپ کو اس پیشگوئی کی اطلاع دے کر پریشان کیا ہے۔"

کسری نے برہم ہو کر مین کے گورنر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ہمیں اس خبر سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی ہم یہ جانتے ہیں کہ رومی اب قیامت تک سر نہیں اٹھاسکیں گے۔ ہم نے قیصر کا غرور ہمیشہ کے لیے خاک میں ملادیا ہے لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ عرب کے ایک باشندے کو ہمارے خلاف اس قسم کی پیشگوئی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا اس دنیا میں اتنے بے خبر لوگ بھی ہو سکتے ہیں جنہیں ہماری طاقت اور ہماری فتوحات کا علم نہ ہو۔"

مین کے حاکم نے کہا: "عالیجاہ! عرب کے نبی نے یہ پیش گوئی اس وقت کی تھی جب کہ رومی

سلطنت میں ابھی زندگی کے چند سانس باقی تھے اور بعض لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو سکتے تھے کہ شاید جنگ کا پانسہ پلٹ جائے۔ مجھے کوئی پانچ سال قبل اس پیش گوئی کی اطلاع ملی تھی لیکن اب تو کوئی دوا ہی اس پیش گوئی کا ہمیت دے سکتا ہے۔"

پر دینے قدرے تلخ ہو کر پوچھا۔ "اگر تمہیں پانچ سال قبل اطلاع ملی تھی تو تم نے ہمیں خبر کیوں نہ دی؟" "فناج عالم اگر مجھے یہ خبر نہ ہو تا کہ دنیا کی کوئی طاقت آپ کو شکست دے سکتی ہے تو میں یقیناً آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ لیکن میرے نزدیک آپ کی فتوحات کے سیلاب کے سامنے اس پیشگوئی کی کیا حقیقت تھی آخری روم کے راہب بھی تو یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ایران کا لشکر یروشلم کی دیواروں تک نہیں پہنچ سکے گا۔" کسری کے بے رحم چہرے پر ایک خفیت سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور مین کا گورنر اچانک یہ عرصوں کرنے لگا کہ اس کے سر سے ایک طوفان گزر چکا ہے؟



ظاہر بین نگاہیں رومیوں کی ذلت اور رسوائی کا آخری نقشہ دیکھ رہی تھیں۔ قسطنطین کے جانشین اس نادر یک گرٹھے میں دم توڑ رہے تھے جہاں سے ان کے دوبارہ اٹھنے کے امکانات ختم ہو چکے تھے۔ ہرقل کے اقبال کا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور اس کے مقدر کی رات ان ستاروں کی جھلماہٹ کے بغیر تھی جو شیکے ہارے مسافروں کو صبح کا پیغام دیتے ہیں لیکن اب بھی خدا کی زمین پر مٹھی بھر انسانوں کی ایک جماعت ایسی تھی۔ جن کے نزدیک ابھی تک فتح اور شکست کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ محمد عربی کے یہ غلام جنہیں مشرکین مکہ ایرانیوں کی فتوحات کی خبریں سنا کر حڑا یا کرتے تھے اپنے آقا کی زبان مبارک سے خالقِ ارحم و سما کا یہ پیغام سن چکے تھے کہ رومیوں کی شکست بالآخر فتح میں تبدیل ہو جائے گی اور زمانے کا کوئی انقلاب اس پیشگوئی کی صداقت پر ان کا ایمان متزلزل نہیں کر سکتا تھا۔

مشرکین مکہ کے نزدیک صرف ایرانیوں پر رومیوں کے غلبہ کی پیش گوئی نا قابل یقین تھی بلکہ اس سے کہیں زیادہ وہ اس بات پر حیران تھے کہ اس پیشگوئی کے ساتھ ہی مسلمانوں کو بھی اللہ کی بخشی ہوئی نصرت

خوشیاں منانے کی بشارت دی گئی تھی اور خدا کے یہ بندے جن یقین کے ساتھ رومیوں کی فتح کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی یقین کے ساتھ اپنی فتح کا انتظار کر رہے تھے پھر جس طرح کسریٰ کو رومیوں سے انتہائی ذلیل شرائط منوانے کے بعد اس بات کا غمزدہ بھرنہ تھا کہ رومی اس کی طاقت کے سامنے دوبارہ سر اٹھانے کی جرأت کریں گے۔ اسی طرح مشرکین مکہ کو بھی یہ بات خارج از امکان معلوم ہوتی تھی کہ بے بس انسانوں کا یہ گردہ جس پر وہ اپنے ظلم کے ترکش کے سارے تیر آزما چھے ہیں۔ عرب کے کسی میدان میں اپنی فتح کا پرچم گاڑ سکے گا۔ قیصر اپنی شکست کا اعتراف کرنے کے باوجود ایک بادشاہ تھا۔ اس گئی گزری حالت میں بھی باسفورس کے پادشاه کے قلعے اور فوجی مستقر موجود تھے۔ کلیسا کی قوت اس کی پشت پر تھی اور ہزاروں انسان اس کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے موجود تھے۔ لیکن محمد عربیؐ امدان کے مٹھی بھر غلاموں کی حالت یہ تھی کہ انھیں اپنے گھبراہ چھوڑ کر کوسوں دور پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

مشرکین مکہ اپنی قوت اور جنگی وسائل کے اعتبار سے غریب اور نادار مسلمانوں پر وہی ذقیت لگتے تھے جو اریانوں کو رومیوں پر حاصل تھی اور اس وقت جب کہ وہ مکہ میں اپنے عزیزوں، دوستوں اور بھائیوں کے بے پناہ مظالم سے تنگ آ کر انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں مدینے کا رخ کر رہے تھے۔ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ اس چھوٹے سے قافلے کا ہر قدم فتح کی طرف اٹھ رہا ہے اور راستے کی یہ پہاڑیاں جو ان کی لیے کئی کامشاہدہ کر رہی ہیں۔ کسی دن ان کے جاہ و جلال سے لرز اٹھیں گی۔ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ کفر کی تاریخ آندھریوں سے پناہ ڈھونڈنے والے نور کا ایک ایسا سیلاب بن کر لوٹیں گے جس کی تابانیوں سے محو کے درد دلوں کی گنگا اٹھیں گے۔ ظاہر میں آنکھوں کو عرب و عجم کا صرف ایک ہی نقشہ دکھائی دیتا تھا اور وہ یہ تھا کہ عرب کے اندر صرف اسلام کے دشمن اور عرب سے باہر صرف رومیوں کے ایرانی حریف ہی غالب رہیں گے۔ ان کے نزدیک نصرانیوں کی تقدیر جو عیسویوں اور مسلمانوں کی قسمت مشرکین مکہ کے ہاتھ میں تھی۔ دست گرد کے مجوس کا ہن اس بات پر خوشیاں منا رہے تھے کہ رومیت کا دین عیسائیت پر دائمی غلبہ حاصل کر چکا ہے اور عرب کے بت پرست اس بات پر شادان تھے کہ ان کے لات و بہل ایک ایسے دین کو شکست دے چکے ہیں جس کی تعلیم ان کے صدیوں کے عقائد کے منافی تھی۔ لیکن اسلام کی صداقت پر ایمان لانے والوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے اس

پیش گوئی کی صداقت پر ایمان نہ ہو۔ وہ اپنے آقا کی نگاہوں سے مستقبل کا نقشہ دیکھ چکے تھے اور حال کے آلام و مصائب کو ناقابل شکست حوصلوں کے ساتھ برداشت کر رہے تھے۔ دینا میں کوئی ایسا نہ تھا جس کا حال ان سے زیادہ اذیت ناک تھا اور دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا جو اپنے مستقبل متعلق ان سے زیادہ پر امید تھا وہ صرف یہ جانتے تھے کہ روم و ایران اور اپنے مستقبل کے متعلق ان کے آقا کی پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اور انھیں یہ سوچنے کی ضرورت نہ تھی کہ قدرت رومیوں کو موت کے پھل سے چھڑا کر فتوحات کے راستے پر ڈالنے کے لیے کون سے اسباب مہیا کرے گی اور پھر یہ مختصر سا قافلہ جو انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں مکہ سے نکل کر مدینہ میں پناہ لے چکا تھا کس طاقت کے بل بوتے پر اللہ کے دین کے ان دشمنوں کو شکست دے سکے گا جو عرب قبائل میں ایک مرکزی حیثیت کے مالک تھے اور جو اسلام کو عرب کی جاہلی رسوم کا بدترین دشمن ثابت کر کے پورے ملک کو اپنے پیچھے لگا گئے تھے۔ عرب میں صرف مکہ ہی ایک ایسا شہر تھا جسے پورے ملک میں ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کا دین مشرکانہ رسومات کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا اور دئے زمین پر خدا کا پہلا گھر بتوں سے بھر دیا گیا تھا تاہم اس شہر کے ساتھ عربوں کی عقیدت کا رشتہ ابھی تک قائم تھا۔ وہ ہر سال حج کی رسومات ادا کرنے اور اپنے ہاتھوں کے بنائے بتوں سے منتیں ماننے کے لیے یہاں آتے تھے اور صدیوں سے بیت اللہ کی حرمی اور حفاظت کے فرائض ادا کرنے کے بعد قبیلہ قریش کو بھی عرب قبائل میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ وہ اس جہالت کے علمبردار تھے جس کی تاریکیاں پورے عرب کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھیں۔ وہ ان مذہبی اور سیاسی عقائد کے معلم تھے جن کے باعث یہ ملک ایک اخلاقی انحطاط کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ان حالات میں ایک نئے دین کے خلاف ان کا نعرہ پورے عرب کو مشتعل کر سکتا تھا اور ظاہری حالات سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ جب عرب کے کسی میدان میں مسلمانوں کے ساتھ قریش مکہ کا تصادم ہوگا تو پورے عرب کی طاقت ان کی پشت پر ہوگی۔ اگر مکہ سے کوئی بھولہ اٹھا تو تیز تک پیچھے پیچھے وہ ایک ہمیب آندھی میں تبدیل ہو جائے گی۔ لیکن وہ قافلہ جو رات کے وقت مکہ سے نکلا تھا اور جس کی ساری پونجی ایمان کی زخمت ہرنے والی دولت تک محدود تھی، ظاہری حالات کے آریک پردوں کے آگے ایک ایسے مستقبل کی منازل

دقت قریب آپکا تھا — ہرقل اس وقت خوابِ غفلت سے بیدار ہوا جب اسے دیکھنے، جاننے اور
 سمجھنے والے تمام انسان مایوس ہو چکے تھے۔ اس نے اس وقت اپنی رنگ آلود گولہ اٹھانے کی جرأت کی
 جبکہ اس کے بازو ٹل ہو چکے تھے، اس نے عزت کا راستہ اس وقت اختیار کیا جب کہ روئے زمین کی ساری
 ذلتوں اور سوائیوں کو ایک گھڑی میں باندھ کر اس کی پیٹھ پر لاد دیا گیا تھا — اور اسے فتح اور نصرت
 کے اسباب تلاش کرنے کی اس وقت مقرر ہوئی جب کہ روم کی تباہی کے تمام ظاہری اسباب مکمل ہو چکے تھے۔
 کسری جیسے جابر دشمن سے دوبارہ ٹکر لینے کے لیے اسے نئی افواج کی ضرورت تھی اور نئی افواج

تیار کرنے کے لیے اسے وقت اور روپیہ درکار تھا۔ چنانچہ پرویز نے اسے خراج جمع کرنے کے لیے سوجہلت
 دی تھی اس کا ایک ایک لمحہ جنگی تیاریوں میں صرف ہونے لگا۔ دولت کی کمی پوری کرنے کے لیے اس نے
 سلطنت کے خالی خزانوں کی بجائے ان گرجوں اور خانقاہوں کا رخ کیا جہاں کلیسا کے اکابر سونے اور
 چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتے تھے — یہ لوگ اپنے خزانوں سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔

لیکن قیصر نے انہیں یہ سمجھایا کہ میں تم سے قرض مانگتا ہوں اور جب روم کے دن پھر جائیں گے تو تمہارے
 قرض کی رقم تمہیں سود کے ساتھ ادا کی جائے گی — کلیسا کے اکابر کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ ایران
 کو خراج ادا کرنے کے بعد بھی انہیں زیادہ مدت گئے لیے امن اور راحت کی زندگی نصیب نہیں ہوگی
 اور سونے اور چاندی کے جو ذخائر انہوں نے اپنی خانقاہوں اور گرجوں میں چھپا رکھے ہیں وہ کسی دن ایران
 کے ہاتھوں لوٹے جائیں گے۔ چنانچہ مذہب کے بعض پیشواؤں نے رضا کارانہ طور پر قیدیوں کو اپنے خزانے پیش کر دیئے اور بعض
 جنہوں نے تنگ دلی کا مظاہرہ کیا، انہیں حکومت کے دباؤ نے صدیوں کی جمع کی ہوئی دولت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا۔

قیصر کے لیے ایرانیوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ لڑانا ایک مجبوری تھی۔ امن کی خاطر شاید وہ
 اپنی رعایا کے ہاتھوں سے سوکھی روٹیاں چھین کر بھی ایرانیوں کو پیش کر دیتا۔ لیکن ایک ہزار روڈیہ اولوں کا
 مطالبہ پورا کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اپنے ایلچیوں سے صلح کے لیے پرویز کی ٹرانسکٹ سننے کے بعد اس کے
 لیے دو ہی راستے تھے۔ اولاً یہ کہ وہ اپنی بے بس رعایا کو ایرانیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کہیں جھاگ جاتا اور ثانیاً
 یہ کہ وہ زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر اپنے طاقتور، مغرور اور بے رحم دشمن کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا

دیکھ رہا تھا۔ جہاں ایک نئی صبح کا آفتاب پوری تاباویوں کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔



ہرقل کی افواج جنگ کے میدانوں میں پٹ جچی تھیں۔ اس کے خزانے خالی ہو چکے تھے اور
 اب حالات نے اسے ایک بے رحم اور مغرور دشمن کے انتہائی توہین آمیز مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور
 کر دیا تھا۔ اس کی رعایا اس سے بد دل اور مایوس ہو چکی تھی۔ اور قسطنطنیہ کے درو دیوار اس کا مذاق اڑا رہے
 تھے اور وہ تاج جو سلطنتِ روم کی سطوت اور جبروت کا آئینہ دار تھا اسے غلامی کے طوق سے زیادہ
 بدنام محسوس ہوتا تھا۔ وہ ایک ایسی کشتی کا ناخدا تھا جس کے پینڈے میں سورخ ہو چکے تھے — اہل روم
 جو چند برس قبل اسے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اس کے رستے میں آنکھیں بچھاتے تھے اب اس کے وجود کو
 اپنے لیے ایک سزا سمجھتے تھے — لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ روم کی ذلت اور رسوائی کا آخری منظر
 دیکھنے کے بعد قدرت کی وہ ان دیکھی اور انجانی قوتیں اپنا تک حرکت میں آجائیں گی۔ جن کے اشاروں پر ان
 رحمت کا نزول ہوتا ہے اور بادِ محرم سے بھلے ہوئے بے جان حصارِ مزہ نادر بن جاتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم تھا
 کہ ان کا کردار، عیاش اور لے جس حکمران کسی دن اپنا تک خوابِ غفلت سے بیدار ہوگا اور وہ مردہ لگیں جن پر
 آگ کے انگارے بھی اثر انداز نہیں ہوتے، زندگی کے خون سے لبریز ہو جائیں گی۔ اگر کوئی رومی ذہنی نجات
 کے لیے ابھی تک مجھنے کا منظر تھا تو وہ بھی یہ سوچنے کے لیے تیار نہ تھا کہ قدرت کا کوئی معجزہ ہرقل کو اپنی
 اور بدلی کے قبرستان سے نکال کر بھیجے جاگتے انسانوں کی صف میں کھڑا کر سکتا ہے اور اہل روم اس کی قیادت
 میں کسی کامیابی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ ہاضی کے واقعات نے انہیں بار بار جس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنے پر
 مجبور کیا تھا وہ یہ تھی کہ روم کیلئے ہرقل کا سارہ مخوس ہے اور اگر قدرت کو ان کی جلتان مقصود ہے تو وہ انہیں
 جنگ کے کسی نئے میدان کا راستہ دکھانے سے پہلے ایک ایسے حکمران سے نجات دلانے کے اسباب پیدا کرے گی جو
 ہاضی کے امیر افواج حالات میں بھی انہیں شکستِ ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں دے سکا —
 لیکن چند برس قبل مکہ کی گلیوں میں پیغمبرِ اسلام کی جس چنگوٹی کا مذاق اڑایا گیا تھا اس کے پورا ہونے کا

— اور قیصر نے یہی راستہ اختیار کیا اور اس کی نیم جان رعایا کو ایسا صومس ہونے لگا کہ ان کے کمزور، بے بس اور عیاش حکمران کی ذہنیت کی تبدیلی کے ساتھ زمانہ بھی ایک نئی کروٹ بدل رہا ہے وہ کسان اور چرواہے جو صرف زندہ رہنے کے لیے ہر ذلت برداشت کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ اب آزادی یا موت کے نعرے لگاتے ہوئے ہر قل کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے اور وہ سپاہی جو جنگ کی صورت میں زیادہ سے زیادہ قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے اپنے خون کی رہی ہی پونجی لٹانے کے متعلق سوچ سکتے تھے اب اپنے سینوں میں مشرق کے ان شہروں اور قلعوں پر لیا کر کے کا حوصلہ پاتے تھے۔ جہاں برسوں سے عجزیت کی فتح کے پرچم لہرا رہے تھے۔ باز نظیلی حکمران اور اس کی رعایا کی یہ کاپلیٹ انسانی تاریخ کا ایک ناقابل یقین معجزہ تھا۔



ہر قل ایک طرف نئی فوج بھرتی کرنے اور دوسری طرف بحیرہ مارمورا اور ایشیائے باسفورس میں جہاز جمع کرنے میں مصروف تھا۔ باسفورس کے دوسرے کنارے ایران کے عظیم لشکر کے شیخے اب بھی دکھائی دیتے تھے لیکن اپنی زبردست تیاریوں کے باوجود ہر قل ایرانی لشکر پر براہ راست حملہ کرنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ ایسے حملے کی ناکامی کی صورت میں ایرانیوں کی جوابی کارروائی قسطنطنیہ کے لیے تباہی کا سامان پیدا کر سکتی تھی۔ اور فتح کی صورت میں بھی خشکی کے راستے مشرق کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے عقب میں رسد اور ٹھک کے طویل راستے غیر محفوظ ہو جاتے تھے۔ ایشیائے کوچک کی چوکیوں سے ایرانی لشکر کے معمولی دستے بھی ان کے لیے تباہی کا سامان پیدا کر سکتے تھے۔ ہر قل کے لیے نشئی کی بجائے سمندر زیادہ محفوظ تھا۔

پہنچنے تک تیاریوں کے بعد اس نے قسطنطنیہ کی حفاظت سینیٹ اور کلیسا کے اکابر کے سپرد کی اور پھر لشکر کو جہازوں پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ رومیوں کا یہ بیخبر کسی وقت کا نشانہ کئے بغیر ایشیائے کوچک کے مغربی اور جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ چلنا ہوا شام کے مغربی کونے سے قریب خلیج اسکندرون میں ننگر انداز ہوا اور اس کے بعد ہر قل نے اسوس کے قریب ڈیرے ڈال دیئے جہاں کسی زمانے میں سکندر اعظم نے دارا کو شکست دی تھی۔ ہر قل کا یہ اقدام خطرے سے خالی نہ تھا۔ اگر ایرانی حالات سے فائدہ اٹھانے کی

کوشش کرتے تو باسفورس کے مشرقی کنارے سے ان کی پیش قدمی قسطنطنیہ کے لیے تباہ کن ہو سکتی تھی اور ہر قل کو بذلت خود اس خطرے کا اس قدر احساس تھا کہ اس نے روانگی سے قبل جن لوگوں کو قسطنطنیہ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی تھی انہیں دشمن کا مقابلہ کرنے یا بحالت مجبوری اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا اختیار دے دیا تھا۔ لیکن خلفدوں کے آس پاس جمع ہونے والی ایرانی فوج کسی فوری اقدام کا فیصلہ نہ کر سکیں اور اس کے بعد جب ہر قل کا لشکر ایک ایسے مقام تک پہنچا جہاں سے اس کی پیش قدمی ایک طرف آرمینیا اور دوسری طرف شام کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی تو ایرانی اپنے عقب کو غیر محفوظ سمجھ کر قسطنطنیہ پر یتار کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

شام اور ایشیائے کوچک کی سرحدوں کے آس پاس پہاڑی علاقوں میں ایرانی لشکر کے ساتھ چند جہازوں کے بعد ہر قل نے موسم سرما کے دوران دریائے ہلس کے کنارے قیام کیا اور اس کے بعد قسطنطنیہ کے حالات نے اسے واپسی پر مجبور کر دیا۔ اس مہم میں ہر قل کو لٹا ہر کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے نتائج بہت دور رس تھے۔

اس نے رومیوں کو پہلی بار یہ احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ ان کے عاقبت پسند حکمران کی ذہنیت تبدیل ہو چکی ہے اور اپنی رعایا کے لیے وہ بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتا ہے۔ اس مہم کے بعد ایک طرف اس کی شکست خوردہ رعایا کے دل میں نئے حوصلے بیدار ہو چکے تھے اور دوسری طرف شام اور ایشیائے کوچک میں عیسائیوں کے ظلم و استبداد کی چکی میں پسنے والے عیسائی امید کی ٹلکی سی روشنی دیکھ چکے تھے۔ مفتوحہ علاقوں کے عیسائیوں نے جس جوش و خروش کے ساتھ رومی لشکر کا خیر مقدم کیا تھا، اُسے دیکھ کر ہر قل کے دل میں یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ مشرقی ممالک میں اس کی رعایا ابھی تک اسے نہیں بھولی۔ اور اگر وہ ایرانیوں کو کسی میدان میں فیصلہ کن شکست دے سکا تو یہ لوگ چاروں اطراف سے ان کے غلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ تاہم ایرانیوں کے نزدیک ہر قل کی یہ مہم ایک غماق سے زیادہ نہ تھی۔ اور جب دست گرد میں اس حملے کی اطلاع پہنچی تو عجمی کاہن اپنے حکمران کو یہ فزودہ سنا رہے تھے کہ فاتح عالم کے ہاتھوں سلطنت روم کی مکمل تباہی متحد ہو چکی ہے۔

اور پھر جب رومیوں کی واپسی کی اطلاع سننے کے بعد پرویز اور اس کے مصاحب مسترت کے قہقہے لگا رہے تھے، ہرقل ایک نئی نئی تیاریاں کر رہا تھا۔

○

”ہرقل کا بھلی بیڑا بحیرۃ اسود میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کے جہاز پر انہوں نے نزدیک لنگر لٹا دیا۔ ہرقل اور آرمینیا کے عیسائی جوئی درجوں اس کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے ہیں۔ کسریٰ پرویز کو کیے بعد دیکرے یہ ناقابل یقین اطلاعات پہنچیں اور پیشتر اس کے کہ وہ کسی جوانی کا روانہ کا فیصلہ کر سکتا، ہرقل آذربائیجان میں داخل ہو چکا تھا۔ پھر ایک دن اُسے یہ خبر ملی کہ ارمیہ ایران کا وہ قدیم شہر جہاں زردشت پیدا ہوا تھا، فرزدان صلیب کے ہاتھوں تباہ ہو چکا ہے اور وہاں ایران کے سب سے بڑے آتش کدہ کی مقدس آگ بجھ چکی ہے۔ جو سیوں کے نزدیک ارمیہ کی وہی حیثیت تھی جو عیسائیوں کے نزدیک یروشلم کی تھی۔ اور ایرانیوں کی لیٹار سے قبل جس قدر عیسائی اپنے مقدس شہر کو ناقابل تسخیر خیال کرتے تھے، اس سے کہیں زیادہ جو سی ارمیہ کے دفاع کے متعلق مطمئن تھے اور اس شہر کی تباہی کے بعد جو سیوں کے ظہور و ادول کے سچ و منظر کا وہی عالم تھا جو یروشلم کی تباہی کے بعد فرزدان تکیث نے محسوس کیا تھا۔ اور ایرانی سلطنت اب انہی حالات کا سامنا کر رہی تھی جو یروشلم کی شکست کے بعد بازنطینی سلطنت کو پیش آئے تھے۔ کاتب تقدیر کے ہاتھ انسانی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹ رہے تھے۔ اور تاریخ کے اس نئے ورق کی پیشانی پر ایک ایسی جنگ کی داستان بھی لکھی جا رہی تھی جو اپنے نتائج کے اعتبار سے ارمیہ میں روم و ایران کے معرکے سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ یہ بدر کے میدان میں ان تین سو زبردست مسلمانوں کی جنگ اور فتح کی داستان تھی، جن کا دین صرف وہ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے جبر و استبداد کے خلاف ایک اعلان جنگ تھا۔ کسی قبیلہ قوم یا نسل کی فتح نہ تھی۔ بلکہ اس ابدی صداقت کی فتح تھی جس کا پرچم محمد بنی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھا۔ ایک طرف ہرقل کے سپاہی ارمیہ میں ایرانیوں کی شکست پر خوشیاں منا رہے تھے اور دوسری طرف آتائے مدنی کے جان نثار بدر کی فتح پر اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سجدہ ریز تھے۔ اسی طرح ایک

صرف ایران کے جو سیوں اور دوسری طرف مکہ کے مشرکین کے گھروں میں ماتم ہوا تھا۔ وہ پیش گوئی جس کا باقی اڑھائی گنا اور جس کے خلاف مشرکین مکہ شرطیں بدنتے تھے پوری ہو رہی تھی۔ ایران پر روم اور رب پر اسلام کا غلبہ شروع ہو چکا تھا۔ تاہم ایران کے مغزور حکمران کے نزدیک ارمیہ کی شکست ایک حادثہ تھا۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ رومیوں نے ابھی تک اس کے عظیم لشکر کا سامنا نہیں کیا۔ اس نے ایک لڑائی میں ناکامی بردہ دیکھا تھا۔ لیکن فیصلہ کن معرکے ابھی پیش آنے والے تھے۔ اور یہی حال مکہ کے مشرکین کا تھا۔ میدان بدر میں فوج کی تعداد اور اسلحہ کی برتری کے باوجود ایک بڑا تنگ شکست ان کے لیے تکلیف دہ ضرور تھی۔ لیکن وہ یہ جانتے تھے کہ آگے والے معرکوں میں پورا عرب ان کی پشت پر ہوگا۔

○

ہرقل، شمال مغرب کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد قزوین اور اصفہان کا رخ کر رہا تھا۔ پرویز نے اس کی غیر متوقع کامیابیوں سے پریشان ہو کر مصر سے لے کر ایشیائے کوچک تک اپنی بیشتر افواج کو واپس بلا لیا۔ لیکن ان افواج کے اجتماع سے قبل ہرقل میڈیا اور آسریا کے کئی شہروں کو تباہ و برباد کر چکا تھا۔ دشمن کے خلاف کسی میدان میں فیصلہ کن جنگ لڑنے کی بجائے اس کی توجہ ان شہروں، قلعوں یا چوکیوں کی طرف تھی جہاں اُسے کسی شدید مزاحمت کی توقع نہ تھی۔ اگر کسی میدان میں ایرانی افواج کے اجتماع کی خبر ملتی تو وہ اپنا رخ بدل کر مہینوں کا سفر ہفتوں میں طے کرتا ہوا کسی ایسے قلعے یا مستقر پر حملہ کر دیتا، جہاں زیادہ آسانی کے ساتھ دشمن پر ضرب کاری لگائی جا سکتی تھی۔

بالآخر پرویز نے اپنی دور افتادہ چوکیوں سے جمع ہونے والے لاتعداد لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلی فوج جو پچاس ہزار آدمی کا سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ ہرقل کا سامنا کرنے کے لیے روانہ ہوئی۔ دوسری فوج کو رومیوں کے عقب میں بھیج کر ان کے رسد اور لگک کے راستے سدود کرنے کا حکم ملا۔ اور تیسرا لشکر پرویز کے ایک انتہائی تجربہ کار جرنیل سرمار کی قیادت میں فسطینہ پر ایک فیصلہ کن حملہ کرنے کی نیت سے حلفیہ طرف طرف روانہ ہوا۔

بروز کی اس کاروائی نے ہرتل کو بحیرہ اسود کے ساحل کی طرف ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اور یہاں مقامی لوگ ایک اولوالعزم فاتح کی حیثیت سے اس کا خیر مقدم کر رہے تھے اور عیسائی قبائل جن کے دل میں پہلی بار مجوسوں کے آہنی استبداد سے آزاد ہونے کی امید پیدا ہوئی تھی، جزئی درجہ جو اس کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے بڑے اسود کے کنارے پڑاؤ ڈالنے کے بعد ہرتل کسی نئے حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اپنے عقب میں ایک زبردست جنگی بیڑے کی موجودگی کے باعث اس کے لیے رسد اور ملک کا بحری راستہ محفوظ تھا۔ لیکن ایرانیوں کی پوری قوت کے ساتھ حرکت میں آچکے تھے اور حالات کی تبدیلی کے بغیر اسے کسی نئے محاذ پر کامیابی کی توقع نہ تھی۔ ایرانیوں کے منتظر ملک کے عیسائی باشندے جنہیں ہرتل کی فرطت نے امید کی روشنی دکھائی تھی زیادہ عرصہ اطمینان کا سانس نہ لے سکے۔ ایرانی جرنیل جیسے تسطنظیہ پر ضرب لگانے کی ہم سوچی گئی تھی۔ غلقدون پہنچ چکا تھا اور اس کی پہلی کامیابی یہ تھی کہ سستین قبائل کا خاقان جسے رومیوں نے اس امید پر لاکھا اشرفیاں نذر کی تھیں کہ وہ ہرتل کی پیش قدمی کے دوران حیر جاندار رہے گا۔ ایرانیوں کا طبع بن چکا تھا۔ اور اس کے جھنڈے تلے اسی ہزار وحشی مضامفات کی بستریوں کو تباہ ویران کرنے کے بعد تسطنظیہ کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔

روم کے دارالحکومت کو اس سے بڑا خطرہ آج تک پیش نہیں آیا تھا۔ شہر کے اکابر خاقان کو صلح پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر چکے تھے۔ لیکن ان کی التجائیں بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ جب معززین شہر کا وفد خاقان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ایرانی جرنیل کے نمائندے اس کے دائیں بائیں رونق افروز تھے۔ رومی سونے اور چاندی کے تحائف لے کر گئے تھے۔ لیکن خاقان نے ان کی التجائیں سننے کے بعد انتہائی سفارت آمیز لہجے میں کہا: تمہاری طرف سے یہ خیر علاج ہمیں مطمئن نہیں کر سکتا۔ ہمارے لیے صرف تسطنظیہ کا نذرانہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔ تمہارا حکمران اگر کہیں بھاگ نہیں گیا۔ تو وہ اب تک ایرانیوں کی قید میں ہو گا۔ تسطنظیہ

خاقان کا یہ شکر آمادہ قبائل کے علاوہ ان روسی اور ہناری قبائل پر مشتمل تھا جو اس کے باج گزار اور حلیف تھے۔

بہار سے رحم و کرم پر ہے اور تم اگر پرندے بن کر ہو ا میں پرواز نہ کرسکتے لگ جاؤ یا چھبلیاں بن کر سمندر میں زلے نہ لگا دو تو ہمارے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔

جب روم کے اچھی خاقان کے کیپ سے باہر نکلے تو ان کے جسم پر اسی قسمیوں اور زیر جاموں کے سوا کچھ نہ تھا۔

اس کے بعد آوار قبائل کے پے پے حملوں کے دس دن اہل شہر کے لینے قیامت کے دن تھے۔ وہ دباؤں کی مدد سے شہر سپاہ پر کئی بار بلغار کر چکے تھے اور لکڑی کے بارہ بلند میناروں سے ان کے منجھتیے پناہ مانگ باری کر رہے تھے۔

آہنائے باسفورس کے پار ایرانی جرنیل ایک بھوکے عقاب کی طرح اپنے نیم مردہ شکار پر چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رومیوں کی قوت مدافعت جواب دے چکی تھی۔ اور وہ ولولہ جو ہرتل کی غیر متوقع کامیابیوں کے باعث بیدار ہوا تھا بند ترح سرد پڑ رہا تھا۔ اپنے حکمران کے متعلق اب انہیں یہ علم بھی نہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے جس تباہی کو وہ برسوں سے ٹال رہے تھے وہ ہر لمحہ ان کے قریب آ رہی تھی۔

پھر ایک دن بحیرہ اسود کی طرف سے ایک جنگی بیڑا آہنائے باسفورس میں نمودار ہوا۔ اور تسطنظیہ کی فیصلوں کے نکلنے ہارے محافظ چلانے لگے۔ ”ہرتل آ رہا ہے۔ رخ دلنے ان کی دعائیں سن لی ہیں، لیکن ہرتل اس بیڑے کے ساتھ نہیں تھا۔ اس نے اپنے محاذ پر موجود رہنا ضروری سمجھتے ہوئے اپنے لشکر کے بارہ ہزار جوان اہل شہر کی مدد کے لیے بھیج دیئے تھے۔ روم کے اس عظیم بیڑے نے کسی دقت کا سامنا کیے بغیر آہنائے باسفورس میں دشمن کی چھوٹی چھوٹی گشتیاں تباہ کر دیں۔

آہنائے باسفورس کے پار ایرانی سپہ سالار ایک بے بس تماشائی کی حیثیت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اور آہنائے باسفورس کے بعد بدولی کا شکار ہو رہے تھے رومیوں کے اس غیر متوقع حملے کی تاب نہ لاسکے۔ اس کے ہناری اور روسی حلیف مال غنیمت میں حصہ دار بننے کی امید پر جان کی بازی لگا سکتے تھے۔ لیکن اب انہیں فوری فتح غیر یقینی معلوم ہوتی تھی۔ انہیں یہ بھی شکایت تھی کہ اس جنگ میں ان کے ایرانی حلیفوں کا بال تک بیکام نہیں ہوا۔ چنانچہ خاقان نے انہیں محاصرہ اٹھانے کا حکم دیا۔ اور وہ منظم

طریقے سے سپا ہونے لگے۔

تسطنظینہ کی تاریخ کا ایک اور نازک لمحہ گزر چکا تھا۔ لیکن بازنطینی سلطنت کے افق پر ابھی تک تلک آنڈیاں مسلط تھیں۔ پرویز کی فوجی قوت کا اب بھی یہ عالم تھا کہ وہ پانچ لاکھ سپاہی میدان میں لاسکتا تھا۔ تسطنظینہ سے تلماری قبائل کی واپسی کے باوجود وہ اپنی فتح سے ناامید نہیں ہوا تھا۔ مقدون کے پڑاؤ میں ایرانی فوج کی تعداد آئے دن بڑھ رہی تھی اور یہ فوج کسی وقت بھی ہرقل کے دارالسلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتی تھی۔ تسطنظینہ سے سیکڑوں میل دور ہرقل کی شکست یا سپاہی رومیوں کے لیے محکم تباہی کا پیش خیمہ ہو سکتی تھی۔ انہوں نے جو فتوحات حاصل کی تھیں وہ نقصانات کے بغیر نہ تھیں۔ اور ان نقصانات کے بعد وہ کسی میدان میں ایرانیوں کے لاتعداد لشکر کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اس کے برعکس ایرانیوں پر گذشتہ شکستوں کا اثر ایک مہیب ہامتی کے جسم پر چند زخموں کے اثرات سے زیادہ نہ تھا۔ ان حالات میں ہرقل کو شمال میں اید کی ایک ہلکی سی رشتہ دہائی دی۔ اس نے دریائے الگا کے اس پار وسیع میدانوں میں پھیلے ہوئے ترک قبائل کے حکمران کی طرف دوستی کا پیغام بھیجا۔ اور یہ لوگ جو خزانہ کلاتے تھے اپنے خیموں اور ویشیوں سمیت جارجیا کی طرف چل پڑے۔ ان جنگجو ترکوں کے حکمران کا نام زیل تھا۔ ہرقل نے ظفلس کے قریب اس کا خبر مقدم کیا۔ اور اپنا تاج اتار کر اس کے سر پر رکھتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ تم میرے بیٹے ہو۔ پھر اس کے ساتھ آنے والے سرداروں کے لیے ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا اور انہیں اپنے ہاتھ سے قیمتی قبائش اور سونے اور چاہرات کے تحائف تقسیم کیے۔ اس کے بعد اس نے ترکوں کے جواں سال حکمران کے ساتھ تخیل میں ملاقات کی اور اپنے حسین بیٹی ایدوسہ کی تصویر دکھانے کے بعد اس کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا۔

ترک سردار اپنے حکمران کی اس غیر متوقع حیرت افزائی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان کے چالیس ہزار سوار ہرقل کے جھنڈے سے جمع ہو گئے۔ اب ہرقل کے لشکر کی تعداد مجموعی ستر ہزار سپاہیوں تک پہنچ چکی تھی۔ تاہم وہ وسطی ایران کی طرف پیش قدمی کر کے پرویز کے لاتعداد لشکر سے فوری نقصان کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ چنانچہ وہ کچھ عرصہ تک کبھی آرمینیا اور کبھی شام کی چوکیوں پر حملے کرتا رہا۔ سردار کی قیادت میں باسنورس کے مشرقی کنارے پر ایرانی لشکر کے اجتماع نے ہرقل

کے عقب کے لیے ایک مستقل خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ ان حالات میں اس کے لیے مشرق کی طرف پیش قدمی کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ لیکن قدرت نے ایک بار پھر اس کی مدد کی۔

ایک دن پرویز کا ایلچی سردار کے نائب کے نام یہ حکمانہ لے کر پہنچا کہ تم اپنے بزدل اور غدار سپاہیوں کو سزا دے کر ہمارے پاس بھیج دو اور لشکر کی قیادت خود سنبھال لو۔ لیکن ایلچی نے پرویز کا یہ خط غلطی سے یاد دہا کر دیا۔ سردار کے ہاتھ میں دے دیا۔ سردار کو اپنے بے رحم آقا کے متعلق پہلے بھی کوئی خوش فہمی نہ تھی چنانچہ اس نے پرویز کی طرف سے ایک جعلی حکمانہ تیار کیا اور اس میں فوج کے چار سو چودہ چودہ افسروں کے نام لکھ دیے۔ پھر اس نے اپنے افسروں کا اجلاس بلایا اور بھری مجلس میں پرویز کا حکم نامہ سنانے کے بعد اپنے نائب سے سوال کیا: "کس نے نہیں ان چار سو افسروں کے سر قلم کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیا تم اس کام کے لیے تیار ہو؟"

سردار کا نائب کوئی جواب نہ دے سکا۔ اور فوج کے سرداروں نے منفقہ طور پر اپنے ظالم حکمران کی بنیاد بناؤت کا جھنڈا بلند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن سردار نے ان کا جوش و خروش ٹھنڈا کرنے کے بعد کہا: "ہم اب رومیوں کے ساتھ شامل ہو کر اپنے ملک پر چڑھائی نہیں کریں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ہم اس جنگ میں غیر جانبدار ہو جائیں۔" ایرانی سرداروں نے اپنے سپہ سالار کی یہ تجویز مان لی۔ اور سردار نے ہرقل کو یہ پیغام بھیج دیا کہ میرے سپاہی تمہارے خلاف آئندہ کسی جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔

۱۔ خلعون کے ایرانی لشکر کا سپہ سالار۔

۲۔ بعض روایات کے مطابق یہ ایلچی پرویز کی طرف سے نہیں آیا تھا، بلکہ ہرقل نے ایرانی لشکر کو پرویز سے

بظن کرنے کے لیے ایک کامیاب سازش کی تھی۔

مسودہ سے دور روکنے کی بجائے انہیں آگے بڑھنے کا موقع دے کر کسی ایسے میدان میں گھیرنا چاہتا تھا، جہاں سے اُن کے لئے پیچھے ہٹنے کے تمام راستے مسدود ہو جائیں۔

لیکن ان حالات میں اللہ کے اُس برگزیدہ رسول نے اُس کے پاس اپنا ایلچی بھیجا تھا، جس کی ظاہری حکمرانی ابھی تک مہاجرین مکہ اور انصارِ مدینہ کے قلوب تک محدود تھی، اُسے ایک ایسے فرمانروا نے طاقت کی دعوت دی تھی، جس کے جاں نثاروں کو پیٹ بھر کر دو وقت کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ جس کے پاس کوئی ناقابلِ تسخیر قلعہ یا کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی۔ اور جو مال و دولت کے اُن تمام ظاہری وسائل سے محروم تھا جو ایک انسان کو دوسرے انسان پر بالادستی عطا کرتے ہیں۔ پھر آج تک دنیا کے کسی انسان نے اپنے خط میں بحکلاء ایران کے نام سے پہلے اپنا نام لکھنے کی جسارت نہیں کی تھی۔

جب شاہی مترجم اس خط کا مضمون سنا رہا تھا تو حاضرین دربار جن کے لئے یہ تحریر ایک نذرانہ سے زیادہ نہ تھی، بڑی مشکل سے اپنے قبضہ ضبط کر رہے تھے۔ کسریٰ کچھ دیر غصتے اور اضطراب کی حالت میں قاصد کی طرف دیکھتا رہا۔ اچانک اُس نے مترجم کے ہاتھ سے حضور کا نام مبارک پھین کر اُسے پُرنے پُرنے کر دیا اور پھر مین کے حاکم باذان کے نام یہ فرمان لکھوایا کہ نبوت کے اس مدعی کو جس نے ہمارے ساتھ مخاطب ہونے کی جسارت کی ہے گرفتار کر کے ہمارے پاس بھیج دو۔

ایران کے مفرد اور جابر حکمران کے لئے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا خط اس قدر غیر اہم تھا کہ حضور کے قاصد کو سزا دینے میں بھی اُسے اپنی توہین محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ جس خط کو اُس نے چاک کیا تھا، اُس کی تحریر یوں محفوظ پر منتقل ہو چکی تھی۔ اور جب حضور کا قاصد بے سرو سامانی کی حالت میں واپس جا رہا تھا تو اُس وقت یہ کون کہہ سکتا تھا کہ اُس کے پاؤں کے نشانِ حفریب اُن مجاہدوں کی گورگاہ بننے والے ہیں جو مدینے کی گلیوں میں جہان بانی کے نئے آداب سیکھ رہے ہیں۔

پرویز اور اُس کے درباری صرف اتنا جانتے تھے کہ جب یمن کے گورنر کا ایک معمولی قاصد اہل مدینہ کو یہ پیغام دے گا کہ تم اگر اپنی غیرت چاہتے ہو تو محمد کو ہمارے حوالے کر دو تو عرب کے کسی فائدان یا قبیلے کو مزاحمت کی جرأت نہیں ہوگی۔

باب ۳۸

فدا سے رحمن و رحیم کے نام سے

محمد پیغمبر کی طرف سے کسریٰ رئیسِ فارس، کے نام

سلام ہے اِس شخص پر جو بدایت کا پیرو ہو اور خدا اور اُس کے نبی پر ایمان لائے ہو۔ یہ گواہی دے کہ خدا صرف ایک خدا ہے اور اُس نے مجھے ساری دنیا کا پیغمبر مقرر کر کے بھیجا ہے، تاکہ وہ ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلائے۔ تو اسلام قبول کر تو سلامت رہے گا، ورنہ جو سیوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔

بحکلاء ایران کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خط اُس وقت ملا جب کہ وہ اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ دریائے کرسو کے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ شام اور آرمینیا سے اُسے رومیوں کی پیش قدمی کے متعلق تشویش ناک خبریں آرہی تھیں، تاہم جنگ کے آخری نتائج کے متعلق اُسے کوئی پریشانی نہ تھی وہ دن کے وقت سیر و شکار سے اور رات کے وقت رقص و سرود اور سے نوشی کی محفلوں سے دل بہلاتا تھا اور اُس کے مصاحب ہر تشویش ناک خبر کے بعد اُسے یہ یقین دلانے کی کوشش کیا کرتے تھے کہ ہر نوابِ بلاکت کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اور جب کسی کھلے میدان میں فیصلہ کن معرکہ ہوگا تو ردی شکر کو مکمل تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور پرویز کی خود اعتمادی بلاوجہ نہ تھی۔ ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے اُس کی محفوظ افواج کی تعداد رومیوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ میدانی علاقوں میں صرف اُس کے ہاتھیوں کی تعداد ہی ہرتل کے لشکر کو روندنے کے لئے کافی تھی۔ اس لئے وہ رومیوں کو اپنی آبائی سلطنت کی شمال مغربی

بہرقل اور اس کے ترک اتحادیوں کے لشکر نے دریائے اراس کے آس پاس کے علاقوں میں تباہی مچانے کے بعد جنوب کی طرف پیش قدمی کی اور وجہ کے کنارے اُس وسیع میدان میں ڈیرے ڈال دیئے، جہاں اچھوتک نینوا کے کھنڈرات دکھائی دیتے تھے۔ اس عرصہ میں ایرانی لشکر کے سپہ سالار کوجس کی کارگزاری اچھی تک معمولی حملوں کے بعد دشمن کا تعاقب جاری رکھنے تک محدود تھی، ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کا حکم چکا تھا۔

چنانچہ ایک صبح روم اور ایران کے لشکر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ پھر سواروں اور پیادوں کی صفیں حرکت میں آئیں اور نینوا کا میدان گردوغبار کے بادلوں میں چھپ گیا۔ اس خونریز معرکے میں بہرقل کی ذاتی شجاعت اُس کے دوستوں اور دشمنوں کے لئے یکساں حیران کن تھی، وہ جاں نثاروں کے ایک دستے کے ساتھ دشمن کی صفیں چیرتا ہوا اُن کے قلب تک جا پہنچا۔ ایرانی لشکر کے سپہ سالار کے علاوہ دو مشہور سردار اُس کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ایک ایرانی کا نیزہ لگنے کے باعث اُس کا ہونٹ کٹ چکا تھا اُس کے مشہور گھوڑے کی ایک ٹانگ زخمی ہو چکی تھی، تاہم وہ دشمن کا گھیراؤ کر واپس اپنے لشکر سے آگلا۔ اور وہی جوانیوں کے سپہ سالار کی ہلاکت کی خبر سن کر شیر ہو گئے تھے بے توجہ شاہ دشمن پر ٹوٹ پڑے اور ایرانی جن کے نزدیک اپنے سپہ سالار کی موت ایک بدترین شگون تھا، سراسمگی کی حالت میں پیچھے ہٹنے لگے۔

جب آہستہ آہستہ نینوا کے میدان سے گردوغبار چھٹنے لگا، تو وہ جو اپنی تعداد اور اپنے اسلحہ کی برتری کو اپنی فتح کی ضمانت خیال کرتے تھے، اپنے پیچھے لاتعداد لاشیں دیکھ رہے تھے۔ اور وہ جنہیں کمزور اور حقیر خیال کیا گیا تھا، اُن کے بکھرے ہوئے پرچم روند رہے تھے۔ ایرانیوں نے کئی بار جوابی حملے کئے لیکن رومیوں کے جوش و خروش نے انہیں پاؤں جانے کا موقع نہ دیا۔

غروب آفتاب کے وقت وہ میدان کا زار سے ایک طرف ہٹ کر اُس روضہ صفیں باندھ رہے تھے جنگ کے میدان میں تلواروں کی جھنکار اور لڑنے والوں کے نعروں کی بجائے دم توڑنے والے زخمیوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ رومیوں کو اب بھی اس بات کا یقین تھا کہ ایرانی راہ فرار اختیار کرنے کی بجائے

پھر قسمت آزمائی کریں گے لیکن جب آسمان پر ستاروں کا تافلہ نمودار ہونے لگا تو کسری کی شکست خوردہ فوج اچانک اپنے پاؤں کی طرف ہٹنے لگی۔ بہرقل کے سپاہی رات بھر جنگ میں کام آنے والے ساتھیوں کی لاشیں دفن کرنے اور زخمیوں کی مزہم پٹی میں مشغول رہے اور علی الصباح انہیں یہ معلوم ہوا کہ دشمن کا پاؤں خالی ہو چکا ہے۔ نکلے ہوئے رومیوں کو اس غیر متوقع فتح کے بعد آرام کی ضرورت تھی لیکن انہوں نے دشمن کا پیچھا کرنا زیادہ ضروری خیال کیا۔

رومی لشکر پہلی بار آسرامیہ کے زرخیز میدانوں میں فتوحات کے جھنڈے گاڑتا ہوا آگے بڑھا۔ چند دن بعد دست گرد کا عظیم شہر ایک عبرتناک تباہی کا سامنا کر رہا تھا۔ شاہی محل آگ کا ایک مہیب آلاؤ نظر آتا تھا اور پوپز جو رومیوں کی آمد سے نودن قبل وہاں سے فرجکڑ ہو چکا تھا، مدائن کا رخ کر رہا تھا۔

ایک دن میں کے ایرانی گورنر باذان کے دربار میں سرکاری عہدہ داروں کے علاوہ چند مقامی عرب اور یہودی رؤسا جمع تھے۔ ایک فوجی افسر اندر داخل ہوا اور اس نے مسند کے قریب پہنچ کر کہا: "جناب دالابدرینہ سے ہمارے ایلچی واپس آگئے ہیں اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔"

باذان نے قدرے مضطرب ہو کر کہا: "انہیں فوراً حاضر کرو۔"

افسرداد سے سلام کرنے کے بعد واپس چلا گیا اور عقوڑی دیر بعد دو آدمی جن میں سے ایک کا نام بابویہ اور دوسرے کا تضرہ تھا، کمرے میں داخل ہوئے اور آداب بجالانے کے بعد سہمی ہوئی نگاہوں سے باذان کی طرف دیکھنے لگے۔

باذان نے کہا: "تمہاری صورتیں تباہی ہیں کہ تمہیں اپنی ہمہ میں کامیابی نہیں ہوئی۔"

بابویہ نے جواب دیا: "عالیجاہ یہ درست ہے کہ ہمیں اپنی ہمہ میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن آپ کی ہمہ حکم تھا کہ اگر ہماری دھکیاں بے اثر ثابت ہوں تو ہمیں اس نبی کے حامیوں کے ساتھ الجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔"

بازان نے سوال کیا۔ تم نے اس سے یہ کہا تھا کہ ہم تمہیں شہنشاہ عالم کے حکم سے گرفتار کرنے آئے ہیں۔؟

بابویر نے جواب دیا۔ ہاں، عالیجاہ! ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم نے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو ہمارے شہنشاہ کا ایک اشارہ پورے عرب کی تباہی کے لئے کافی ہوگا۔
”پھر اُس نے کیا جواب دیا؟“

بابویر نے پریشانی اور اضطراب کی حالت میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد جواب دیا۔ عالیجاہ آپ کا غلام بھرے دربار میں اُس کے الفاظ دہرانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

بازان نے حکمانہ انداز میں کہا۔ ہم اُس کے الفاظ سننا چاہتے ہیں۔

بابویر نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ عالیجاہ اُس نے یہ کہا تھا کہ تم ہماری طرف سے یہ پیغام لے جاؤ کہ مسلمانوں کی حکومت محض تیرب کسریٰ کے پایہ تخت تک پہنچنے والی ہے۔

دربار میں ایک سناٹا چھا گیا۔ پھر حاضرین آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے اور اُن کی خفارت آمیز مسکرائیں قہقہوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ لیکن بازان ایک غیر متوقع سفیدگی کے ساتھ اپنے ایلچیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اہل دربار کو اُس کی حوصلہ شکن نگاہوں نے زیادہ دیر سہنے کا موقع نہ دیا۔ اور دربار میں پھر ایک بار سناٹا چھا گیا۔

بازان نے ایلچیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ تم نے مدینہ کے سرگردہ لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ شہنشاہ کا خطاب اُن کے لئے عبرت ناک تباہی کا باعث ہوگا۔

بابویر نے خرسرہ کی طرف دیکھا اور اُس نے جواب دیا۔ عالیجاہ جو لوگ اس نبی کی صداقت پر ایمان لائے ہیں، اُن پر ہماری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اس بات پر خوشیاں منا رہے تھے کہ اُن کی حکومت ایران تک پہنچنے والی ہے۔ ہمیں زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ جب اُس نے بھری مجلس میں یہ اعلان کیا تو کسی نے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ ہم کس وقت کے بل بوتے پر دوٹے زمیں کی حظیم ترین سلطنت پر فتح حاصل کریں گے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر وہ یہ دعویٰ کر دے کہ میں آسمان کے ستارے فوج

کو تہارے سامنے ڈھیر کر سکتا ہوں تو بھی کوئی یہ سوال کرنے کی جرأت نہیں کرے گا کہ آپ کے ہاتھ ستاروں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔“

بابویر نے کہا۔ عالیجاہ! ہم نے انہیں مرعوب کرنے کے لئے اپنے لافنداد لشکر اور اپنے حبیبِ ہمتیوں کا ذکر کیا، لیکن اُن کی باتوں سے ہمیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ انہیں بھیڑ، بکریوں سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے اُن کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کی ایک ہی آواز ہے کہ ہم خدا کی زمین پر اُس کے نبی کے دین کا بول بالا کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، اور جب ہمارا ناری ہمیں جہاد کا حکم دے گا تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔“

بازان نے پوچھا۔ تم نے مدینہ کے مسلمانوں سے یہ نہیں پوچھا کہ تمہارے ہاتھیوں، گھوڑوں اور اسلحہ خانوں کی تعداد کیا ہے اور ایران فتح کرنے کے لئے تم نے جو سپاہی تیار کئے ہیں۔ وہ کہاں ہیں؟

بابویر نے جواب دیا۔ عالیجاہ! ہمیں یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہم اپنی آنکھوں سے اُن کی عزت کا نظارہ دیکھ آئے ہیں، ہم نے اُن کے آقا کو گھوڑ کی چٹائی پر آرام کرتے دیکھا ہے۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ اہل مکہ نے دوسری جنگ میں انہیں شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اور اب اگر قریش کے ساتھ چند اور قبائل متحد ہو گئے تو مسلمانوں کے لئے عرب کی زمین میں سانس لینا ناممکن ہو جائے گا۔ واپسی پر نخلہ اور طائف کے مقامات سے گزرتے ہوئے ہمیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ عربوں کے سینے میں مسلمانوں کے خلاف غصے اور نفرت کی جو آگ سلگ رہی ہے اُسے مسلمانوں کے گھروں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔ ہم یثرب کے یہودیوں سے بھی ملے تھے اور ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدینہ سے مسلمانوں کے اخراج کے لئے تمہارا اُن کی طاقت بھی کافی ہے۔“

بازان نے کہا۔ میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم مسلمانوں کے نبی کو گرفتار کرنے کے لئے سواروں کا ایک دستہ مدینہ بھیج دیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

بابویر نے جواب دیا۔ عالیجاہ! مجھے یقین ہے کہ راستے کے تمام قبائل اور مدینہ کے یہودی ہمارا ساتھ دیں گے۔ لیکن مسلمان اپنے نبی کی خاطر جان دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔“

”تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ ہماری اور ہمارے ملیغوں کی طاقت سے قطعاً محروم نہیں ہوں گے؟“
 ”ہاں عالیجاہ! یہ لوگ اپنے خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔“

ایک یہودی نے کہا۔ ”اگر یہ گستاخی نہ ہوتی تو میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔“
 ”کہو۔“

”عالیجاہ! میرے نزدیک یہ باتیں ایک مذاق سے زیادہ نہیں۔ آپ مدینہ میں چند سطح سپاہی بھیج کر دیکھ لیں، مجھے یقین ہے کہ مدینہ کے کسی ذمی شعور انسان کو مزاحمت کی جرات نہیں ہوگی۔ مسلمان جس بے جا لگی کی حالت میں مکہ سے نکالے گئے تھے، اُس سے زیادہ بے جا لگی کی حالت میں وہ مدینہ سے بھاگیں گے۔ ایک عرب رئیس نے کہا۔ ”عالیجاہ! مسلمانوں کو اگر اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو جیسا کہ آپ کے لئے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتے۔ اس وقت ہم صرف کسریٰ کی فتح اور ہرقل کی شکست کی خوشخبری سننا چاہتے ہیں۔ نینوا کی جنگ کے متعلق جو اطلاعات یہاں پہنچی ہیں، اُن سے آپ کی رعایا بہت پریشان ہے۔“
 باذان نے کہا۔ ”تم ہماری رعایا کو یہ تسلی دے سکتے ہو کہ ہرقل جس قدر آگے بڑھے گا، اُسی قدر اُس کی پہلی کے اسباب مکمل ہوتے جائیں گے۔ اگر اُس نے دست گرد کی طرف پیش قدمی کا ارادہ بدل نہ دیا تو تم عنقریب اُس کی جہزناک شکست کی خبر سنو گے۔“

بابویر نے کہا۔ ”عالیجاہ! مدینہ کے مسلمانوں کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ نو برس گزر جانے کے بعد بھی اِس مضحکہ خیز پیش گوئی پر اُن کا ایمان متزلزل نہیں ہوا کہ اِس جنگ کا آخری نتیجہ رومیوں کے غلبہ کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ ان لوگوں کے سامنے جب ہم اپنی فوجی قوت کا ذکر چھیڑتے تھے تو وہ سب یہی کہتے تھے کہ اُن کے نبی کی پیش گوئی کے پورا ہونے کے دن قریب ہیں۔“

ایرانی افسر غضب ناک ہو کر بابویر کی طرف دیکھنے لگے، اور باذان نے اپنا اضطراب چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر سپاہیوں کی تلواریں کسی جنگ کا فیصلہ کر سکتی ہیں تو میں نہیں یہ اطمینان دلا سکتا ہوں کہ رومیوں کی قسمت کا فیصلہ ایرانی سپاہیوں کی تلواروں سے لکھا جائے گا۔ لیکن اگر ہمارے خلاف کوئی اُن دیکھی اور اُن جانی قوت میدان میں آچکی ہے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

ایک یہودی نے کہا۔ ”ہمیں ایک ایسے نبی کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ جس کے پیش بھر پور مدینہ میں جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔“

باذان کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن ایک نوجوان بھاگتا ہوا کرے میں داخل ہوا اور اُس نے بلند آواز میں کہا۔ ”عالیجاہ! مدائن سے قاصد آئے ہیں اور وہ اسی وقت باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔“

تین آدمی جن کی قبائیں گرد سے اٹی ہوئی تھیں، دروازے کے سامنے نمودار ہوئے اور پہرہ داروں کے احتجاج سے بے پردا ہو کر اندر چلے آئے، ایک نوجوان نے جس کے ہاتھ میں ایک مراسلہ تھا، مسند کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”حضور! ہم اِس گستاخی کے لئے معذرت چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارے لئے کسی تافیر کے بغیر آپ کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری تھا۔ ہم مدائن سے ایک اہم پیغام لے کر آئے ہیں، یہ لیجئے۔“
 باذان نے اپنا ہاتھ بڑھا کر مراسلہ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ مدائن سے تم کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئے۔“

قاصد نے سر جھکا دیا۔ ”باذان نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مراسلہ کھولا اور حاضرین دیر تک سکتے کے عالم میں اُس کے چہرے کا آثار چڑھاؤ دیکھتے رہے۔ بالآخر اُس نے ایک لمبی سانس لینے کے بعد حاضرین مجلس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مسلمانوں کے نبی کی پیش گوئی پوری ہو چکی ہے۔ دست گرد تباہ ہو چکا ہے۔“
 دربار میں چند تانے ایک سکوت طاری رہا، بالآخر اِس کے مجوسی کاہن نے جو باذان کے دائیں ہاتھ رونق افروز تھا کہا۔ ”یہ خبر بہت بُری ہے، لیکن دست گرد کے فتح ہو جانے سے، ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ فیصلہ کن جنگ مدائن کی گلیوں میں لڑی جائے گی اور ہمارا شہنشاہ دشمن کو ایک عبرت ناک شکست دینے کے بعد قسطنطنیہ کے محل تک قاصر کا بیچا کرے گا۔“

باذان نے کہا۔ ”ایران کا وہ شہنشاہ جس کا نام پرزیز تھا، مر چکا ہے، اور تمہارے نئے حکمران کا نام شیرویر ہے۔“

چہرہ: ”اُحد سے مخاطب ہوا۔“ یہ خط بہت مختصر ہے، اس لئے میں تمہاری زبان سے ساری تفصیلات سننا چاہتا ہوں۔“

خاصہ نے باذان کے حکم کی تعمیل کی اور حاضرین دم بخود ہو کر دست گرد کی تباہی اور پردیز کے عبرت ناک انجام کی تفصیلات سننے لگے۔



یہ واقعات جس قدر ناقابل یقین تھے اسی قدر عبرت ناک تھے۔ پردیز کو فینو ایک شکست کے بعد دست گرد کی طرف ہرقل کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو اس کے خوف و اضطراب کا یہ عالم تھا کہ وہ رومیوں کی آمد سے نودن قبل اپنے وزیروں اور جنیوں سے مشورہ کئے بغیر رات کے وقت ایک چور دروازے سے نکل کر مدائن کی طرف چل دیا۔ اُس کی سرسبکی کا یہ عالم تھا کہ شاہی حرم کی تین ہزار عورتوں میں سے شیریں اور صرف تین لونڈیاں اُس کے ساتھ تھیں۔ باقی رات اُس نے دست گرد سے کچھ فاصلے پر ایک کسان کے جھونپڑے میں گزاری، تیسرے دن وہ مدائن میں داخل ہوا اور اُس کے بعد اُسے اپنی افواج اور اپنے خزانے جمع کرنے کی فکر ہوئی۔

دست گرد کی فوج نے اپنے بزدل حکمران کی اطاعت سے زیادہ رومیوں کے خوف کے باعث اُس کے احکام کی تعمیل کی۔ اور افرانقری کے عالم میں جو خزانہ اُن کے ہاتھ لگا اُس کو لے کر مدائن کی طرف چل پڑا شاہی حرم کی تین ہزار کنیزیں بھی مدائن کے قریب ایک نلے میں پہنچا دی گئیں۔

قیصر کا لشکر ایک آتشیں طوفان کی طرح دست گرد پر نازل ہوا۔ اور کسریٰ کے حملات اگ کے مہیب الاؤ دکھائی دینے لگے۔ دست گرد میں رومی فوج کے حصہ کا بیشتر کام ہرقل کی آمد سے پہلے ختم ہو چکا تھا۔ وہ ہزاروں غلام جنہیں مغرب کے مغتوبہ ممالک سے ہانک کر دست گرد میں جمع کیا گیا تھا اور جو برصوں سے انتہائی بے چارگی کی حالت میں یوم حساب کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے ایرانی لشکر کے نکلنے ہی شہر میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا طوفان بپا کر دیا۔ جب ہرقل کا لشکر شہر میں داخل ہوا تو اس کی گلیوں اور بازاروں میں اُن بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں، جنہیں اپنے عیسائی غلاموں سے بچ کر بھاگنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایرانی دست گرد کی بیشتر دولت نکال کر لے گئے تھے۔ لیکن اِس کے

وجود جو سونا اور چاندی ہرقل کے ہاتھ لگا وہ اُس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ دست گرد کے آشوب سے کوپند زمین کرنے اور شاہی عملات کو آگ لگانے کے بعد ہرقل نے مدائن کا رخ کیا۔ لیکن اِس عرصہ میں ایرانیوں کو سنبھلنے کا موقع مل چکا تھا۔ مشرقی علاقوں کی افواج ساسانیوں کے قدیم دار الحکومت کو بچانے کے لئے جمع ہو رہی تھیں۔ مدائن کے قریب پہنچ کر ہرقل کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ اُس کا لشکر کئی ہفتوں کی مسلسل بے آرامی کے باعث نڈھال ہو چکا ہے اور اس حالت میں اُس کے لشکر ایران کے اُس عظیم شہر پر طغیان کرنا خطرے سے خالی نہیں، جس کے باشندے فوج کی اعانت کے بغیر بھی کئی دن تک اُس کے لشکر کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ دست گرد میں اسے جو غیر متوقع کامیابی حاصل ہوئی تھی، اُس کی وجہ پردیز کی بزدلی تھی، لیکن مدائن کی آبادی پر پردیز سے زیادہ اُن مغزداروں اور محوس کا ہنوں کا اثر تھا جو اِس کی بقا اور سلامتی کو پورے ایران کی بقا اور سلامتی کا مسئلہ سمجھتے تھے اور جن کی قدیم روایات سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے حکمران کو بزدلی اور بے خبری کا ایک اور مظاہرہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

ہرقل اتنی عظیم فتوحات کے بعد کسی ناکامی یا شکست کا معمولی خطرہ مول لینے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے مزید تیاریوں کے بعد ایران پر آخری ضرب لگانے کی نیت سے اپنے لشکر کو واپسی کا حکم دیا۔ اب اُس کی منزل مقصود تبریز کا علاقہ تھا، جہاں پڑاؤ ڈال کر وہ اطمینان کے ساتھ ایک نئے حملے کے لئے تیاریاں کر سکتا تھا۔ جب وہ آسریا کے میدانوں سے نکل کر پہاڑی علاقوں میں داخل ہوا تو برباری شروع ہو چکی تھی، لیکن فاتح لشکر نے قریباً پانچ ہفتے انتہائی عزم اور استقلال کے ساتھ بربازی کے شدید طوفانوں میں اپنا سفر جاری رکھا اور تبریز کے قریب ڈیرے ڈال دیئے۔

ملے ہرقل نے دست گرد کا مال غنیمت بحیرہ اسود کے راستے قسطنطنیہ روانہ کیا تھا، لیکن وہ جہاز جس پر یہ سونا اور چاندی لاوا گیا تھا، طوفان کے باعث سمندر میں غرق ہو گیا



مداخن میں پرویز کی فوج اور رعایا کو ایک فوری خطرے نے اپنے حکمران کے جھنڈے تلے جمع کر دیا تھا لیکن اب یہ خطرہ ٹل چکا تھا اور یہ لوگ انتہائی نفرت اور حقارت کے ساتھ اُس حکمران کی طرف دیکھ رہے تھے، جس کی بزدلی اور بے تدبیری نے ایران کی عظیم ترین فتوحات کو عبرت ناک شکستوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ نو شیرواں کا پوتا اب وہ دیوتا نہیں تھا، جس کی سلامتی، عزت اور اقبال کے لئے ایران کے آتشکدوں میں دعائیں مانگی جاتی تھیں، بلکہ ایک ایسا انسان تھا، جس کی نحوست سے نجات حاصل کرنا اہل ایران کے لئے وقت کا ایک اہم ترین مسئلہ بن چکا تھا۔ مدائن کی گلیوں اور بازاروں میں صبح وشام اس قسم کے نعرے سنائی دیتے تھے۔ پرویز سین کا قاتل ہے۔ پرویز مینو کی شکست اور دست گرد کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔ سر بار اور اُس کے لشکر نے پرویز کی شرمناک سازشوں سے تنگ آ کر جنگ سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ ایران کے لاکھوں جوان جنگ میں کام آچکے ہیں، اب ہم ایک سفک بادشاہ کی تسلیوں کے لئے یارِ خون بہتیا نہیں کر سکتے۔ ایران کو امن کی ضرورت ہے۔ سین ہرقل کی طرف سے صلح کی پیشکش لے کر آیا تھا لیکن پرویز نے اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہمارا دشمن ہرقل نہیں پرویز ہے۔ رومی نئے حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور اب اُن کے ساتھ مصالحت کی بھی صورت ہے کہ ہم پرویز سے نجات حاصل کر لیں۔ پرویز سے عوام کے جذبات پوشیدہ نہ تھے، وہ جانتا تھا کہ اب اُس کی تباہ حال رعایا اُسے نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔ اپنے حال کے متعلق اُس کی پریشانی اور مستقبل کے متعلق مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، اُس کے ذہنی اور جسمانی قومی مفجوع ہو چکے تھے۔ اب اُسے شراب کے نشے میں بھی اُن لوگوں کی چنیں سنائی دیتی تھیں۔ جو اُس کے حکم سے تختہ دار پر کھینچے گئے تھے۔

بالآخر ایک دن اُس نے اپنے امراء کو بلایا اور اُن کے سامنے اپنے عزیز ترین بیٹے مردزا کے سر پر تاج رکھنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن امراء کے نزدیک ایک شکست خوردہ بادشاہ کے حکم کی ہر خواہش بے معنی تھی۔ اُن کے ایک بااثر گروہ نے پرویز کے ایک اور بیٹے شیرویہ کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر لیا۔ یہ

نوجوان جو اپنے باپ سے کہیں زیادہ سفک تھا۔ ایران کے تخت و تاج کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا اُس نے امراء کو انعامات اور سپاہیوں کو زیادہ تنخواہوں کا لالچ دیا، اور ایک طویل جنگ کے آرام و مصائب سے دل برداشتہ عوام کو یہ مرزدہ سنایا کہ میں تمہیں امن دوں گا۔ کسریٰ کو اُس وقت ہوش آیا، جب شیرویہ کی سازش کا میاب ہو چکی تھی اور مدائن کے سپاہی، امراء اور عوام اُسے اپنا بادشاہ تسلیم کر چکے تھے۔ پرویز نے بھاگنے کی کوشش کی، لیکن سپاہیوں نے اُسے مدائن کے دروازے سے باہر نکلنے کا موقع نہ دیا اور پکڑ کر شیرویہ کے سامنے لے آئے۔

شیرویہ نے اپنے باپ کی آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے اپنے اٹھارہ بھائیوں کے سر قلم کر دئے اور اس کے بعد اُسے مدائن کے قید خانے کی ایک تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ اور اس تاریک کوٹھڑی میں کجگلاہ ایران کی حالت اُس شخص کی سی تھی، جسے جیتے جی قبر میں اتار دیا گیا ہو۔ اپنی زندگی میں ہزاروں بے گناہ انسانوں کو جوازیتمیں اُس نے پہنچائی تھیں وہ اُسے اپنے بیٹے کے ہاتھوں پہنچ رہی تھیں۔ مجھوک اور پیاس کی حالت میں اُسے اپنی التجاؤں، چیخوں اور سسکیوں کے جواب میں صرف اپنی آواز سنائی دیتی تھی۔ رُوٹے زمین کا انتہائی بااختیار، انتہائی معذور اور انتہائی ظالم انسان اب اپنی بے بسی، عجز اور مظلومیت کی انتہا دیکھ رہا تھا۔

شیرویہ نے اپنے باپ کو زندگی کے عذاب سے نجات دلانے کے لئے پانچ دن کسی موزوں قاتل کی تلاش میں گزار دیئے، بالآخر اُسے ہرمز نامی ایک نوجوان نے جس کے باپ کو پرویز نے قتل کر دیا تھا۔ اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا ”ایک بیٹے کے لئے اپنے باپ کے قاتل سے انتقام لینا جائز اور درست ہے۔“

شیرویہ نے جواب دیا ”تم اپنے باپ کا انتقام لے سکتے ہو۔“

ہرمز قید خانے میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر بعد ایک کوٹھڑی سے ایران کے تاجدار کی آخری چیخ

کچھ روایات کے مطابق شیرویہ کے ہاتھوں پرویز کے قتل ہونے والے بیٹوں کی تعداد پندرہ تھی۔

سنائی دی۔ پھر تھوڑی دیر بعد قاتل اپنی خون آلود قبائیل کے بغیر شیروہیہ کے سامنے کھڑا یہ کہہ رہا تھا۔ عابجاہ! آپ کے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے، میں اپنے باپ کا انتقام لے چکا ہوں۔“

شیروہیہ کے چہرے پر ایک خوفناک مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور اس نے کہا۔ ”تم اپنے باپ کے قاتل سے انتقام لے چکے ہو، لیکن میں نے ابھی تک اپنے باپ کے قاتل سے انتقام نہیں لیا۔“

ہرمز کے چہرے پر اچانک موت کی زردی چھا گئی۔ اور وہ چلا گیا۔ ”عابجاہ! میں نے صرف آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔“

شیروہیہ نے مسلح سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا اور انہوں نے آگے بڑھ کر ہرمز کو گھیرے میں لے لیا۔ پھر چار آدمیوں کی تلواریں بلند ہوئیں۔ ایک سچ سنائی دی اور اس کے بعد ایک لاش شیروہیہ کے قدموں میں تڑپنے لگی۔

باب ۳۹

دست گرد کے قید خانے میں دو سال گزارنے کے بعد عاصم نے اپنی اسیری کے دنوں، ہفتوں کا حساب رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ قید کے ابتدائی ایام میں اس کے ساتھ توج اور مہر داد کی ملاقات کا یہ اثر ہوا تھا۔ کہ قید خانے کا داروغہ اسے پہلے سے بہتر سلوک کا مستحق سمجھنے لگا گیا تھا۔ اس کے بعد سین کے ساتھ معیت رکھنے والے چند اور فوجی افسروں نے بھی داروغہ کی وساطت سے اس کے ساتھ درپردہ ملاقاتیں کی تھیں۔ اور ان کے طرز عمل نے داروغہ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اگر کبھی حالات نے پٹا کھایا تو فوجی سرداروں کا ایک بااثر گروہ جو سین کو مظلوم سمجھتا ہے اس شخص کو فراموش نہیں کرے گا جو سین کا وفادار دوست یا ساتھی ہونے کے جوہر کی سزا بھگت رہا ہے۔ چنانچہ وہ عاصم کے ساتھ عام قیدیوں کی نسبت زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ اور چند ملاقاتوں کے بعد اس کی دلچسپی ایک گہرے انس میں تبدیل ہونے لگی۔

ابتداء میں وہ دست گرد کے حوام کی طرح سین کی المٹاک موت کو ایک فدا کی موت سمجھتا تھا۔ لیکن عاصم کی باتیں سننے کے بعد اس کے خیالات یکسر تبدیل ہو چکے تھے اور وہ عاصم پر اور زیادہ مہربان ہو چکا تھا۔ تاہم اس کا نیک سلوک عاصم کے آلام و مصائب کا علاج نہ تھا۔ ماضی کی تمام یادوں سے کنارہ کش ہو کر اور مستقبل کی تمام امیدوں سے زندگی کے رشتے توڑ کر ایک قیدی کے حال پر قانع ہو جانے کا تصور بھی اسے ناقابل برداشت محسوس ہوتا تھا۔ ایک دن اس کی کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ اور قید خانے کے داروغہ نے اندر داخل ہو کر کہا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے دو دن سے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔“

عاصم نے بے اقتنائی سے اس کی طرف دیکھا اور جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

داروغہ نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری صحت خراب ہو رہی ہے اور میں نے آئندہ تمہیں اپنے گھر سے کھانا بھجوانے کا انتظام کیا ہے۔“

عاصم نے داروغہ کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔ ”مجھ میں نہیں آتا کہ مجھ جیسا بے نصیب اگر چند مہینے یا چند برس اور اس کو ٹھٹھی میں ایڑیاں رگڑتا رہے تو آپ کو اس سے کیا حاصل ہوگا؟“

داروغہ نے جواب دیا۔ ”یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں تمہاری صحت کا خیال رکھوں۔ آج سے تمہیں صبح وشام قید خانے کی چار دیواری کے اندر کھلے بندوں گھومنے پھرنے کی اجازت ہوگی۔“

عاصم کی آنکھوں میں اچانک امید کی روشنی جھلکنے لگی۔ لیکن داروغہ نے اچانک اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اس رعایت سے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اس قید خانے میں تین سو آدمی ایسے ہیں جو شہنشاہ کے حکم سے یہاں لائے گئے ہیں اور جنہیں صرف کسرے کے حکم سے رہا کیا جاسکتا ہے۔ ان قیدیوں کی اکثریت ایران کے ان بااثر خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے جن سے حکم عدول یا بغاوت کا خدشہ ہو سکتا تھا۔

شہنشاہ کو اس بات کا یقین ہے کہ جب تک یہ لوگ قید میں ہیں اور جب تک ان کے دوستوں، عزیزوں یا رشتہ داروں کو یہ خوف دلایا جاسکتا ہے کہ ان کی قید کو ہر وقت موت کی سزا میں تبدیل کیا جاسکتا ہے وہ بغاوت کی جرات نہیں کریں گے۔ مجھے ان قیدیوں کی صحت اور سلامتی کے علاوہ یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی ہے کہ جب کسرے انہیں یا دفرمائے گا تو میں انہیں حاضر کر دوں اور اگر مجھے اس ذمہ داری کے قابل سمجھا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پانچ بیٹے ہیں اور مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اگر میری غفلت یا کوتاہی کے باعث کوئی قیدی فرار ہو جائے تو ان پانچ بچوں کو میری آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیا جائے گا۔ اور ان کے علاوہ میرے تمام ۷۰ بڑوں اور دوستوں کو بھی بدترین سزائوں کا مستحق سمجھا جائے گا۔ میں اگر تمہیں اس قید خانے میں گھومنے پھرنے کی رعایت دے رہا ہوں تو اس کی وجہ میرا یہ اطمینان ہے کہ تم اپنی آزادی کے بدلے میرے بال بچوں اور عزیزوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالنا پسند نہیں کرو گے۔ پھر مجھے یہ اطمینان بھی ہے کہ اگر تم فرار ہونے کی کوشش بھی کرو تو بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ عاصم! تمہیں اپنے مستقبل کے متعلق اس قدر ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ کسرے نے پہلی بار میدان جنگ میں چند ناکامیوں کا سامنا کیا ہے۔ ممکن ہے کہ روپا

کی مزید کامیابیوں سے وہ ایسی شرائط پر صلح کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے جو ان کے لیے قابل قبول ہوں۔

اس صحت میں اگر رویوں نے تمہاری خدمات کا لحاظ کیا تو ان کے لیے تمہاری رہائی کا مطالبہ منوانا مشکل نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جنگ کی علوالت سے نکلے ہوئے سپاہیوں کے اضطراب کے باعث

ایران کو کسی اندرونی انقلاب کا سامنا کرنا پڑے اور سین کا کوئی دوست تمہارے لیے اس قید خانے کا دروازہ کھول دے۔ تم نے ایک دن عرب کے کسی نبی کی پیش گوئی کا ذکر کیا تھا۔ اور ارمیاہ کی کتابی کے بعد مجھے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا زمانہ قریب آ رہا ہے۔ تمہیں جوصلے سے کام لینا چاہیے۔۔۔۔۔ میں تمہارے لیے کھانا بھیجتا ہوں۔“

داروغہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا اور عاصم کو پھر ایک بار دست گرد کے قید خانے سے کوسوں دور تے راستوں اور نئی منزلوں کے چسراغ دکھائی دینے لگے۔

”فسطینہ! فسطینہ!“ اس نے اپنے دل میں کہا۔ ”کیا تم میرا انتظار کر سکو گی۔۔۔؟ اور پھر بلائیک اس کے صورتوں کی دنیا میں فسطینہ کی سسکا نہیں بھیل گئیں۔“

اس شام وہ قید خانے کی وسیع چار دیواری کے اندر گھوم رہا تھا۔ اور چند دن بعد کئی قیدیوں سے باتیں کرنے کے بعد وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ جبر اور ظلم کی اس سستی میں وہ اکیلا نہیں۔ یہاں ایسے لوگ موجود ہیں، جو اس سے زیادہ مظلوم ہیں۔



چند ماہ اور گزر گئے۔ پھر ایک دن عاصم کو یہ معلوم ہوا کہ رومی لشکر، نینوا کے میدان میں ایلیائیوں کو شکست دینے کے بعد دست گرد کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد کسرے نے دست گرد سے راہ فرار اختیار کی۔ تو

عاصم یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کی مصیبت کا دور ختم ہونے والا ہے۔ قید خانہ کا داروغہ بھی اُسے یہ اطمینان دلا چکا تھا کہ جب رومی لشکر قریب پہنچ جائیں گے تو میرے لیے قید خانے کے دروازے کھول دینے کے

سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔

لیکن کسری کو مدائن میں اہلبنان کا سانس لینے ہی اپنی فوج اور کینزراں حرم کے علاوہ ان قیدیوں کی فکر ہوئی جو دشمن کے ساتھ مل کر اس کے لیے بدترین خطرات پیدا کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہرقل کی آمد سے تین دن قبل ان لوگوں کو پانچ سو سپاہیوں کی ننگی تلواروں کی حفاظت میں قید خانے سے نکال کر مدائن سے چند میل دور ایک پرانے قلعے کے اندر منتقل کر دیا گیا۔ اس قلعے کے محافظ کا نام مہران تھا اور وہ ان سنگدل لوگوں میں سے تھا جو اپنے حکمران کے انتہائی ظالمانہ احکام کی تعمیل میں بھی ایک لذت محسوس کیا کرتے تھے۔ اور کسری اُسے یہ حکم دے چکا تھا کہ اگر مدائن کو کوئی خطرہ پیش آیا تو ان قیدیوں کو گھٹکانے لگانے کے لیے نہیں ہامی طرف سے کسی نئی ہدایت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔

دست گرد کے قید خانے کے داروغہ کو جس سے عام کو کسی بھلائی کی امید ہو سکتی تھی، ان سپاہیوں کی نگرانی سونپ دی گئی تھی جو شاہی خزانہ نکال کر مدائن لے جا رہے تھے۔ حاصم نے اپنے مستقبل کے اتق پر امید کی جو روشنی دیکھی تھی اُسے پھر ایک بار مایوسی کی گھٹائیں اپنے آغوش میں لے چکی تھیں۔

اس قلعے میں اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ پیر یاروں کو قیدیوں سے ہمکلام ہونے کی اجازت نہ تھی۔ وہ کئی دن انتہائی کرب و اضطراب کی حالت میں دو میوں کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن وہ نہ آئے۔ وہ اکثر یہ سوچا کرتا تھا۔ ”کیا یہ ہو سکتا ہے کہ فیصلہ دست گرد سے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر کے واپس چلا گیا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اسے کسی جنگ میں شکست ہوگئی ہو۔ اور کیا یہ ممکن نہیں کہ مدائن میں اپنے جھنڈے گاڑنے کے بعد اس کے نکلنے کے بجائے اس نے اس خیرام قلعے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ہو؟“

قلعے کے محافظ نے قیدیوں کو گرمی دہوار میں مرمت کرنے اور خنقیں گہری کرنے کے کام پر لگا دیا تھا۔ اور پیر یار ہاتھوں میں کوڑے لیے ہر وقت ان پر سطرہتے تھے۔ اگر کوئی سبھوک، پیاس یا تھکاوٹ سے مدھال ہو کر گر پڑتا تو اس پر بے تماشا کوڑے برسائے جانتے تھے۔ غذا کی کمی اور کام کی زیادتی، اور پیر یاروں کے وحشیانہ سلوک کے باعث کئی قیدی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اور ہر جنتی جرنے والوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔

ایک رات چند قیدیوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن پیر یاروں کو بروقت پتہ چل گیا۔ چنانچہ انہوں نے بھاگنے والوں کا پیچھا کیا۔ دو قیدی جنہوں نے مزاحمت کی کوشش کی مسلح سواروں کے ہاتھوں مارے گئے، چار گرفتار کر لیے گئے اور صرف دو ایسے تھے جو دریا سے دجلہ عبور کرنے کے بعد کہیں رو پویش ہو گئے تھے۔

گرفتار ہونے والے چار آدمیوں کو قلعے کے دروازے کے مین سامنے پھانسی دے دی گئی۔ اور کئی دن تک ان کی لاشیں وہیں ٹنگی رہیں۔ پھر ایک دن جب یہ لاشیں ہڈیوں کے ڈھانچوں میں تبدیل ہو چکی تھیں، سرپرست سواروں کا ایک دستہ قلعے کے دروازے کے سامنے رکا۔ ایک عمر رسیدہ آدمی نے جو اپنے لباس سے کوئی بڑا افسر معلوم ہوتا تھا، تفصیل پر سے نیچے بھاگنے والے پیر یاروں کی طرف دیکھا۔ اور بلند آواز میں کہا۔ ”دروازہ کھولو ہمیں شہنشاہ نے بھیجا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور قلعے کا محافظ چند سپاہیوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

”مجھے بھیجتے ہو؟“ عمر رسیدہ آدمی نے کسی توقف کے بغیر پوچھا۔

”چند تانے قلعے کے محافظ کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے کہا۔ ”تم ساسان ہو۔ تم اس قلعے سے فرار ہو گئے تھے۔“

ساسان نے کہا۔ ”اگر چند دنوں میں تمہارا حافظہ بہت زیادہ کمزور نہیں ہو گیا۔ تو میرے دو اور ساتھی اس جگہ موجود ہیں۔“

قلعے کے محافظ نے باقی سواروں کی طرف دیکھا۔ اور اس کی نگاہیں دو آدمیوں پر مرکوز ہو کر رہ گئیں پھر وہ اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر چلایا۔ ”انہیں گرفتار کر لو۔“

ساسان نے کہا۔ ”نہیں تمہارے آدمی شہنشاہ کے سپاہیوں پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اب میں اس قلعے کا محافظ ہوں اور میں تمہاری گرفتاری کا حکم دیتا ہوں۔“

قلعے کا محافظ غصے اور اضطراب کی حالت میں کبھی اپنے آدمیوں اور کبھی ان سواروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ساسان نے مڑ کر ایک فوجی افسر کی طرف دیکھا۔ اور اس نے اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر قلعے کے محافظ کو ایک مراسلہ پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ درست کھتے ہیں۔ تم ایران کے نئے شہنشاہ کا حکم نامہ دیکھ سکتے ہو۔“ ہمران نے مراسلہ لے کر کھولا، پڑھا اور اس کے پھرے پر موت کی زد دی چھا گئی۔

ساسان نے قلعے کے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ایران سے پرویز کی حکومت ختم ہو چکی ہے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم اپنے نئے حکمران کی اطاعت کرو۔ مدائن یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ اگر تم میں سے کسی کو میری باتوں پر شبہ ہے تو میں اسے وہاں بھیجنے کے لیے تیار ہوں۔“

مهران نے کہا۔ ”میں کسی اور کو بھیجنے کی بجائے خود مدائن جانا چاہتا ہوں۔“

”نہیں ہم تمہیں کسی اور جگہ بھیجا چاہتے ہیں۔“ ساسان نے یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ چار آدمی گھوڑوں سے اترے اور انہوں نے مهران کے ہاتھ باندھ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد قلعے کے دروازے کے سامنے ہڈیوں کے چار بوسیدہ دھچکوں کے ساتھ ایک تازہ لاش لٹک رہی تھی۔



اگلے دن وہ پہرہ دار جو قیدیوں کو بدترین اذیتیں پہنچانے میں ایک راحت محسوس کیا کرتے تھے، فیصل مرمت کرنے اور خندق کھودنے کے کام پر لگے ہوئے تھے اور چند قیدی جن کے ہاتھ میں پتھروں اور ٹوکریوں کی بجائے کوڑے دے دیے گئے تھے، ان کی نگرانی پر مامور تھے۔

اب ایران کے انقلاب کی خبر کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ چار دن بعد مدائن سے ایک اچھی آیا اور اس نے یہ خبر دی کہ کسرے پرویز کو مدائن کے قید خانے میں قتل کر دیا گیا ہے۔ ساسان جس نے اپنی زندگی کے دس سال پرویز کی قید میں گزارے تھے، شمالی ایران کے ایک بااثر قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اور وہ شیر وید سے ان قیدیوں کی رہائی کے مکمل اختیارات لے کر آیا تھا۔ جن کے قبیلوں اور خاندانوں کی دوستی اس کے لیے سب سے ثابت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ایک ہفتہ کے اندر اندر قریباً ڈیڑھ سو قیدی جنہوں نے ایران کے نئے حکمران کی اطاعت کا حلف اٹھایا تھا۔ اپنے اپنے گھروں کو چاچکے تھے۔ اور ان کی جگہ لینے کے لیے مدائن سے آئے دن نئے

قیدیوں کی ٹولیاں پہنچ رہی تھیں۔ پرانے قیدیوں میں صرف وہ لوگ رہ گئے تھے جو دروازے کے صوبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جنہیں رہا کرنے سے قبل ان کے سرکش عزیزوں اور رشتہ داروں سے مہمانت اور فریاد و زاری کی ضمانت لینے کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔

عاصم کا معاملہ عام قیدیوں سے مختلف تھا۔ دست گرد سے اس قلعے میں منتقل ہونے والے قیدیوں کے جرائم اور سزاؤں کے متعلق یادداشت کی کتاب میں اس کے نام کے ساتھ رومی جاسوس کے الفاظ لکھے ہوئے تھے اور اس کی رہائی کا حکم دنیا ساسان کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔

کئی دن انتظار کے بعد عاصم کو ساسان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور ساسان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے لیے اچھی نہیں ہو۔ میں تمہارے حالات سے پوری واقفیت حاصل کر چکا ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ شیر وید کی اجازت کے بغیر میں تمہیں رہا نہیں کر سکتا۔ قیدیوں کی کتاب میں تمہارے متعلق یہ لکھا ہوا ہے کہ تم رومیوں کے جاسوس ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ الزام غلط ہے لیکن جب تک مدائن پر رومیوں کے حملے کا خطرہ موجود ہے کسی کو تمہاری حمایت میں آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ میں تمہیں یہ خوش خبری دے سکتا ہوں کہ ایران کا نیا حکمران ہر قیمت پر رومیوں کے ساتھ صلح کرنا چاہتا ہے اور مدائن کے اکابر کا ایک وفد تہذیب کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ قیصر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یروشلم کی صلیب بھی رومیوں کو واپس دی جا رہی ہے۔ اگر ہمارے وفد کو کامیابی ہوئی تو ایران کی نئی حکومت اس شخص کے دوست اور ساتھی کو فراموش نہیں کرے گی۔ جس نے اپنی جان پر کھیل کر ایران کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانے کی کوشش کی تھی۔“

پھر اگر تمہارے رومی دوست تمہیں بھول نہیں گئے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مصالحت کی گفتگو شروع کرنے سے پہلے تمہاری رہائی کا مطالبہ کریں گے۔“

عاصم نے منموہ لہجے میں کہا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ روم اور ایران کی مصالحت کے بغیر میری رہائی کی کوئی صورت نہیں۔“

”نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ لیکن تمہیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ شیر وید نے انتہائی ناسازگار حالات میں ایک حکمران کی ذمہ داریاں قبول کی ہیں۔ میں تمہارے ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ جب اُسے اپنے

گرد پیش سے اطمینان نصیب ہو گا۔ تو میں بذات خود اس کی خدمت میں حاضر ہو کر تمہارا مسئلہ پیش کر دوں گا۔
عاصم نے کہا۔ "میری سب سے بڑی امید تھی کہ توج مجھے فراموش نہیں کرے گا۔ اُسے یہ معلوم تھا کہ
میں نے کوئی مجرم نہیں کیا۔ کیا آپ اسے یہ پیغام نہیں پہنچا سکتے کہ میں ابھی تک زندہ ہوں۔ جب میں سین کے
ساتھ دست گرد پہنچا تھا تو وہ وہاں کی افواج کا سپہ سالار تھا۔"

ساسان نے کہا۔ "توج مرچکا ہے جب رومی نینروا کی طرف بڑھ رہے تھے تو وہ لگ لگ کر گیا تھا اور
جنگ میں ہلاک ہو گیا تھا۔"

ساسان کے ساتھ اس ملاقات کے بعد عاصم کی حالت اس مسافر کی سی تھی جو ایک ترقی و ترقی صحرا کے
بے نشان راستوں پر سفر کر رہا ہو۔ سین جس نے اسے افق کی دھندلی لکیروں کے پیچھے دوڑنا سکھایا تھا اس
کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ قسطنطنیہ نے اسے زندگی کی تڑپ اور دلوں کے عطا کئے تھے۔ لیکن اب اُسے یہ بھی یقین نہیں
تھا کہ وہ زندہ ہے۔ وہ اکثر اپنے دل سے یہ سوال کیا کرتا تھا کہ میں قلعے سے باہر وہ کون سی جگہ ہے جہاں مجھے
امن اور راحت نصیب ہو سکتی ہے۔ اگر قسطنطنیہ اس دنیا میں نہیں تو میں آزاد ہو کر کہاں جا سکتا ہوں۔"



اڑھائی بیسے اور گزر گئے۔ پھر ایک شام ساسان کے پاس کوئی آپٹی آیا اور وہ رات کے پچھلے پر ملائیں کی
طرف روانہ ہو گیا۔ دس دن بعد ایک صبح عاصم اپنے کمرے سے باہر چل قدمی کر رہا تھا کہ ایک سپاہی نے
اس کے قریب آ کر اطلاع دی۔ "ساسان نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔"

"وہ ملائیں سے واپس آگئے ہیں؟"

"جی ہاں"

"کب؟"

"وہ آدھی رات کے قریب یہاں پہنچ گئے تھے۔"

نھوڑی دیر بعد عاصم ایک کتاہ کمرے میں داخل ہوا۔ ساسان کے ساتھ ایک اور صنعتی العر آدمی

جس کی بھوئیں تک رسید ہو چکی تھیں، بیٹھا ہوا تھا۔

"تم انہیں جانتے ہو؟ ساسان نے عاصم کو دیکھتے ہی سوال کیا۔

عاصم نے غصے سے سر سیدہ آدمی کی طرف دیکھا اور مذہب ساہو کر بولا۔ "آپ کو ایک قیدی کی
یادداشت کا امتحان نہیں لینا چاہیے۔ اب میرے دل میں صرف اپنے آلام و مصائب کی یاد باقی
رہ گئی ہے۔"

سر سیدہ آدمی نے کہا۔ "میرا نام مہرداد ہے۔ اور تم ایک قیدی نہیں ہو۔"

عاصم چند تانیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ اور لشکر کے جذبات
اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آنسو بہ کر چھلکنے لگے۔

مہرداد نے کہا۔ "تم آزاد ہو اور قید خانے کے دروازے پر ایک گھوڑا نما مارا انتظار کر رہا ہے۔"

عاصم نے ساسان کی طرف دیکھا اور لڑتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ "کیا میں سچ آزاد ہوں؟"

"ہاں تم آزاد ہو۔۔۔۔۔۔ ملائیں کے اکابر کا جو وفد قیصر کے پاس گیا تھا۔ وہ صلح کی شرائط طے کرنے کے
بعد واپس آ گیا ہے۔ اور میں اس کی واپسی کی اطلاع ملنے ہی ملائیں پہنچ گیا تھا۔ میرا اولین مقصد شمشاد کے

ملائے تماری رہائی کا مسئلہ پیش کرنا تھا۔ لیکن مجھے ان کی خدمت میں پیش ہونے کی ضرورت ہی نہیں پیش
آئی۔ شہنشاہ سے تماری رہائی کا فرمان ایک ایسے بزرگ نے حاصل کیا ہے۔ جو اس وفد کے ساتھ گیا تھا۔"

ساسان نے یہ کہہ کر میرے ایک کاغذ اٹھایا اور عاصم کے ہاتھ میں دے دیا۔

عاصم نے تشکر آمیز نگاہوں سے ساسان کی طرف دیکھا اور پھر مہرداد کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میرے
یہ بے سمجھا مشکل نہیں کہ وہ بزرگ کون ہے۔ میں آپ کا تشکر گزار ہوں۔"

مہرداد نے جواب دیا۔ "میں اگر کوشش نہ کرتا تو بھی چند دنوں یا چند ہفتوں تک تماری رہائی یقینی تھی

مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ اس سے قبل تمہارے حال پر توجہ دینے کا موقع نہ ملا۔"

عاصم نے پوچھا۔ "آپ ان رومیوں سے ملے تھے جو سین کے ساتھ دست گرد آئے تھے؟"

"نہیں، ان میں سے کسی کے ساتھ میری واقفیت نہیں تھی۔"

”آپ سے کسی رومی نے بھی میرے متعلق نہیں پوچھا؟“

”نہیں وہاں کسی نے تمہارا ذکر نہیں چھیڑا۔ جب ہم قیصر کے پڑاؤ میں داخل ہوئے تھے تو وہاں فستح کی خوشحیاں منانی جا رہی تھیں۔“

عاصم کے چہرے پر ایسی سی جھاگئی — ساسان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ”تمہیں اس بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارے رومی دوستوں نے تمہیں فراموش کر دیا ہے۔ اتنی عظیم فتوحات کے بعد لوگ اپنے ماضی کے دوستوں اور ساتھیوں کو بھول جاتے ہیں۔“

عاصم نے کہا ”مجھے یقین ہے کہ اگر میرے دوستوں میں سے کوئی قیصر کے ساتھ ہوتا تو وہ آپ سے میرے متعلق ضرور پوچھتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ سین اپنی بیوی اور بچے حلقہ دون چھوڑ آیا تھا؟“

مہرداد نے جواب دیا۔ ”ہاں مجھے معلوم ہے۔“

”اب وہ کہاں ہیں؟“

”ان کے متعلق میں نے صرف یہ سنا ہے کہ سین کے قتل کے بعد پرویز نے اس کی بیوی اور لڑکی کے متعلق حکم بھیجا تھا کہ انہیں دست گرد پہنچا دیا جائے۔ لیکن پرویز کا حکم پہنچنے سے دو دن قبل وہ کہیں روپوش ہو چکی تھیں۔ قلعے کے محافظ صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ شام کے وقت سیر کے لیے نکلی تھیں اور پھر واپس نہیں آئی تھیں۔ ان کا ایک نوکر بھی ان کے ساتھ ہی لاپتہ ہو چکا تھا۔“

عاصم نے پرامید ہو کر پوچھا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ قیصر کے ایلچی جو دست گرد آئے تھے وہ بیزیت قسطنطنیہ پہنچ گئے تھے۔“

”ہاں، انہیں ہمارے سپاہیوں نے بحفاظت باسفورس کے پار پہنچا دیا تھا۔ لیکن پرویز نے جن ایرانیوں کو خراج وصول کرنے کے لیے ان کے ساتھ بھیجا تھا۔ ان کے متعلق چہ گئی میٹروں کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ قتل کر دیئے گئے ہیں۔“

عاصم نے پوچھا۔ ”کیا قیصر کے ایلچیوں نے واپسی پر حلقہ دون قیام کیا تھا؟“

”ہاں انہوں نے ایک رات وہاں قیام کیا تھا۔ اور ایک رومی نے قلعے میں سین کی بیٹی کے ساتھ

ملاقات کی تھی۔ لیکن اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ انہیں غائب کرنے میں ان رومیوں کا ہاتھ ہے تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ وہ حلقہ دون سے ان کی روانگی کے دو دن بعد روپوش ہوئی تھیں۔ پرویز کے پاس جب یہ خبر پہنچی تھی تو اس نے قلعے کے میں سپر دیاروں کو قتل کروا دیا تھا۔ پرویز نے ان سپاہیوں کو بھی عبرت ناک سزا دی تھی۔ قلعے میں چوندون کی تاثیر سے حلقہ دون پہنچے تھے۔ مجھے صرف اس بات سے قیصر کے ایلچیوں پر کچھ شبہ ہوتا ہے کہ واپسی پر ان کی رفتار بہت تیز تھی۔ تحقیقات کے دوران میں راستے کی چوکیوں سے اس قسم کی شہادتیں ملی تھیں کہ تمہارے آدمی جو ان کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ اس بات کے شاک کی تھے کہ رومیوں نے کسی منزل پر بھی انہیں جی بھر کر آرام کرنے نہیں دیا۔“

عاصم نے کہا۔ ”بہر حال آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ پرویز نے جو سپاہی سین کی بیوی اور بیٹی کی گرفتاری کے لیے روانہ کیے تھے، وہ رومیوں کے بعد حلقہ دون پہنچے تھے۔“

”ہاں ای کے دیر سے پہنچنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ کسرے کو رومیوں کی روانگی سے چند دن بعد دست گرد کے بڑے کاہن کے اصرار پر ان کی گرفتاری کا خیال آیا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ کہ انہوں نے کسی تاثیر کے بغیر حلقہ دون پہنچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بہر حال یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ سین کی بیوی اور بیٹی رومیوں کے ساتھ نہیں گئیں۔ جب ان کی تلاش جاری تھی تو میں اکثر مدائن سے دست گرد جایا کرتا تھا تو راج اور چند دوسرے دوستوں کی طرح مجھے بھی یہ شبہ تھا کہ کسرے نے انہیں قتل کر دیا ہے اور اب ان کی تلاش سے اس کا مقصد اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اب حلقہ دون کے لشکر کی ایک بڑی تعداد واپس آچکی ہے اور میں کئی سپاہیوں اور افسروں سے مل چکا ہوں۔ اور وہ سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ سین کی بیوی اور بیٹی کہیں روپوش ہو چکی ہیں۔ اور اگر رات کی تاریکی میں قلعے سے باہر ان کے انویا قتل کی کوئی سازش ہوئی ہو تو اس کے ساتھ فوج کا کوئی تعلق نہیں۔“

عاصم کی وقت برداشت بجا بے چکی تھی، اس نے ساسان کی طرف دیکھا اور کرب انگیز لہجے میں کہا ”میں جاسکتا ہوں۔“

ساسان نے اٹھ کر کہا۔ ”میں تم پہلے اپنے کمرے میں جا کر ناشتا کرو۔ اور تمہارا لباس بھی ٹھیک

یہاں تک ہم ان ظالموں کو اپنی بہتیوں سے گزرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔
ایک فوجیوں نے آگے بڑھ کر کہا۔ "مقدس باپ! اب جنگ ختم ہو چکی ہے اور یہ لوگ اپنے گھروں کو
واپس جا رہے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔" راہب چلایا۔ "مجوسیوں کے ساتھ ہماری جنگ ختم نہیں ہو سکتی۔ انطاکیہ، حلب، دمشق
اور یروشلم کو تباہ کرنے والوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔"

فوجیوں نے برہم ہو کر کہا۔ "اگر آپ لڑنا چاہتے ہیں تو ہم آپ کو روکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن ہم
آپ کی خاطر مزید خون نہیں دے سکتے۔ رومیوں سے بھی آپ کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ آپ کی خاطر مزید
قرابانیاں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ دیکھیے وہ قریب آ رہے ہیں۔ اگر آپ اپنی زبان پر قابو نہیں
رکھ سکتے تو یہاں سے تشریف لے جائیے ورنہ....."

"ورنہ کیا ہوگا؟" راہب نے تھلا کر کہا۔

فوجیوں نے جواب دیا۔ "ورنہ میں آپ کو دریا میں پھینک دوں گا۔ اور سستی کا کوئی آدمی آپ کی مدد نہیں
کرے گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ تیز زانیں جانتے۔"

راہب نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز تماشائیوں کے ہنسنوں میں دب کر رہ گئی۔ اور وہ
غصے سے کانپتا اور گالیاں دیتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

کشتیاں قریب آ چکی تھیں اور عاصم دم بخود کھڑا سب سے اگلی کشتی پر ایک جانی بچانی صورت
دیکھ رہا تھا۔ یہ ویلیس تھا۔

عاصم کے دل کی دھڑکن کسی تیز اور کبھی سست ہو رہی تھی۔ وہ کبھی مسرت کے ساتویں آسمان پر چڑھ
کر رہا تھا اور کبھی مایوسی کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا۔ ویلیس جو ایک ایرانی سے بائیں کر رہا تھا، اچانک
ساحل کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس کی نگاہیں عاصم کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اور پھر اس نے اپنے دونوں
ہاتھ بلند کر دیئے۔ کشتی کنارے پر لگی۔ عاصم اپنے گھوڑے کی باگ چھوڑ کر آگے بڑھا۔ اور ویلیس کشتی سے کود
کر اس کے ساتھ پھٹ گیا۔

باب ۳

عاصم نے کئی دن دریائے فرات کے کنارے کے ساتھ ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔ ہمدان نے نصحت کے
وقت جو تھیں اس کے گھوڑے کی خرید میں رکھوا دی تھی وہ اشرافیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور ان اشرافیوں کی بدولت
اسے راستے کی مثال میں ٹھہرنے یا نازہ دم گھوڑے تبدیل کرنے میں کوئی وقت پیش نہ آئی۔ ایران کی فوجیوں
سرد ہو کر آنے کے بعد اس نے سیدھا ایشیا کے کوچک کارخ کرنے کی بجائے شام کے اس راستے سفر کرنا
زیادہ مناسب خیال کیا جو نسبتاً آباد علاقوں سے گزرتا تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت وہ حلب سے چند کوس دور دریا کے کنارے ایک بستی میں داخل ہوا اور سرے
سے کھانا کھانے اور گھوڑا تبدیل کرنے کے بعد دریا عبور کرنے کی نیت سے گھاٹ کی طرف چل پڑا لیکن وہاں
پہنچ کر معلوم ہوا کہ بستی کی تمام کشتیاں دوسرے کنارے جمع ہونے والے مسافروں کو لانے کے لیے روانہ ہو چکی ہیں۔
عاصم جو شام سے پہلے اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے بے قرار تھا انتہائی اضطراب کی حالت میں کشتیوں کی ڈپٹی
کا انتظار کر رہا تھا۔

ایک ساعت بعد پانچ کشتیاں مسافروں اور ان کے گھوڑوں سمیت واپس آ رہی تھیں۔ بیشتر مسافر
اپنے لباس سے ایرانی فوج کے افسر اور سپاہی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن سب سے اگلی کشتی پر آٹھ آدمی رومیوں
کا لباس پہنے ہوئے تھے

بستی کے چند آدمی جو دریا کے کنارے جمع ہو گئے تھے انتہائی غم و غصہ کی حالت میں ایرانیوں کی طرف
دیکھ رہے تھے اور ایک عمر رسیدہ شاہی راہب چلا چلا کر یہ کہہ رہا تھا۔ "آج ایرانی رومیوں کے دوست بن گئے

”خدا کا شکر ہے کہ اس بلکہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ ورنہ میں تمہاری تلاش میں مدائن جا رہا تھا۔ اور وہاں سے نامعلوم مجھے ایران کے کتنے شہروں کی خاک چھانا پڑتی؟“

عاصم نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی آواز حلق سے باہر نہ آسکی۔ تاہم اس کی نگاہیں دلیریں کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھیں۔

اس نے عاصم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”عاصم! فلسطینہ زندہ ہے۔“ اور عاصم کے سامنے ساری کائنات اپنی حسین مسکراہٹوں کے ساتھ رقص کرنے لگی۔

”وہ کہاں ہے؟“ اس نے لڑتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو

ابلی پڑے

”وہ فلسطینہ میں ہے اور ہم بہت جلد وہاں پہنچ جائیں گے۔“

اتنی دیر میں چند رومی اعدا ایرانی ان کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ دلیریں ایک عمر آدمی سے جو اپنے لباس سے ایرانی فوج کا کوئی بڑا عمدہ دار معلوم ہوتا تھا، مخاطب ہو کر بولا: ”قدرت نے مجھے ایک طویل سفر سے بچایا ہے۔ اب ہم یہیں سے واپس چلے جائیں گے۔ عاصم ہی ہے۔“

عمر سیدہ ایرانی نے آگے بڑھ کر عاصم کے ساتھ مصافحہ کیا اور اس کے ساتھی باری باری اسکی تعلق کرنے لگے۔ عقوڑی دیر بعد عاصم، دلیریں اور دوسرے رومی کشتی پر سوار ہو کر دوسرے کنارے کا رخ کر رہے تھے اور ایرانی جوان کے ساتھ آئے تھے اپنے ہاتھ بند کر کے انہیں الوداع کہہ رہے تھے۔

دلیریں نے عاصم کی طرف توجہ ہو کر کہا: ”تم نے یہ نہیں سوچا کہ فلسطینہ فلسطینہ کیسے پہنچ گئی۔“

عاصم نے اطمینان سے جواب دیا: ”مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ وہ زندہ ہے۔ قید سے رہا ہوتے وقت یہ معلوم ہو گیا تھا کہ فلسطینہ اور اس کی ماں قلعے سے غائب ہو گئی تھیں مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تم لوگ واپسی پر وہاں ٹھہرے تھے۔ اور تم میں سے کسی نے ان کے ساتھ ملاقات بھی کی تھی۔ لیکن جب تم قلعے سے روانہ ہوئے تھے تو وہ تمہارے ساتھ نہیں تھیں۔ میرا خیال ہے کہ سین کے کسی دوست نے انہیں

فلسطینہ پہنچا دیا ہو گا۔“

دلیریں نے کہا: ”مخفقون میں سین کا ایک ہی دوست تھا جس پر ہم اعتماد کر سکتے تھے۔ اور وہ اس کا بڑھاپا کر فیروز تھا۔ وہ کلاڈیوس کی ہدایت کے مطابق ہماری روانگی سے تیسرے روز شام کے وقت ان کے ساتھ سمندر کے کنارے پہنچ گیا تھا اور رات کے وقت ہم کشتی لے کر وہاں پہنچ گئے تھے۔“ فیصر کی پیش قدمی کے ایام میں ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ نہیں تلاش کرنا تھا۔ کلاڈیوس کو فلسطینہ کی مخالفت کی ذمہ داری سونپ دی گئی تھی اور مجھے کئی بار قرقطاجز سے رسد اور ملک لانے کے لیے جانا پڑا۔“

عاصم نے سوال کیا۔ ”اب کلاڈیوس کہاں ہے؟“

”وہ فلسطینہ میں ہے۔“ وہ میرے ساتھ آنا چاہتا تھا۔ لیکن طرابزون سے ہرقل کی روانگی کی

اطلاع ملی اور اُسے مجبوراً رکنا پڑا۔ میرے ساتھیوں کو اس بات کا طلال تھا کہ وہ فلسطینہ میں ہرقل کا جلوس نہیں دیکھ سکیں گے۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ شاید ہم وقت پر پہنچ جائیں۔ ہمیں انطاکیہ پہنچنے ہی جہاز مل جائے گا۔ اور اگر ہمارا موافق ہوئی تو باقی سفر حیدرون میں طے ہو جائے گا۔ میں گھوڑے کی سواری سے تنگ آچکا ہوں۔“

عاصم نے پوچھا۔ ”یہ ایرانی مخفقون سے آپ کے ساتھ آئے تھے؟“

”ہاں۔“ کلاڈیوس ایرانی کے نئے حکمران کے ساتھ صلح کے بعد مخفقون پہنچا تھا اور ایرانی لشکر کے سپہ سالار سے یہ وعدہ لے کر آیا تھا کہ تمہیں تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ پھر جب ایران کی بیشتر فوج اناطولیہ کے راستے واپس جا رہی تھی تو کلاڈیوس کا خیال تھا کہ یہ لوگ کسی تاخیر کے بغیر تمہاری خبر دینگے لیکن جب کوئی اطلاع نہ ملی تو کلاڈیوس نے مجھے مدائن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس ہرح میں باسفورس کے پار ایرانیوں کا پڑاؤ تقریباً خالی ہو چکا تھا اور سپہ سالار بھی واپس جا چکا تھا۔ یہ ایرانی جو میرے ساتھ آئے تھے ان جگہ قیدیوں میں سے تھے جنہیں جنگ کے ایام میں طرابزون سے فلسطینہ بھیجا گیا تھا۔ اب میں تمہیں ایک ایف سناک خبر سناتا ہوں۔“

”فلسطینہ کی ماں کے متعلق؟“ عاصم نے مضطرب سا ہو کر پوچھا۔

”ہاں۔ وہ فلسطینہ پہنچنے کے تین ماہ بعد فوت ہو گئی تھیں۔ اور چند ماہ بعد ان کا وفادار نوکر بھی وفات

پایا تھا۔ فلسطینہ کے دل پر ان حادثات کا گہرا اثر ہوا ہے۔ کلاڈیوس کی بیوی اور میں اسے سارا نہ تھیں تو خدا معلوم اس کا کیا حال ہوتا۔ ماں کی موت کے بعد اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ خدا اس سے ناراض ہے۔ وہ بار بار یہ کہتی ہے کہ اگر میں یرشلیم میں رہا ہوتا تو میرے والدین کا یہ انجام نہ ہوتا۔ اس نے کئی بار راسہبہ کی زندگی اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جب کلاڈیوس اہ اس کی بیوی اسے یہ سمجھاتے کہ عاصم زندہ ہے اور وہ عنقریب تمہاری تلاش میں میاں پہنچے گا تو اس کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ پچھلے سال ایک روز وہ اچانک کسب غائب ہو گئی تھی۔ دو دن اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ تیسرے دن علی الصباح وہ خود ہی کلاڈیوس کے گھر پہنچ گئی اور یہ معلوم ہوا کہ وہ راسہبہ بننے کے لیے خانقاہ میں چلی گئی تھی۔ لیکن رات کے وقت اس نے خواب دیکھا کہ تم واپس آگئے ہو۔ اور وہ صبح بیدار ہوتے ہی وہاں سے بھاگ آئی۔ اس کے بعد اس خانقاہ کے راہبوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ اکثر کلاڈیوس کے گھر آ کر اسے تبلیغ کرتے ہیں اور فلسطینہ انہیں ہر بار تیلی تیلی ہے کہ میں نے راسہبہ بننے کا ارادہ ترک نہیں کیا۔ میں صرف چند دن کی ملت چاہتی ہوں۔ کلاڈیوس کو ہمیشہ اس بات کا اندیشہ لگا رہتا ہے کہ وہ پھر کسی دنی خانقاہ میں چلی جائے گی اور اس مرتبہ اس کے لیے باہر آنے کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔

عاصم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے دل و دماغ میں اور اس کی نگاہوں کے سامنے فلسطینہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے کان صرف فلسطینہ کی کسکیاں سن رہے تھے۔

دیرس نے کہا۔ "میں نے تمیں ایک بات نہیں بتائی۔ میری شادی ہو چکی ہے۔"

عاصم نے مسکانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمیں مبارک باد دیتا ہوں۔ اور میرے خیال میں

تمہاری دلن کا نام جولیا ہے۔"

"ہاں، لیکن اب بھی یہ ایک خواب محسوس ہوتا ہے۔ شادی سے ایک ہفتہ قبل مجھے یہ ایسا ہی خواب آیا

کا باب اچانک مجھ پر اس قدر مہربان ہو جائے گا۔ میں جس قدر جولیا سے محبت کرتا تھا۔ اسی قدر مجھے اس بات

کا اندیشہ تھا کہ مرقس کا خاندانی غم جو ہمارے درمیان ایک آہنی دیوار کی طرح حائل ہے۔ کلاڈیوس کو اپنا بہترین دوست سمجھنے کے باوجود مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔ لیکن جب ہم دست گرد کی مہم میں آئے تو مرقس پہلی بار مجھ سے بغل گیر ہو کر ملا۔ اور ہماری سرگذشت سننے کے بعد اس نے کسی تمہید کے بغیر یہ اعلان کر دیا کہ اگر فلسطینہ پر کوئی نئی مصیبت نہ آگئی تو ایک ہفتہ کے اندر اندر جولیا کی شادی کر دی جائے گی۔ میں نے چمکتے ہوئے دولہا کے متعلق پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ "وہ ایک ہمارا اور قابل اعتماد زوجہ ہے اور اس کا نام دلیرس ہے۔"

دلیرس اپنی شادی کی ساری تفصیلات سننا چاہتا تھا۔ لیکن عاصم کا چہرہ تیار تھا کہ اس کے خیالات کسی اور سمت پر واڑ کر رہے ہیں۔ چنانچہ دلیرس نے اس کی بے توجہی سے پریشان ہو کر گفت گو کا موضوع بدل دیا۔



چند دن گھنٹوں پر سفر کرنے کے بعد عاصم اور دلیرس ایک دوپہر انطاکیہ میں داخل ہوئے تو انہیں یہ اطلاع ملی کہ بندر گاہ پر فلسطینہ کا ایک جہاز تیار کھڑا ہے۔ چنانچہ وہ کسی توقف کے بغیر بندر گاہ کی طرف چل دیے۔ لیکن وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ جہاز بھر چکا ہے۔ چند مسافر جنہیں اس جہاز میں جگہ نہیں ملی تھی کپتان کے ساتھ تیار کر رہے تھے۔ ایک غسانی رئیس انتہائی مخلص کی حالت میں چلا رہا تھا۔ وہ میں قیصر کے لیے اپنے سحران کی طرف سے مبارکباد کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ اگر مجھے اس جہاز میں جگہ نہ ملی۔ تو میں انطاکیہ کے حاکم سے تمہاری شکایت کروں گا۔ دیکھو میں قیصر کے لیے تمہارے لیے کھانا لے کر جا رہا ہوں اور فتح کے جشن سے قبل میرا فلسطینہ پہنچنا ضروری ہے۔"

کپتان نے بڑی مشکل سے اپنا لٹھہ ضبط کرتے ہوئے کہا میں تمہارے نکاحات پہنچا دینے کا ذمہ لے سکتا ہوں۔ لیکن تمہارے لیے میرے جہاز پر کوئی جگہ نہیں۔ فتح کا جشن کئی دن جاری ہے گا اور تمیں دو تین دن کے اندر کوئی جہاز مل جائے گا۔"

”لیکن میں قیصر کا جلوس دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ قیصر بہت جلد قسطنطنیہ پہنچ جائیگا۔“
 کپتان نے کہا۔ ”یہ تمام مسافر قیصر کا جلوس دیکھنے کے لیے بیتاب ہیں۔ لیکن اس بات کا فیصلہ صرف میں کر سکتا ہوں کہ میرے جہاز پر کتنے آدمی سوار ہو سکتے ہیں۔ شاید تین سو نہیں کہ انطاکیہ سے جتنے مسافر میرے جہاز پر سوار ہوتے ہیں۔ وہ سب قیصر کے لیے کوئی نہ کوئی تحفے لے کر جا رہے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں جسے قیصر کے جلوس سے دلچسپی نہ ہو۔“

دلیرس نے اپنے مضبوط بازوؤں سے لاسنہ صاف کرنا ہوا آگے بڑھا۔ اور بولا۔ ”تمہارے جہاز پر ایک تجربہ کار ملاح کو جگہ نہیں مل سکتی؟“
 ”دلیرس۔“ کپتان نے چونک کر کہا۔ ”آپ اتنی جلدی واپس آگے؟ میں نے تو یہ سنا تھا کہ آپ مدائن جا رہے ہیں۔“

دلیرس نے جواب دیا۔ ”مجھے وہاں جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور اب میں کسی تاخیر کے بغیر قسطنطنیہ پہنچنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھی گھوڑوں پر اپنا سفر جاری رکھیں گے۔ آپ کو صرف ایک اور مسافر کو جگہ دینی پڑے گی۔“

کپتان نے جواب دیا۔ ”آپ کو جہاز پر سوار ہونے کے لیے میری اجازت کی ضرورت نہیں۔“
 غسانی رئیس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ ”لیکن آپ تو یہ کہتے تھے کہ آپ کا جہاز بڑھ چکا ہے۔ میں درست کہتا ہوں۔ شاید نہیں یہ معلوم نہیں کہ دلیرس مجھے سارا جہاز خالی کرنے کا حکم دے سکتا ہو۔“
 تھوڑی دیر بعد دلیرس اور عاصم جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔ ہوا موافق تھی۔ اور چند دن بعد یہ جہاز ایک صبح بحیرہ مارمورا سے نکل کر آبنائے باسفورس میں داخل ہو چکا تھا۔ بائیں ہاتھ قسطنطنیہ کی فصیل پر گورنوں اور مردوں کا جھوم دکھائی دے رہا تھا۔ کسی جہاز بندرگاہ سے باسفورس کے دونوں کناروں پر رکے ہوئے تھے۔ سامنے، بحیرہ اسود کی سمت سے میں جنگی جہاز بندرگاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور سب سے اگلے جہاز پر قیصر کا پرچم لہرا رہا تھا۔

دلیرس، عاصم اور چند اور مسافر جہاز کے اگلے سرے پر کھڑے رہنے کو دیکھ رہے تھے۔ بہار کے

کپتان نے دلیرس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”جناب قیصر شریف لادبے ہیں اور اب کچھ دیر ہیں بندرگاہ سے دور رکنا پڑے گا۔ آپ کا کیا حکم ہے؟“

دلیرس نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے ہم قیصر کے بیڑے کی آمد سے پہلے بندرگاہ پر پہنچ سکتے ہیں۔“
 ”جناب میں آپ کی حکم عدولی نہیں کر سکتا لیکن مجھے ڈر ہے کہ جو لوگ بندرگاہ پر قیصر کے استقبال کے لیے کھڑے ہیں وہ میری اس جسارت کو پسند نہیں کریں گے۔“

دلیرس نے کہا۔ ”بہت اچھا تم کچھ دور آگے جا کر جہاز کا لنگر ڈال دو اور ہمارے لیے کشتی تیار دو۔ ہم بندرگاہ کے ایک طرف اتر جائیں گے۔“
 باقی مسافر ایک ساتھ شور مچانے لگے۔ ”جناب ہم بھی قیصر کا جلوس دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اتنی دور سے آئے ہیں۔ ہم برسوں سے اس مبارک دن کا انتظار کر رہے ہیں۔“

دلیرس نے کہا۔ ”ہمارا جہاز اس وقت بندرگاہ کے قریب نہیں جا سکتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم سب قیصر کا جلوس دیکھ سکو گے۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔“
 تھوڑی دیر بعد جب عاصم اور دلیرس کے علاوہ چند اور مسافر سی کی سیڑھی سے اتر کر کشتی پر سوار ہو رہے تھے۔ ایک تیز رفتار کشتی ان کے قریب پہنچی اور ایک رومی افسر نے پوری قوت سے چلا کر کہا۔ ”عظروا تم بندرگاہ کی طرف نہیں جا سکتے؟“

دلیرس نے ہڑ کر رومی افسر کی طرف دیکھا۔ اور اسے کچھ اور کہنے کی جسارت نہ ہوئی۔ دلیرس نے کہا۔ ”قسطنطنیہ کی بندرگاہ اتنی تنگ نہیں کہ یہ چھوٹی سی کشتی قیصر کا راستہ روک سکے۔“
 رومی افسر نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔ ”جناب میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔ لیکن آپ جلدی کریں شہنشاہ کا بیڑا بہت قریب آچکا ہے۔“

تم نکل کر دو۔ بیڑا ابھی کافی دور ہے اور تم اس عرصے میں اس جہاز کے مسافروں کو اتارنے کا بندوبست کر سکتے ہو۔ یہ سب قیصر کا جلوس دیکھنے کے لیے بیتاب ہیں۔ مسافروں کو اتارنے کے لیے دو اور کشتیوں کا فی ہوں گی۔“

دہاں ایسی عورتوں کی بھی کمی نہ تھی جو شراب کے نشے میں مدہوش مردوں سے بوس و کنار میں مشغول تھیں۔ ایک قوی بیگل رومی نے ایک دو شیزہ کو کندھے پر اتھا رکھا تھا۔ اور وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ ایک رومی شراب سے مدہوش ہو کر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا "میں فیصل سے چھلانگ لگا کر بسفول کے دوسرے کنارے پر پہنچ سکتا ہوں اور اس کے ساتھی چلا رہے تھے۔" تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم باطل جھوٹ کہتے ہو۔" شرابی نے ایک لڑکی کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا۔ "تم بتاؤ میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

"ہاں" اس نے نشے میں جھومتے ہوئے جواب دیا۔

"خدا کی قسم میں سچ کہتا ہوں۔ میں باطل سچ کہتا ہوں۔" شرابی نے لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر پسند جھٹکے دیے اور پھر کسی توقف کے بغیر فیصل سے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد چند تماشائی آگے بھٹک کر خندق میں پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھ رہے تھے اور باقی تھمتے لگا رہے تھے۔

دلیرس نے اپنے ایک یونانی دوست کے ہاتھ سے شراب کے دو جام پیئے کے بعد میسر جام عام کو پیش کیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔

دلیرس نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ "میرے دوست یہ شراب بہت اچھی ہے اور ایسا دن بار بار نہیں آتا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے لیے یہاں ٹھہرنا بہت تکلیف دہ ہے۔ لیکن اس وقت انہیں تلاش کرنا ممکن نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ قسطنطنیہ، انطونیا اور جولیا کے ساتھ ہوگی۔ اور وہ جلوس کے اختتام سے قبل گھر نہیں پہنچیں گی۔ چند گھنٹے پیئے کے بعد تمہاری پریشانی دور ہو جائے گی۔"

عام نے جواب دیا۔ "قید کے ایام میں میں کسی ایسے نشے کی ضرورت محسوس کیا کرتا تھا جو مجھے ہمیشہ کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دے۔ لیکن آج میں مدہوش ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

عام کی بات دلیرس کے یونانی دوست کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس نے دلیرس کے ہاتھ سے جام لیکر منہ کو لگا لیا اور اسے ختم کرنے کے بعد عام کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دنیا میں کوئی شراب کے بغیر زندہ کیسے رہ سکتا ہے۔ جب دشمن قسطنطنیہ کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا تو ہم اپنا غم غلط کرنے کے لیے پیا کرتے تھے اور اب جب ہمیں دشمن پر ایک عظیم فتح نصیب ہوئی ہے۔ تو ہمارا ہے

"بہت اچھا جناب۔ آپ کے حکم کی تعمیل میرا فرض ہے۔"



سہ قتل کا جنازہ بندرگاہ پر لگا اور چاروں طرف مسرت کے نعرے بلند ہونے لگے۔ وہ جہاز سے اترا۔ اور ہزاروں انسان فرط عقیدت سے دوڑا تو ہو گئے۔ وہ اپنے راستے میں بچھے ہوئے بیش قیمت قالینوں اور ان پر بکھرے ہوئے پھولوں کو روندنا ہوا آگے بڑھا اور شاہی رخت پر جس کے آگے آٹھ سفید گھوڑے بستے ہوئے تھے، سوار ہو گیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور لوگ نئے جوش و خروش کے ساتھ نعرے لگانے اور پھول پھینکاؤ کرنے لگے۔ اس کے آگے سینکڑوں آدمی باجے اور نقارے اٹھائے کھڑے تھے اور پیچھے جہازوں سے اترنے والے سپاہی فیصل درست کر رہے تھے۔ وہ اپنا ہاتھ بلند کر کے کبھی داییں، کبھی بائیں طرف دیکھتا اور کبھی اس کی نگاہیں فیصل پر جمع ہونے والوں کی طرف مرکوز ہو کر رہ جاتیں۔ اس کی ہر جنبش، ہر حرکت اور ہر ادا زبان حال سے اس امر کا اعلان کر رہی تھی کہ آج خدا کی دنیا میں میرے سوا کوئی نہیں۔

عام جسے دلیرس کی رفاقت کی بدولت بندرگاہ پر جمع ہونے والے جہوم سے نکلنے کے بعد فیصل کے ایک برج کے نیچے کھڑا ہونے کے لیے جگہ مل گئی تھی۔ غور اور سطوت کے اس پیکر عظیم کی طرف دیکھ کر بار بار یہ کہہ رہا تھا "مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی ہرقل ہے۔"

دلیرس نے کہا۔ "میرے دوست آج تم پہلی مرتبہ اسے ایک فاتح کی حیثیت میں دیکھ رہے ہو۔ آج تم قسطنطنیہ کے کسی باشندے کو نہیں پہچان سکو گے۔ آج دنیا کی ساری توانائی اور سالانہ دولت مسرت کر رہیوں کے وجود میں آگیا ہے۔ آج جب شاہی محل کی بالائی ستم ہرقل کی تقریر سنو گے تو یہ محسوس کر دو گے کہ تم نے پہلے کسی اس کی آواز نہیں سنی۔"

عام اپنے داییں بائیں ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو شراب کے مشکیزے اٹھائے ہوئے تھے۔ اور اپنے حکمران کی طرف دیکھنے اور انتہائی جوش و خروش کے عالم میں چند نعرے لگانے کے بعد ہر بار چند گھنٹے حلق سے اتارنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

یہ اپنی مسرتوں کے اظہار کے لیے بھی اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ ویلیرسین معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ساخنی فتح اور شکست دونوں سے نا آشنا ہے اور اس نے کوئی بڑا غم یا کوئی بڑی خوشی نہیں دیکھی۔

قیصر کا جلوس روانہ ہو چکا تھا اور لوگ بندرگاہ کی بجائے فیصل کی دوسری جانب دیکھ رہے تھے۔ بعض آدمی جلوس کا ساتھ دینے کی نیت سے نیچے اتر رہے تھے۔ ویلیرسین نے عامم سے کہا۔ ”میں نے ابھی کلاڈیوس کو دیکھا تھا۔ لیکن اب اُسے اتنی بھیڑ میں تلاش کرنا مشکل ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ ہم جلوس کے ساتھ چلنے کی بجائے دوسرے راستے محل کے سامنے پہنچ جائیں۔ جلوس کے اختتام پر قیصر اپنے محل کی بالکنی سے تقریر کرے گا۔ اور ہم اسے زیادہ قریب سے دیکھ سکیں گے۔“ پلو عامم چند برس بعد تم اس بات پر فخر کیا کرو گے کہ جب سترل ایران کی فتوحات سے واپس آیا تھا تو تم نے اپنی آنکھوں سے اس کا جاہ و جلال دیکھا تھا اور اپنے کانوں سے اس کی تقریر سنی تھی۔ اور تمہارے بچوں اور تمہارے پڑوسیوں کو تمہاری باتیں نا قابل یقین معلوم ہوں گی۔“

عامم نے ادھر ادھر دیکھا۔ ویلیرسین کا یونانی دوست وہاں سے جا چکا تھا اور جو لوگ ابھی تک وہاں موجود تھے وہ پورے انہماک سے فیصل کے ساتھ ساتھ ایک کھلی سڑک پر گزرتے ہوئے جلوس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عامم قدرے توقف کے بعد ویلیرسین سے مخاطب ہوا۔ ”میرے دوست میں نے اپنی زندگی میں جو کچھ دیکھا ہے وہ آج بھی مجھے ناقابل یقین محسوس ہوتا ہے۔ میں نے اس شہنشاہ کا جاہ و جلال دیکھا ہے جس کی نگاہوں کے اشاروں سے مشرق و مغرب کی اقوام کی قسمت کے فیصلے ہوتے تھے۔ میں سطوت اور غرور کے اس پیکر عظیم کو دیکھ چکا ہوں جس کے اقتدار کا سفینہ انسانیت کے خون میں تیرتا تھا۔ میں نے اس لشکر کی فتوحات دیکھی ہیں جس کی رفتار کے سامنے زمین کی وسعتیں سمٹ گئی تھیں۔ پرویز کے لشکر نے تمام اور مصر کی فتوحات کے بعد جو جشن منائے تھے وہ تمہارے اس جشن سے کم نہ تھے۔ پرویز نے فتح کے بعد میں نے شراب سے مدہوش ایلیوں کے جو مہیب قہقہے اور بے بس عورتوں کی چوچیں سنی تھیں، وہ اس وقت بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ میں اس اندوہناک مامی کو بھول جانا چاہتا ہوں جس کی تاریخ میرے نزدیک ظالم اور مظلوم کی داستان کے سوا کچھ نہیں۔“

ویلیرسین نے کہا۔ ”پرویز کا ظلم اس کی زندگی کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ اور اب ہم انسانیت کی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹ چکے ہیں۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم روم کی اس عظیم فتح پر خوش نہیں ہو۔“ عامم نے اپنے ہونٹوں پر ایک مخموم مسکراہٹ لگاتے ہوئے کہا۔ ”شاید میں ان لوگوں میں سے ہوں، جو ناممکنات پر یقین رکھتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کے چند المناک واقعات کے بعد یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ انسانیت کی نجات جنگ کے اختتام میں ہے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو یہ فریب دینے کی کوشش کی تھی کہ دنیا پر ایک عظیم شہنشاہ کے غلبہ سے قبیلوں، نسلوں اور ملکوں کی جنگ ختم ہو جائے گی۔ اور میرے نزدیک وہ عظیم شہنشاہ خسرو پرویز تھا۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ طاقت ایک جابر انسان کو انصاف کی طرف مائل نہیں کرتی، بلکہ اور زیادہ جابر بنا دیتی ہے اور میں پرویز کے لشکر کا ساتھ دے کر صرف اپنے انا کی تسکین کا سامان میا کر رہا تھا پھر جب حادثات مجھے جبراً ہرے لگاتے سے موڈ کر قسطنطنیہ لے آئے اور میں ایران کے ظالم حکمران کا ساتھ چھوڑ کر روم کے مظلوم حکمران کا طرف دار بن گیا تو میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ روم اور ایران کی جنگ مزید خونریزی کے بغیر ختم ہو جائے اور کم از کم آہائے باسفورس کے اس پار بسنے والے تباہی کے اس سیلاب سے بچ جائیں، جس کی ہونٹاکیاں مشرقی ممالک کے باشندے دیکھ چکے ہیں۔ لیکن صلح کے لیے سین کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد قیصر کی فتح میرے نزدیک ایک مجرہ تھی۔ اور میں نے قید سے رہا ہونے کے بعد یہ محسوس کیا تھا، قیصر کی یہ غیر متوقع کامیابی امن اور عدل و انصاف کے متعلق سین کے سپنوں کی تعمیر ہے لیکن آپ برانہ مانیے۔ ابھی تھوڑی دیر قبل جب میں قیصر کو رخت پر سوار ہوتے دیکھ رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گسٹری پرویز دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ اس کی صورت اُس حکمران سے مختلف نہ تھی جسے میں نے پرویز کی فتح کے بعد دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر نعرے لگانے والے بھی مجھے ان لوگوں سے مختلف نہیں دکھائی دیتے جو پرویز کو دیکھ کر نعرے لگایا کرتے تھے۔“

ویلیرسین نے قدرے برہم ہو کر کہا۔ ”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ قیصر اور ان کی رعایا کو اپنی فتح اور ایرانیوں کی شکست پر خوش نہیں ہونا چاہیے؟“

”نہیں، میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ فتوحات جو انسانوں کو دیوتاؤں کا غرور عطا کرتی ہیں، امن

کی بجائے ہمیشہ نئی جنگوں کے رستے کھولتی ہیں۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ امن کا راز کسی ایک انسان کسی ایک قوم یا کسی ایک ملک کی کسی دوسرے انسان، کسی دوسری قوم یا کسی دوسرے ملک پرستخ یا بالادستی میں نہیں۔ بلکہ تمام انسانوں پر کسی ایسے نظام کی فتح میں ہے جو ظالم کو کمزور کی حفاظت اور ننگبانی سکھاتا ہو۔ لیکن نہیں میری باتوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک دیوانے کا خواب ہے۔ اور اس دنیا میں اس کی تعمیر ممکن نہیں۔ یہاں ظالم مظلوم اور مظلوم ظالم بنتے رہیں گے۔ ہمیں مستقبل کے متعلق سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنے حصے کے آلام و مصائب جمیل چکے ہیں۔ اب جنگ ختم ہو چکی ہے اور ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ قیصر اپنی ان فتوحات پر قناعت کرے گا اور ہماری زندگی کے باقی سال امن سے گزر جائیں گے۔ پھر اگر کسی دن کسی نئے قیصر کے دل میں پرویزی کی روح بیدار ہوگی یا ایران کی زمین سے کوئی نیا اثر ڈھکے گا تو ہم یہ دیکھنے کے لیے اس دنیا میں موجود نہیں ہوں گے کہ ہمارے بعد آنے والوں پر کیا گزرتی ہے؟

دیرس کی آنکھوں میں شراب کا بخار جھلک رہا تھا۔ اس نے کہا: ”تمہاری باتوں کی داد صرف کلاڈیوس دے سکتا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اب پلو آج تمہیں ہر قتل کی تقریر ضرور سننی چاہیے۔“
عاصم نے کہا: ”نہیں تم جاؤ۔ میں اب سیدھا کلاڈیوس کے گھر جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ فلسطینہ وہیں ہو۔ اور اگر وہ وہاں نہ ہوئی تو بھی میرے لیے وہاں بیٹھ کر انتظار کرنا زیادہ آسان ہوگا۔“



کلاڈیوس کے گھر میں ایک بوڑھے نوکر کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس نے عاصم کی طرف دیکھا اور کہا: ”آپ عاصم ہیں؟ معاف کیجیے میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ آگئے ہیں۔ کلاڈیوس اور ان کے والد کو قیصر کے بعد سب سے زیادہ آپ کا انتظار تھا۔ وہ سب قیصر کا جلوس دیکھنے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔ آپ تشریف رکھیں وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔“

عاصم نے سوال کیا۔ ”فلسطینہ کیسی ہے؟“

”جی، اس کی ماں مرگئی تھی اور وہ ابھی تک اس کا نم نہیں بھول سکی۔ وہ آپ کے لیے بھی تیرنا ہر روز گرجے میں جا کر دعا کیا کرتی ہے۔ میں اکثر اس کے ساتھ جایا کرتا ہوں اور میں نے دعا کے وقت اکثر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں۔ اگر آپ تھوڑی دیر پہلے آجاتے تو وہ یہیں تھی۔ الطونیا اور جوسیا کے اصرار کے باوجود وہ ان کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ اسے اب گرجے اور قبرستان کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہی۔ جب وہ چلی گئیں تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں گرجے جا رہی ہوں۔ میں نے کہا: آج وہاں کوئی نہیں ہوگا اور شاید گرجے کا دروازہ بھی بند ہو۔ وہ کچھ دیر بیٹھی رہی اور پھر اچانک اٹھ کر لوٹی۔ میں قبرستان کی طرف جا رہی ہوں۔“ پھر اس نے چند بھول توڑے اور باہر نکل گئی۔ اگر گھر میں کوئی ہوتا تو میں یقیناً اس کے ساتھ جاتا۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں۔ وہ بہت جلد آجائے گی۔ قبرستان زیادہ دور نہیں۔“

”وہ کون سے قبرستان کی طرف گئی ہے؟“

”وہ قبرستان مغربی دروازے کے باہر ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں اُسے بلاتا ہوں۔“

”نہیں، میں خود وہاں جانا چاہتا ہوں۔“ عاصم یہ کہہ کر واپس مڑا۔ بیرونی دروازے کے قریب اس نے ایک کیاری سے گلاب کے چند پھول توڑے اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ مغربی دروازے سے باہر ایک قبرستان کے اندر داخل ہوا۔ وہاں ایک ٹیلے کے دامن میں اسے دور سے ایک سیاہ پوش عورت دکھائی دی۔ وہ بھاگ کر آگے بڑھا، رکا، پھر کبھی تیز اور کبھی سست رفتار سے ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور اس کی ٹانگیں ٹکڑھا رہی تھیں۔ فلسطینہ نے اچانک مڑ کر دیکھا اور عاصم کے پاؤں کی زمین سے پیوست ہو کر رہ گئے۔ چند ثانیے وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر زندگی کے پرسکون سمندر میں اچانک ایک طوفان اٹھا۔ اور وہ بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

عاصم نے کہا: ”فلسطینہ! میں آگیا ہوں۔ میں زندہ ہوں۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“

اور فلسطینہ کے لذتے ہوئے ہونٹوں سے سسکیوں کے سوا اور کوئی آواز نہ نکلی۔ پھر یہ دہی
 دس سکیاں بلند ہوتے لگیں اور عاصم اپنے سینے پر اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس کرنے لگا۔
 اچانک اس نے ایک لپکی لی اور عاصم سے جدا ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔
 عاصم نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
 ”فلسطینہ میری طرف دیکھو۔ میں سچ زندہ ہوں۔“

لیکن فلسطینہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور ایک پچے کی طرح پھوٹ پھوٹ
 کر رونے لگی۔

عاصم نے زندگی ہوتی آواز میں کہا۔ ”کاش میں تمہاری کھوئی ہوئی سسکتی واپس لاسکتا۔ یہ تمہاری
 ماں کی قبر ہے؟“

اس نے عاصم کی طرف دیکھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور عاصم نے آگے بڑھ کر قبر پر گلاب کے
 پھول رکھ دیے۔ اور پھر فلسطینہ کی طرف منسوب ہو کر کہا۔ ”فلسطینہ! میں جانتا ہوں کہ میری محبت نے تمہیں
 آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ لیکن اپنے مقدر کی تاریخوں میں تمہاری آنکھوں کی روشنی میرا آخری سہارا
 تھا۔ فلسطینہ میری طرف دیکھو۔“

فلسطینہ اپنے آنسو پونچھنے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”عاصم میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں
 بیٹھ جاؤ۔“

وہ گھاس پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ اور فلسطینہ نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے
 کے بعد کہا۔ ”میں اسی دن کے لیے دعائیں کیا کرتی تھی۔ اور میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ مرنے
 سے پہلے ایک بار تمہیں دیکھ لوں۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ اب مجھے خدا کے سوا اپنا وعدہ پورا
 کرنے کے لیے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ میری بات غور سے سنو عاصم! اپنے باپ کی
 المناک موت کی خبر سننے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ انہیں میرے گناہ کی سزا ملی ہے اور میرا
 گناہ تھا کہ میں نے ایک راہبہ کی مقدس زندگی پر دنیاوی زندگی کی لذتوں کو ترجیح دی تھی۔ میں

یہ تسلیم کی سب سے بڑی خانقاہ کے بئپ کی باتوں کا مذاق اڑایا تھا۔ میں نے راہبہ بننے سے اس لیے
 انکار کیا تھا کہ میرا باپ ایران کی فوج کا ایک بہت بڑا عہدہ دار تھا۔ اور میں ایک عیسائی ماں کی بیٹی ہونے کے
 باوجود ایک فاتح قوم کے ساتھ تعلق رکھتی تھی۔ میری ماں کو بھی یہ بات پسند نہ تھی کہ میں جیسے ہی اس دنیا
 سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ وہ خانقاہ کو قبر سے زیادہ جیسا تک سمجھتی تھی۔ لیکن مرتے وقت اسے بھی اس بات
 کا شدت سے احساس تھا کہ مجھے راہبہ بننے سے روکنا اس کی زندگی کا سب سے بڑا گناہ تھا۔ ماں کی موت کے
 بعد میں اپنے گناہ کا کفہ ادا کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ صرف تمہارا خیال میرا راستہ روکے ہوئے تھا۔ انٹونیز مجھے
 سمجھایا کرتی تھی کہ جب عاصم واپس آئے گا تو تمہارے بغیر اس کا کیا حال ہوگا۔ راہبہ بننے کے بعد
 تم اس کے ساتھ بات نہ کیں کہ سکوگی۔ پھر جب تم نہ آئے تو میں نے یہ محسوس کیا کہ تمہاری قید
 کی طوالت بھی شاید میرے گناہ کا نتیجہ ہے۔ قدرت کو یہ منظور نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکیں چنانچہ
 میں ایک دن خانقاہ میں چلی گئی۔ لیکن وہاں میں نے خواب میں دیکھا کہ تم آگے ہو اور میں وہاں سے
 بھاگ آئی۔ لیکن خانقاہ چھوڑتے وقت میں نے یہ حلف اٹھایا تھا کہ اگر تم واپس آگے تو میں راہبہ
 بن جاؤں گی۔ آج خدا نے میری دعائیں سن لی ہیں اور میں خدا کے سوا اپنا وعدہ پورا کر دوں گی۔ اگر اب میرا
 ارادہ مترنزل ہوا تو میرا انجام تبرناک ہوگا۔ میں شاید اپنے لیے ہر سزا برداشت کر سکوں۔ لیکن میں یہ
 گوارا نہیں کروں گی کہ میری وجہ سے تم عذاب میں مبتلا ہو جاؤ۔“

عاصم نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔ ”میرے لیے اس سے بڑا عذاب کیا ہو سکتا ہے کہ میں زندہ رہوں
 لیکن میری بیچیں تمہیں نہ دیکھ سکیں اور میرے کان تمہاری آواز نہ سن سکیں۔“

فلسطینہ کرب انگیز لہجے میں چلائی۔ ”عاصم خدا کے لیے میری طرف اس طرح نہ دیکھو۔ دنیا میں
 صرف تم ہی مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش میں پورا اترنے کے لیے سہارا دے سکتے ہو۔
 میں آج غروب آفتاب سے قبل خانقاہ میں چلی جاؤں گی۔ اور اس سے قبل میں تمہاری زبان سے صرف
 یہ سننا چاہتی ہوں کہ تم مجھے بھول جاؤ گے۔“

عاصم نے کہا۔ ”ایک انسان اپنی موت سے پہلے نہیں مر سکتا اور ابھی شاید میری موت کا وقت

تزیب نہیں آیا۔ فسطیہ میری بات خود سے سنو۔ قید کے ایام میں میری زندگی کا کوئی لمحہ تمہارے تھوکے بغیر نہ تھا۔ تاہم اگر مجھے اس بات کا یقین ہو جائے کہ تم میرے بغیر زیادہ خوش رہ سکتی ہو تو میں نہیں سے اٹے پاؤں واپس چلا جاؤں گا۔ ویرانوں میں جھٹکنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ تمہاری خانقاہ کی تاریخیاں میرے قید خانے کے اندھیروں سے زیادہ بھیانک ہوں گی۔ تم سین کی بیٹی ہو اور میں نہیں ان راہبوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہیں جاؤں گا جو انسانیت کی تذلیل کو سب سے بڑی نیکی سمجھتے ہیں۔

”لیکن یہ تذلیل میرے گناہوں کا ثمار ہوگی۔“

”فسطیہ!“ اس نے جوش میں اگر کہا۔ ”تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اور دنیا میں کسی کو یہ حق نہیں کہ تمہیں جیتے جی قبر میں دیدے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں فسطیہ! اور تمہاری خانقاہ میرا دل ہے۔ تمہیں انطونہ اور کلاڈیوس نے یہ نہیں بتایا کہ خانقاہوں میں انسانوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔؟ تم نے ان راہبوں کو نہیں دیکھا جن کی صورتیں بگاڑ دی جاتی ہیں۔ فسطیہ مجھ سے یہ تو ممکن ہے کہ میں کسی شہزادے کو پکڑ تمہارے سامنے لے آؤں اور یہ کہوں کہ یہ مجھ سے زیادہ حسین، زیادہ بہادر اور زیادہ متمول ہے اور اس کی رفاقت میں تمہیں وہ راحتیں مل سکتی ہیں جو مجھ جیسا غریب الیادار نہیں دے سکتا۔ لیکن خدا کی قسم! اگر یہ خانقاہوں کے رازبب ہو امیں اڑ کر دکھائیں تو مجھ میں یسوع نہیں کہوں گا کہ وہ خدا کی طرف سے ایک حسین صورت کو مسخ کرنے کا حق لے کر آئے ہیں۔ تم جس خانقاہ میں جاؤ گی اس کے آہنی دروازے بھی میرا راستہ نہیں روک سکیں گے۔ میں اپنی بے بسی اور بے چارگی کے باوجود تمہیں یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ تم صرف میری لاش پر پاؤں رکھ کر وہاں جا سکو گی۔“

فسطیہ نے آب دیدہ ہو کر کہا۔ ”میرا خیال تھا کہ تم مجھے حوصلہ دو گے۔ لیکن تم میری مشکل میں اضافہ کر رہے ہو۔“

عاصم نے اس کے قریب ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”فسطیہ! آج تم اس لڑکی سے زیادہ نادان ہو، جس نے میرے ساتھ بروشلیم سے دمشق تک سفر کیا تھا۔ اور آج تمہیں میری رفاقت کی زیادہ ضرورت ہے۔ میں تمہارا ہر گناہ اپنے سر لینے کے لیے تیار ہوں۔ تم میری ہر فسطیہ“

فسطیہ بے اختیار عاصم کے ساتھ پٹ گئی اور اپنا پھرہ اس کے کشادہ سینے کے ساتھ بچھ کر بولی۔ عاصم میں ہمیشہ تمہاری تھی مجھے اپنے سینے میں چھپا لو۔ مجھے ایسی جگہ لے چلو جو خوف سے آزاد ہو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہی تھی۔ اگر ہمارے مقدر میں صرف آگ ہے تو ہم ایک ساتھ کیوں نہ جلیں۔ تم میرے ہو۔ تم میرے ہو۔ اب مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ میں وہی ہوں جس نے تمہارے ساتھ دمشق تک سفر کیا تھا۔ اسی قدر کمزور اور بے بس۔ لیکن مجھے خوف محسوس نہیں ہوتا۔ تم یہاں کیسے پہنچ گئے۔ تم گھر گئے ہو گے اور بوڑھے نوکر نے تمہیں بتایا ہو گا کہ وہ بیوقوف لڑکی قبرستان میں گھوم رہی ہوگی۔ میں ہر قفل کا جھلس دیکھنے نہیں گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تم آ رہے ہو۔“

وہ مسکرا رہی تھی اور عاصم کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔

پھر وہ بیکار ایک اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے حسین ہنرے پر ایک مصنوعی غصہ لانتے ہوئے بولی۔ ”تم نے یہ کیا کیا تھا کہ تم کسی شہزادے کو میرے سامنے لا کر یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے؟ کیا تم میرے شہزادے نہیں ہو۔“

عاصم نے اس کے بالوں کے ساتھ کھیلنے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا ہوں۔ لیکن میں تمہارا ہوں۔“

پھر وہ ایک دوسرے کو اپنی اپنی سرگزشتہ سنار سے تھے۔ سورج سر پر آگیا تو وہ اٹھ کر چنار کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔

فسطیہ نے کہا۔ ”تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ چلو گھر چلیں۔“

”مجھے اب بھوک یا تھکاوٹ کا احساس نہیں رہا۔ اور گھر جانے سے پہلے میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہیں ایک ایسے آدمی کی بیوی بننا منظور ہے۔ جسے یہ دنیا تمہاری محبت کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔“

فسطیہ نے جواب دیا۔ ”کیا اب یہ سوال بے معنی معلوم نہیں ہوتا؟“

عاصم نے کہا۔ ”فسطیہ! میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہماری شادی کب اور کہاں ہوگی۔ اور اس کے

”میں صرف یہ جانتی ہوں کہ یہ باتیں تم مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہو۔“

”عاصم پولا۔ اگر میں یہ کہوں کہ ہمیں آج ہی شادی کر لینی چاہیے۔ تو؟“

”فسطینہ نے جواب دیا۔ ”عاصم میں راہبہ بننے کی قسم توڑ چکی ہوں۔ اب اگر تم کھاڈوس کے گھر جا کر یہ اعلان کر دو کہ ہماری شادی ہو چکی ہے تو مجھ میں شرم محسوس نہیں کروں گی۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تمہاری آمد کی اطلاع سننے ہی خانقاہ کے راہب میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ اور ان کے غماب کے خوف سے شہر کا کوئی پادری ہماری شادی کی رسومات ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ ہمارے خلاف عام لوگوں کو مشتعل کرنے کے لیے ان کا یہ کہ دینا کافی ہوگا کہ میں عیساٹی ہوں اور تمہارا مذہب مجھ سے الگ ہے کاش میں یہ کہہ کر ان کا منہ بند کر سکتی کہ تم قسطنطنیہ کے تمام عیسائیوں سے بہتر ہو۔“

عاصم نے کہا۔ ”عرب میں میرا مذہب چند ایسی مٹھکے خیز رسومات کا مجموعہ تھا۔ جنہیں اب بیان کتنے ہوئے ہیں۔ مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ ہم حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے رب کو ماننے کے علاوہ کئی اور خداؤں کے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اور ان خداؤں کے ساتھ ہماری عقیدت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم لوٹ مار، قتل و غارت اور دشمن قبائل سے اپنے قبیلے کی طاقت کا لوہا منوانے کے لیے ان کی اعانت کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ میں بھی ینزب کے دوسرے لوگوں کی طرح مناتہ کے بت کی پوجا کیا کرتا تھا۔ یہ ایک بے جان پتھر تھا۔ لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ مجھے اپنے دشمن قبیلے کو مغلوب کرنے اور اپنے عزیزوں کے قاتلوں سے انتقام لینے کی قوت عطا کر سکتا ہے۔ اب اپنے قبیلے سے محبت، اطاعت اور وفاداری کے تمام رشتے توڑنے کے بعد میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ عرب کے تمام بڑے اور چھوٹے خداؤں کے ساتھ بھی میرے رشتے ختم ہو چکے ہیں۔ اب مجھے کسی کا خون بہانے کے لیے ان کی اعانت کی ضرورت نہیں۔ تم یہ کہہ سکتی ہو کہ اب میرا کوئی مذہب نہیں مجھے کسی ایسے دین کی تلاش تھی جو ایک انسان کو دوسرے انسان، ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے یا ایک قوم کو دوسری قوم کے ظلم سے بچا سکتا ہو۔ اپنا وطن چھوڑنے سے قبل میں کہیں ایک نبی کے ظہور کے متعلق سننا کرتا تھا۔ لیکن میرے لیے یہ بات ناقابل یقین تھی

کہ عرب کے صحرا سے کوئی پچھتمہ پھوٹ سکتا ہے۔ لیکن اس نبی کی ایک بات میرے لیے حیران کن ہے جب کسری پروز کا نور اور قبصر کی بے بسی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی تو میں نے یہ سنا تھا کہ اس نے زمینوں کی فتح اور ایرانیوں کی شکست کی پیش گوئی کی ہے۔ مرتے وقت تمہارے باپ کو اس پیش گوئی کی قضا کا یقین تھا۔ میں نے اس نبی کو نہیں دیکھا۔ لیکن میں عرب کے حالات سے واقف ہوں۔ وہاں کسی ایسے دین کا پندنا ممکن نہیں جو انسانیت کی بھلائی چاہتا ہو۔ ممکن ہے کہ کہ کا نبی غیب کے حالات جانتا ہو۔ لیکن اگر وہ ساری دنیا کو سلامتی کا پیغام دینے کی بجائے صرف عرب کے قبائل کے درمیان نفرت کی دیوا رہیں مسمار کرنے میں کامیاب ہو گیا تو بھی میں اسے انسانی تاریخ کا ایک عظیم ترین معجزہ سمجھوں گا۔

بظاہر ہماری زندگی میں ایسا وقت نہیں آسکتا کہ عرب کے ظلمت کدے سے کوئی روشنی نمودار ہو جو کہ شرق اور غرب میں پھیل جائے۔ لیکن اگر یہ ہوا تو ایسے دین کا جنم اٹھانا اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھوں گا۔ سردست میرے لیے تمام مذاہب ایک جیسے ہیں۔ اور اگر میرے عیساٹی کھلانے سے تمہاری الجھن دور ہو سکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

فسطینہ نے کہا۔ ”راہبہ بننے کا ارادہ توڑنے کے بعد میں اپنے دین کی مجرم بن چکی ہوں۔ اب میرے لیے یہ مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ تمہارا مذہب کیا ہے اور میرے نزدیک اس وقت بھی اس سوال کی کوئی اہمیت نہ تھی جب ہم پہلی بار ملے تھے۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ تم جو کچھ بھی ہو میرے ہو اور تمہاری موجودگی میں مجھے کوئی ڈر یہاں تک کہ کلیسا کا ڈر بھی محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن شادی کے لیے ہیں یہاں کے قانون کے تقاضے پورے کرنے پڑیں گے۔ اس کے راہبوں کی نگاہوں سے بچنے کیلئے مجھے قسطنطنیہ چھوڑنا پڑے گا۔ انطونیا یہ کہتی تھی کہ مجھ سے راہبہ بننے کا مطالبہ کرنے والوں کو دولت کا لالچ ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ابران کے سپہ سالار کی بیٹی کوئی اہمیت بڑا خزانہ اپنے ساتھ لائی ہے۔ میں اپنی مال کی موت کے چند دن بعد اپنی ساری پونجی ایک خانقاہ کو پیش کرنا چاہتی تھی۔ لیکن انطونیا نے میرے ہیرے درزیورات چھین کر اپنے پاس رکھ لیے تھے اور وہ یہ کہا کرتی تھی کہ تمہاری شادی تک یہ امانت میرے پاس رہے گی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ پھر میں یہ سوچا کرتی تھی کہ اگر تم واپس آؤ

انگے تو میری پوجی تمہارے کام آئے گی۔ چنانچہ ایک دن چوری چھپے خانقاہ جانے سے پہلے میں انطونہ سے یہ وعدہ لیا کہ اگر مجھے کوئی حادثہ پیش آ گیا تو وہ میرا سایہ تمہارے حوالے کر دے گی۔ جب میں دو دن کے لیے خانقاہ میں گئی تھی تو بٹشپ بار بار مجھ سے یہ کہتا تھا کہ اگر تم اپنی کوئی چیز پیچھے چھوڑ آئی ہو تو اس کا یہ مطلب ہوگا۔ تم نے ابھی تک دنیا سے اپنے تعلقات قطع نہیں کیے۔ مجھے مجبوراً یہ وعدہ کرنا پڑا کہ راہبہ بننے کا آخری حلقہ اٹھانے سے پہلے میں اپنی ساری پوجی یہاں لے آؤں گی۔ پھر میں وہاں سے بھاگ آئی۔ اس کے بعد وہ کئی بار کلاڈیوس کے گھر آ کر مجھے ملاست کر چکا ہے۔ انطونہ نے یہ کہہ کر بڑی مشکل سے میرا پیچھا چھڑایا تھا کہ قسطنطنیہ کا ایک عزیز ایرانیوں کی قید میں ہے۔ اور اس کی واپسی تک یہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ وہ انطونہ پر بھی بہت برہم ہوتا۔ لیکن جب میں نے یہ وعدہ لیا کہ اگر عاصم زندہ واپس آ گیا تو میں راہبہ بننے کا وعدہ پورا کر دوں گی تو اس کا غصہ جاتا رہا۔

اس کے بعد بٹشپ بذاتِ خود کلاڈیوس کے گھر نہیں آیا۔ لیکن وہ ہر مہینے دو تین مرتبہ ایک راہبہ کو میرے پاس ضرور بھیج دیتا ہے۔ خدا معلوم قسطنطنیہ کی دو اور خانقاہوں کے راہبوں کو میرے حالات کا کیسے علم ہو گیا کہ چند ماہ سے وہ بھی میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ہر خانقاہ کے مبلغ میرے پاس آ کر جس جوش و خروش کے ساتھ اپنے اپنے پیشواؤں کے معجزات بیان کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ وہ دوسری خانقاہوں کے راہبوں کی مذمت کرتا ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف الزامات سن کر مجھے تعجب ہوتا ہے۔

عاصم نے کہا: ”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں آج ہی یہاں سے بھاگنے کی فکر کرنی چاہیے۔ درنہ یہ عجیب نہیں کہ قسطنطنیہ کی تمام خانقاہوں کے راہب جمع ہو جائیں اور کلاڈیوس کا گھرانہ کی جنگ کا اکھاڑہ بن جائے۔“

قسطنطنیہ نے کہا: ”نہیں، تمہیں اس قدر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری شادی کی مخالفت میں کوئی طوفان نہیں اٹھے گا۔ بٹشپ سائن جو تمہارے ساتھ دست گرد کیا تھا، مجھ پر بہت مہربان ہے۔ اس کی نگاہ میں میرے والد عیسیائیت کے بہت بڑے محسن تھے۔ اس نے

کئی بار کلاڈیوس کے گھر آ کر مجھے تسلی دی ہے کہ ایک دن وہ شہنشاہ کا تحریری فرمان لے کر آیا تھا جس کی رو سے میں دمشق میں اپنے نانا کی ساری جائیداد کی وارث ہوں۔ اور اس نے مجھے یہ کہا تھا کہ اگر تم وہاں جانا چاہتی ہو تو میں تمہارے لیے جہاز کا انتظام کر سکتا ہوں۔ وہ تمہاری بھی بے حد عزت کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم ان کے پاس چلے جائیں تو وہ ہماری شادی کے لیے یہ پوچھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کریں گے کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ لیکن راہبہ بننے کے متعلق میرے عوام اس قدر مشہور ہو چکے ہیں کہ ہمارے لیے قسطنطنیہ میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ میں اپنے لیے نہیں، لیکن آپ کے لیے ان راہبوں کی بددعاؤں سے ضرور ڈرتی ہوں۔“

عاصم نے کہا: ”قسطنطنیہ جب تک تم میرے ساتھ ہو۔ میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم قسطنطنیہ میں رہتے ہیں یا دمشق میں۔ اگر سائن زندہ ہے تو میں اس کی شرافت پر اعتماد کر سکتا ہوں۔ اب چلو۔ ہمیں شام سے پہلے بہت کچھ کرنا ہے۔“



بٹشپ سائن جوڑوں میں درد کے باعث بستر پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ ایک نوکر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: ”مقدس باپ، چند آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

سائن نے جھلا کر کہا: ”یہ قوتِ نم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ مقدس باپ اس وقت نزع کے عالم میں ہے۔“

”جناب میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ آپ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ آپ کو دیکھنے پر صبر نہیں کیا۔ انہیں ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔“

”خدا تمہیں عافیت کرے وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ میں بستر پر آرام سے لیٹا ہوا ہوں۔“

”جناب میں نے انہیں یہ بھی سمجھایا تھا کہ آپ کو سخت تکلیف ہے۔ لیکن وہ یہ کہتے تھے، کہ آپ کا کوئی دوست جسے دست گرد میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ واپس آ گیا ہے۔ اس کا نام عاصم ہے

جب میں نے یہ کہا کہ اس وقت ملاقات نہیں ہو سکتی تو وہ یہ کہتے تھے کہ اگر آپ کا دوست آپ سے ملے بغیر واپس چلا گیا تو آپ بہت خفا ہوں گے۔“

سامن نے جلدی سے اٹھ کر اپنی لامٹی سنبھالی اور باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ”خدا کی قسم! اگر وہ ملے بغیر چلا جاتا تو میں تمہاری کھال اتروا دیتا۔“

وہ ملاقات کے کمرے میں داخل ہوا۔ کلاڈیوس، ولیرس اور عاصم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سامن نے اپنی لامٹی ایک طرف پھینک دی اور عاصم سے لنگھ کر کہا۔ ”میرے لیے تمہاری آمد کی خوشی فیصلہ کی آمد کی خوشی سے کم نہیں۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ لیرس تمہیں اتنی جلدی واپس آئیگا۔“ ولیرس نے کہا۔ ”مقدس باپ یہ مجھے اظہار سے چند منازل دور راستے میں مل گئے تھے۔“

وہ بیٹھ گئے اور جب عاصم نے سامن کے سوالات کے جواب میں مختصراً اپنی سرگزشت بیان کر دی۔ تو اس نے کہا۔ ”میں بیمار تھا۔ لیکن اب مجھے اس بات کا افسوس نہیں کہ میں فیصلہ کا جلوس نہیں دیکھ سکا۔“

عاصم نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ ہم نے آپ کو لیے وقت تکلیف دی۔“

”نہیں نہیں، میرے لیے اس سے بڑی راحت کیا ہو سکتی ہے۔ ایک لمحہ پیشتر میں درد سے کراہ رہا تھا۔ اور اب مجھے اس کا احساس بھی نہیں رہا۔ اب بناؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں میں نے تیس سالہ پرانی شراب کا ایک ٹکا سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اور تم اور تمہارے بھتیجنے سے زیادہ اس کا کوئی اور حق دار نہیں ہو سکتا۔“

عاصم نے جواب دیا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ میں شراب نہیں پیتا۔ اور میرے دوستوں کی بچھیں اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ وہ ایک دن کی ضرورت سے زیادہ پی چکے ہیں۔“

”اُف مجھے یہ بات یاد نہیں رہی کہ تم شراب ترک کر چکے ہو۔ اچھا یہ بناؤ۔ میں اس وقت اور کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

عاصم نے کلاڈیوس کی طرف دیکھا اور اُس نے کہا۔ ”مقدس باپ! عاصم کی سب سے بڑی

خواہش یہ ہے کہ اس کی شادی کی رسومات آپ کے گرجے میں ادا ہوں۔ لیکن بد قسمتی سے آپ علیل ہیں۔“

سامن مسکرایا۔ ”اگر کسی اور کی شادی کا مسئلہ ہوتا تو میں یہ جواب دیتا کہ میں قریب المرگ ہوں۔ لیکن عاصم کا معاملہ مختلف ہے۔ پھر وہ عاصم کی طرف متوجہ ہوا۔ ”بیٹا اگر میں غلطی پر نہیں، تو تمہاری دلن سین کی بیٹی ہے۔ وہ کلیسا کا ایک بہت بڑا محسن تھا۔ اور اس کی بیٹی کی شادی کی رسومات ادا کرنا میں اپنی زندگی کا اہم ترین واقعہ سمجھوں گا۔ تم کل صبح جوتے ہی میرے گرجے میں پہنچ جاؤ۔ اگر میں زندہ ہوں تو وہاں مجھے موجود پاؤ گے۔ مجھے فسطنیہ کی الجھنوں کے متعلق کچھ علم ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ تم آگئے ہو۔“

عاصم نے کہا۔ ”آپ کو تکلیف ہوگی۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم صبح یہیں حاضر ہو جائیں۔“

”نہیں، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اور اگر تم کوئی اور خدشہ محسوس کرتے ہو تو میں نہیں یہ تسلی دے سکتا ہوں کہ میرا گرجا میرے گھر سے کم محفوظ نہیں۔“

اگلی صبح سامن کے گرجے میں عاصم اور فسطنیہ کی شادی کی رسومات ادا ہو رہی تھیں۔ اور اس رات کلاڈیوس کے گھر میں ایک شاندار دعوت کا اہتمام ہو رہا تھا۔ جب کوئی دو سو مہمان ایک وسیع دسترخوان پر بیٹھ گئے تو ایک گنجی مکان کے دروازے پر کی۔ دو آدمیوں نے لکڑی کا ایک بھاری مٹکا گنجی سے اتارا اور اُسے اٹھا کر صحن میں داخل ہوئے۔ پھر گنجی سے ایک پادری اترتا اور لامٹی کے سہارے چلتا ہوا ان کے پیچھے ہولیا۔ یہ سامن تھا۔ کلاڈیوس نے جلدی سے اٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ سامن نے دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے کلاڈیوس کے باپ سے کہا۔ ”مرقس تمہارے دسترخوان پر کسی چیز کی کمی نہیں۔ لیکن پرانی شراب کا یہ مٹکا میں نے تیس سال سے کسی اہم موقع کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ اور میرے نزدیک اس مٹکے کو کھولنے کے لیے اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ ہم جس شخص کی شادی کی دعوت کر رہے ہیں وہ ایک عوب ہونے کے باوجود شراب نہیں پیتا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ اس کے مہمان مجھے یالوس

نہیں کریں گے۔“

رومی سینٹ کے ایک رکن نے جنتے ہوئے کہا۔ ”مقدس باپ! اگر اس منگے میں پانی نہیں تو ہم یقیناً آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔“

آدھی رات کے قریب کلاڈیوس کا گھر مہمانوں سے خالی ہو چکا تھا۔ اور نختوری دیر بعد عاصم بالانخانے کے ایک کمرے میں فسطینہ سے کہہ رہا تھا۔ ”فسطینہ ہم زندہ ہیں۔ ماضی کے آلام و مصائب کی چپکی میں پسے کے باوجود ہم زندہ ہیں۔“

اور فسطینہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آج ہمیں ماضی کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے۔ ہم اس گرداب سے نکل چکے ہیں۔ اور ہمیں مستقبل کے متعلق بھی سوچنے کی ضرورت نہیں۔“

”مجھے کل اور آج کے تمام واقعات ایک خواب محسوس ہوتے ہیں۔“

”یہی ایک خواب ہماری زندگی کا حاصل ہے۔ کاش زمانے کی گردش ختم جائے اور ہم کبھی اس

خواب سے بیدار نہ ہوں۔“

”لیکن فسطینہ اس دنیا میں آج بھی بے شمار لوگ ایسے ہوں گے جو حال کی مایوسیوں میں مستقبل کی امیدوں کا سہارا لے رہے ہوں گے۔ اور کئی ایسے بھی ہوں گے جن کے مستقبل کا تصور حال سے زیادہ بھیاںک ہو گا۔ جن کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوگی کہ زندگی کے مدد و سال ایک آنکھ جھپکنے کی دیر میں گزر جائیں۔“

کبھی مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وقت انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔“

فسطینہ نے جواب دیا۔ ”ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ واقعی انسان کا دشمن تھا۔ لیکن آج ہم یہ کیوں نہ سوچیں کہ ہمارے مستقبل کے راستے میں وہ بھنور نہیں ہوں گے۔ جن میں پھنسنے کے بعد انسان وقت کو اپنا دشمن خیال کرتا ہے۔ بلکہ ہمارے راستے میں وہ حسین دادیاں ہوں گی۔ جن سے گذرتے ہوئے ہم یہ محسوس کریں گے کہ کاش وقت کی رفتار اتنی تیز نہ ہوتی۔“

”یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب کہ قدرت دنیا میں کسی ایسے معلم کو بھیج دے جو انسانوں کو زندگی کسنے آداب سکھا سکتا ہو۔ جو ہر انسان کو یہ احساس عطا کر دے کہ وہ دوسروں

کے لیے آنسوؤں کے نہیں بلکہ مسکراہٹوں کے سامان پیدا کرنے کے لیے آیا ہوا۔“

”تم پھر کسی نبی کے متعلق سوچ رہے ہو؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”ایک انسان اپنی سب سے بڑی احتیاج کے متعلق سوچے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

فسطینہ مسکرائی۔ ”اس وقت میری سب سے بڑی احتیاج یہ ہے کہ تم صرف میری طرف دیکھتے رہو۔“

نہ کہیں۔“

مرقس نے کہا ”بیٹا اگر تم اس خوف سے بھاگ رہے ہو کہ راہب تمہاری بیوی کو زبردستی پکڑ کر ناقہ میں لے جائیں گے تو میں اُس کی حفاظت کا ذمہ لینے کے لئے تیار ہوں۔“ شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ایک شادی شدہ عورت راہبہ نہیں بن سکتی۔“

عاصم نے جواب دیا ”جناب آپ کی پناہ میں رہتے ہوئے مجھے راہبوں کا خوف نہیں، لیکن آپ کو ہمیں یہاں ٹھہرانے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ اگر دمشق میں ہمارا جی نہ لگا تو ہم واپس آپ کے پاس آجائیں گے۔“

مرقس نے کہا ”بہت اچھا، ہم تمہیں مجبور نہیں کر سکتے۔ لیکن مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ قیصر سے تمہاری ملاقات نہیں ہو سکتی۔“

عاصم نے جواب دیا ”قیصر ان دنوں بہت مصروف ہے۔ وہ جنگ سے واپس آیا ہے اور میں اُسے بلاوجہ بے آرام نہیں کرنا چاہتا۔“

کلاڈیوس نے کہا ”تم نے یہ خبر سنی ہے کہ ایران کا نیا حکمران مرچکا ہے۔“

”نہیں، لیکن آپ کو یہ اطلاع کب ملی؟“

”مدائن سے قیصر کا ایلچی آج یہاں پہنچا اور اُس نے یہ خبر سنائی ہے کہ شیر ویدہ آٹھ ماہ سے زیادہ اپنی اور اپنے رشتہ داروں کی ملامت برداشت نہیں کر سکا، میں ایلچی سے مل کر آیا ہوں اور اُس کی باتوں سے میرا اندازہ ہے کہ تمہاری مدائی سے چند دن بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ اُس کے جانشین نے قیصر کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ میں روم کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھوں گا۔“

مرقس نے کہا ”جب ہم نے پرویز کو اُس کا کھویا ہوا تخت اور تاج واپس دلایا تھا تو یہ کون کہہ سکتا تھا کہ چند سال بعد اُس کی افواج ہمارے مشرقی مقبوضات کو آگ اور خون کا پیغام دینے کے بعد قسطنطنیہ کے دروازوں تک پہنچ جائیں گی۔ مجھے اب بھی اس بات کا یقین ہے کہ بحری زیادہ دیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ پند شکستیں ایران کی فوجی قوت کو تباہ نہیں کر سکیں، ہمیں ایران کی آخری حدود تک اُن کا،

باب

شادی سے پانچ دن بعد ایک شام عاصم اور قسطنطنیہ کچھ دیر باہر گھومنے کے بعد واپس آئے تو کلاڈیوس انطونیا، جولیا، مرقس اور ولیریس مکان کے ایک کشادہ کمرے میں بیٹھے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ قسطنطنیہ انطونیا اور جولیا کے درمیان بیٹھ گئی اور کلاڈیوس نے عاصم کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا ”میں اور ولیریس ابھی قبرستان سے ہو کر آئے ہیں۔ لیکن تم وہاں نہیں تھے۔“

عاصم نے جواب دیا ”میں قسطنطنیہ کی ماں کی قبر دیکھنے کے بعد دوسرے قبرستان میں فرس کی قبر پر، چلا گیا تھا۔“

انطونیا نے شکایت کے لہجے میں کہا ”اگر آپ آبا جان کی قبر پر جا رہے تھے۔ تو مجھے ساتھ کیوں نہ لے گئے؟“

عاصم نے جواب دیا ”میرا خیال تھا کہ میں کل وہاں جاؤں گا۔ لیکن گھر سے نکلنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ کل ہمیں سفر کی تیاری کرنی ہے، اس لئے شاید فرصت نہ ملے، چنانچہ قسطنطنیہ کی ماں کی قبر کی زیارت کے بعد ہم وہاں چلے گئے۔“

کلاڈیوس نے کہا ”آبا جان کو آپ کا اتنی جلدی دمشق جانا پسند نہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ آپ چند ہفتوں کے لئے رُک جائیں۔ ممکن ہے کہ مجھے قیصر کے ساتھ یروشلم جانا پڑے اور ہم یہاں سے اکتھے روانہ ہوں؟“

”نہیں ہم دمشق پہنچ کر آپ کا انتظار کریں گے، اس وقت آپ مجھے سفر کا ارادہ ملتوی کرنے پر مجبور

تعاقب کرنا چاہیے تھا۔“

عاصم نے کہا۔ میں اپنی قید کے باعث بہت سے حالات سے بے خبر رہا ہوں، تاہم سفر کے دوران میں مجھے راستے کی سستیوں اور شہروں سے جو حالات معلوم ہوئے ہیں، ان کے پیش نظر میں یہ نہیں کہوں گا، کہ ہر قتل نے چند اہم فتوحات کے بعد صلح کرنے میں کوئی غلطی کی ہے۔ مجھے یہ بات قدرت کا ایک معجزہ معلوم ہوتی ہے کہ ایرانی لشکر میں چھوٹے پڑ گئی تھی اور پرویز نے نینوا کی شکست کے بعد حوصلہ ہار دیا تھا۔ ورنہ اگر وہ بزدلی کا مظاہرہ نہ کرتا تو رومی لشکر کو دست گرد کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے قدم قدم پر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا۔ پھر مدائن میں اگر اُسے اپنی منتشر افواج جمع کرنے کے لئے چند ہفتوں کی ہہمت مل جاتی تو اُس کا جوابی حملہ یقیناً خطرناک ہوتا۔ لیکن مجھے اپنے بیٹے کے ہاتھوں اُس کا قتل ہو جانا قدرت کا ایک اور معجزہ نظر آتا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ قدرت کی ان دیکھی اور ان جانی قوتیں پرویز کے خلاف میدان میں اچھکی تھیں، اور اُس کی تباہی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔“

مرقس نے کہا۔ ”میں گلاڈیوس سے یہ سُن چکا ہوں کہ جب پرویز کا لشکر ایک سیلاب کی طرح مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا تو عرب میں نبوت کے کسی دعویدار نے رومیوں کی فتح کے متعلق پیش گوئی کی تھی اور یہ وہ دور تھا جب کہ ہم زیادہ سے زیادہ قسطنطنیہ کو بچانے کے متعلق سوچ سکتے تھے۔“

عاصم نے کہا۔ ”میں کئی لوگوں سے اس پیش گوئی کے متعلق سُن چکا ہوں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ عرب کی زمین جہاں کسی نیکی کے لئے کوئی جگہ نہیں، ایک نبی کے لئے کیسے سازگار ہو سکتی ہے۔“

مرقس نے کہا۔ ”میں کئی خدا رسیدہ لوگوں کی زبانی یہ سُن چکا ہوں کہ ایک نبی کے ظہور کا وقت اچکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی صحابی عرب میں پیدا ہوا ہے تو اُس کے اثرات صرف وہیں تک محدود نہیں رہیں گے۔ جب کوئی اُس کا پیغام لے کر ہمارے پاس آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ سردست ہمیں اُس کے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس شاندار فتح کے بعد ہم کتنا عرصہ امن اور سکون کی زندگی بسر کر سکیں گے۔“

عاصم نے جواب دیا۔ ”آپ بڑا نہ مائیں، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جب تک انسانوں کی تقدیر کسی قبیلہ یا کسی کسریٰ کے ہاتھ میں رہے گی، انہیں کوئی دیر پا امن نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس دنیا کی نجات ایک انسان پر دوسرے انسان کی خدائی میں نہیں بلکہ تمام انسانوں کی مساوات میں ہے۔ ورنہ آج کے ظالم کل کے مظلوم اور آج کے مظلوم کل کے ظالم بنتے رہیں گے۔ کل رومی مظلوم تھے، اور آج ایرانی اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے ہوں گے۔ کاش قبیلہ کی فتح ایک انسان کی بجائے کسی ایسے اصول کی فتح ہوتی، جو طاقتور اور کمزور دونوں اور اعلیٰ، رومی اور ایرانی، سب کے لئے یکساں قابل قبول ہو۔ اور سب انسان یہ کہہ سکتے کہ آج دنیا پر کسی شہنشاہ کا نہیں بلکہ ہمارا پرچم بلند ہو رہا ہے۔“

مرقس نے کہا۔ ”لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسے اصول کا جھنڈا بلند کرنے والوں کو تمام قبیلوں، تمام نسلوں اور تمام بادشاہوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور ان کے خلاف جو جنگ لڑی جائے گی، وہ اپنی شدت کے اعتبار سے روم اور ایران کی جنگوں سے کم نہیں ہوگی۔“

عاصم نے جواب دیا۔ ”یہ درست ہے لیکن اگر قدرت کو انسانیت کی جھلانی مقصود ہے تو وہ دنیا بھر کی مخالفت کے باوجود اس اصول کا جھنڈا اٹھانے والوں کے لئے فتح اور نصرت کے دروازے کھول دے گی۔ پھر جس زمین پر ان کا خون گرے گا، اُس کے سینے سے عدل و مساوات کے چٹھے پھوٹیں گے۔ یہ لوگ نسلوں اور قوموں کے درمیان منافرت کی دیواریں مسمار کر دیں گے اور جب قوموں اور نسلوں کے درمیان انحراف کے رشتے استوار ہوں گے تو ایسی تمام جنگوں کے امکانات ختم ہو جائیں گے، جو ایک انسان دوسرے انسان، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ یا ایک قوم دوسری قوم پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے لڑتی ہے۔“

میں یہ مانتا ہوں کہ قبیلوں کے سردار، اور قوموں کے حکمران جنہیں صرف انسانوں کی تفریق میں اپنی جھلانی نظر آتی ہے، پوری قوت کے ساتھ اس اصول کی مخالفت کریں گے۔ ایران میں کسریٰ، روم میں قیصر اور باقی دنیا میں ہر چھوٹا اور بڑا حکمران اس اصول کے علم برداروں کو اپنا بدترین دشمن خیال کرے گا لیکن اس کے لئے قربانیاں دینا ان لوگوں کا سب سے بڑا فرض ہوگا جو اپنی آئندہ نسلوں کے لئے امن اور آزادی کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔“

مرقس نے کہا۔ ”تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ آج دنیا جس نجات دہندہ کی متلاشی اور منتظر ہے وہ بیک

وقت مشرق و مغرب کے تمام حکمرانوں کے خلاف اعلان جنگ کرے گا۔“

”ہاں! میرے نزدیک اس دنیا کی سب سے بڑی عقیدت یہی ہے۔“

مرقس نے کہا: ”تم کسی اور دنیا کی باتیں کر رہے ہو۔ تاہم مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اگر خدا کا کوئی بندہ قبیلوں، نسلوں اور قوموں کے جھگڑے مٹا سکتا ہو، تو میں اس بڑھاپے میں بھی اُس کے جھنڈے تلے جان دینا اپنے لئے باعث سعادت سمجھوں گا۔ میں اور مجھ سے پہلے میرے باپ دادا صرف قیصر کی فتح کے لئے جان دینا جانتے تھے، لیکن انسانیت کی فتح کے لئے اگر کوئی دنیا کے سارے بادشاہوں کے تاج نوج لے تو بھی مجھے اس بات کا ملال نہیں ہوگا۔ لیکن سچ کہو، تمہیں واقعی کسی نجات دہندہ کا انتظار ہے؟“

عاصم نے جواب دیا: ”میں اُن کروڑوں انسانوں میں سے ایک ہوں جنہیں ماضی کی تاریکیوں سے نکلنے کے لئے کسی روشنی کی ضرورت ہے۔ کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ وہ روشنی کب اور کہاں نمودار ہوگی۔ مجھے ایک نجات دہندہ کا انتظار ہے لیکن کاش میں اس یقین کے ساتھ اُس کا انتظار کر سکتا کہ وہ ضرور آئے گا۔“

مرقس نے کہا: ”مجھے افسوس ہے کہ یہاں کوئی خدا کا بندہ تمہاری تسلیوں کا سامان فراہم نہیں کر سکا لیکن ممکن ہے کہ دمشق پہنچ کر تمہیں کوئی روشنی دکھانے والا مل جائے۔“

تیسرے دن عاصم اور فلسطینہ جہاز پر کھڑے تھے، اور بندرگاہ پر مرقس، کلاڈیوس، دلیرس، انطونیا اور جولیا، سائمن اور شہر کے چند اور معززین ہاتھ کے اشاروں سے انہیں الوداع کہہ رہے تھے۔ جب بندرگاہ اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو فلسطینہ نے عاصم کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”عاصم! کیا یہ ممکن ہے کہ تم کسی دن دمشق سے یروشلم جاؤ۔ میں ایک بار پھر وہ راستہ دیکھنا چاہتی ہوں، جس پر میں نے بچپن میں تمہارے ساتھ سفر کیا تھا۔“

”یہ ممکن ہے، لیکن کاش ہم ماضی کے گزرے ہوئے ایام واپس لا سکتے۔“

ہرتل فاتحانہ جاہ و جلال کے ساتھ قسطنطنیہ سے روانہ ہوا۔ اُس کی رعایا اپنے حکمران کے علاوہ اُس صلیب کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھی، جسے پرویز یروشلم کی فتح کے بعد اپنے ساتھ لے گیا تھا، اور جسے دوبارہ یروشلم واپس لانا عیسائیوں کے نزدیک ہرتل کی سب سے بڑی نیکی تھی۔ شام کے ساحل تک بحری سفر کے دوران جن بندرگاہوں پر ہرتل کا سفینہ رکتا تھا، وہاں لوگوں کا میلہ لگ جاتا تھا۔ اور وہ جو چند برس قبل اُسے بزدلی اور بے حسی کے طعنے دیا کرتے تھے، اُس کے ہاتھوں کو بوسہ دینا یا دوڑا نو ہونے کی قبا کو چھو لینا بھی اپنے لئے باعث سعادت خیال کرتے تھے۔ جب مقدس صلیب لوگوں کے سامنے لائی جاتی تھی تو وہ عقیدت و محبت کے جذبات سے مغلوب ہو کر دیوانہ وار اُس پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ہر شخص اُسے بوسہ دینے میں دوسروں سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا، پھر جب قیصر اگلے منزل کا رخ کرتا تھا تو وہ مقامات جہاں ٹھوڑی دیر کے لئے اس صلیب کی نمائش کی جاتی تھی، عقیدتمندوں کی نگاہوں کا مرکز بن جاتے تھے۔

ہرتل نے بحری سفر ختم کرنے کے بعد خشکی کا راستہ اختیار کیا تو یروشلم تک لاکھوں انسان اُس کے لئے چشمہ براہ تھے۔ اور ہر منزل پر اُس کے جلوس میں شامل ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ وہ حکمران تھا، جس نے انتہائی مایوس کن حالات میں اپنی رعایا کو سہارا دیا تھا اور آج یہ رعایا لشکر کے آسروں سے اپنے عمن کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ صلیب کو اپنی پرانی جگہ نصب کرنے، کلیسا کے اکابر سے دعائیں لینے اور عوام سے عقیدت اور محبت کے نذرانے وصول کرنے کے بعد ہرتل نے جشن عام کا حکم دیا۔

شہر سے باہر اُس کے نیچے اُسی ٹیلے پر نصب تھے، جہاں چند برس قبل خسرو پرویز پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اور عین اُس وقت جبکہ اُس کا یہ احساس اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا کہ آج اس آسمان کے نیچے مجھ سے بڑا فاتح اور مجھ سے زیادہ طاقتور اور کوئی نہیں۔ اُسے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک پیش کیا گیا۔ جس کا مصنون یہ تھا:۔

”بڑھ رہی ہے“

”تمہیں ان لوگوں کی نسبت کبھی جھوٹ کا تجربہ ہوا ہے؟“

”نہیں“

”مدعی نبوت نے کبھی اپنے عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کی ہے؟“

”ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا۔ لیکن اب ہمارے درمیان جو صلح کا معاہدہ ہوا ہے اُس کے متعلق ابھی

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کہاں تک اُس کی پابندی کرے گا“

”تم نے کبھی اُس کے ساتھ جنگ بھی کی ہے؟“

”ہاں“

”پھر اُس کا کیا نتیجہ رہا؟“

”کبھی تم غالب آئے اور کبھی وہ“

”وہ کیا سکھاتا ہے؟“

”وہ یہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو اور کسی کو اُس کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار

کرو، سچ بولو اور صلۂ زحم کرو۔“

ہرقل کچھ دیر سر جھکا کر سوچتا رہا، بالآخر اُس نے کہا ”تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ وہ شریف النسب ہے

پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ تم یہ کہتے ہو کہ اس خاندان سے کبھی کسی اور نے نبوت کا دعویٰ

نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ یہ خاندانی اثرات کا نتیجہ ہے۔ تم یہ مانتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ

نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ اُسے بھی بادشاہت کی خواہش ہے۔ تم یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ اُس نے کبھی

جھوٹ نہیں بولا۔ اب جو شخص انسانوں سے جھوٹ نہیں بولتا، وہ خدا پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم

کہتے ہو کہ اُس کے پیروکار اور غریب ہیں اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب لوگ

ہی ہوتے ہیں۔ تم نے ہمیں بتا دیا ہے کہ اُسے ماننے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور ہمارے نزدیک یہ

بھی اُس کے دین کی سچائی کی علامت ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اُس نے کبھی فریب نہیں کیا۔ پیغمبر تقیاً کبھی فریب

نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز، تقویٰ اور عفو کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میری قیام گاہ تک

اُس کا قبضہ ہو جائے گا۔ مجھے اس بات کا احساس ضرور تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ

وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ اگر میں وہاں پہنچ سکتا تو اس کے پاؤں دھوؤں۔“

سلطنت کے اکابر، اور کلیسا کے پیستروں کی موجودگی میں یہ الفاظ اُس شخص کی زبان سے نکلے تھے،

جنہیں وہ دین مسیح کا سب سے بڑا حامی و ناصر سمجھے تھے۔ پھر انہوں نے ایک ایسے عرب کی زبانی اُس کی

تقریب سنی تھی جو اب تک اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا۔ اُن کے سینوں میں غصے کی آگ سلگ رہی تھی لیکن

قیصر کے احترام کے باعث اُن کی زبانیں لنگ ہو چکی تھیں۔ لیکن جب ہرقل کے حکم سے بھرے دربار میں یہ خط

پڑھ کر سنایا گیا تو اُن کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ خاموش نگاہوں کا احتجاج زبانوں پر اگیا اور پادریوں اور

راہبوں کی دبی ہوئی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ روم کے شہنشاہ نے ہدایت کے جس نور کو اپنے سینے میں جگہ

دینے کی جسارت کی تھی، اُس کے راستے میں دنیاوی جاہ و حشمت اور تخت و تاج کی محبت کے پردے حائل

ہو گئے۔ وہ ماتھے پر اچانک حسین پھولوں کی طرف بڑھے تھے، کانٹوں کے خوف سے پیچھے ہٹ گئے، اور

وہ ہمت جو کبھی ہرقل کو یابوسی کے دلدل سے نکال کر نینزا اور دست گرد کے میدانوں کی طرف لے گئی تھی،

اچانک جواب دے گئی۔ ہرقل نے اپنی رعایا کا اضطراب دور کرنے کے لئے عربوں کو دربار سے نکل جانے

کا حکم دیا۔ اور کلیسا کی عظمت اور تقدیس کے محافظ اُسے مبارک باد دینے لگے۔ وہ خوش تھے وہ اس بات

پر خوش تھے کہ انہوں نے ایک پیاسے مسافر کو ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشتے کی طرف بھاگنے سے روک لیا ہے

لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ عرب کے صحرا سے جو پیغمبر پھوٹا ہے اُس سے کئی دریا اور کئی ندیاں نکلیں گی اور ان

دریاؤں اور ندیوں کے سیلاب کی لہریں ایک طرف عیسائیت اور دوسری طرف مجوسیت کے سارے بند

توڑ ڈالیں گی۔ وہ قیصر کو ماتھے پھیلانے سے منع کر سکتے ہیں لیکن رحمت کی اُس گھٹاکو برسنے سے روک نہیں

سکتے جس کے بادل عرب کے آسمان پر جمع ہو رہے تھے۔

کہ وہ دنیا سے منہ موڑ کر ایک راہبر کی زندگی اختیار کر لیتی۔ لیکن عاصم نے اُسے لرزتے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زندگی کا دامن پکڑنے پر مجبور کر دیا۔ تاہم اس کی مسرت کا کوئی لمحہ بھی اس قسم کے خدشات سے خالی نہ تھا۔ خدا کی ناراضگی اسے کسی وقت بھی نہ آلام و مصائب میں مبتلا کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ رورو کر اپنے شوہر اور کسین بچے کی سلامتی کے لیے دعائیں کیا کرتی تھی۔ وہ گرجوں اور خانقاہوں میں جاتی اور ان خدا رسیدہ بزرگوں کو خوش کرنے کے لیے بڑے بڑے نذرانے پیش کرتی جن کے متعلق یہ مشہور تھا کہ ان کی دعائیں آنے والی مصیبتیں ٹال سکتی ہیں۔

وہ عاصم کو بھی عیسائیت پر ایمان لانے کی ترغیب دیا کرتی تھی۔ اور وہ اسے خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی اس کے ساتھ گرجوں اور خانقاہوں میں بھی چلا جاتا تھا۔ تاہم عیسائیت کے متعلق اس کے جذبات بہت سرد تھے۔ اور یہ سرد مہری یا بے توجہی کسی ضد یا ہٹ دھرمی کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ اس کی وجہ اس کی حقیقت کا اعتراف تھا کہ عرب کی اصنام پرستی اور ایران کی مجوسیت کی طرح اسے کلیسا کا دامن بھی اس روشنی سے خالی نظر آتا تھا جو انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلوں کو سلامتی کی راہ دکھا سکتی رہ ایک ایسے دین کا تمنی تھا جو قوموں اور نسلوں کو عدل و انصاف اور امن کا راستہ دکھاسکے۔ لیکن ایسے دین کا کوئی واضح تصور اس کی عقل اور سمجھ سے بالاتر تھا۔ اور پھر وہ دنیا سے اس نے اپنی لگا ہوں سے دیکھا تھا ایسے اسباب سے بھی خالی نظر آتی تھی جو توہمات، جہالت اور تعصب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں پر ایسے دین کے نفاذ کے لیے ضروری تھے۔ کبھی دمشق کے بازاروں میں عرب کے کسی قبیلے کے تاجر مل جاتے تو وہ انہیں اپنے گھر لے جاتا۔ ان کی قواضع کرنے کے بعد اپنے وطن کے حالات پوچھتا۔ اور جب وہ یہ سنتا کہ چند بے سرو سامان انسانوں کا جو قافلہ مکہ سے کل کر تیرب پہنچا تھا، ان کے عزم و استقلال نے پورے عرب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ تو اسے حیرت ہوئی۔ بدر کے میدان میں مٹھی بھر مسلمانوں کے ہاتھوں قریش مکہ کی شکست اُسے ناقابل یقین محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب فرزند ان توجید کی مزید فتوحات کی خبریں آنے لگیں تو اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ عرب میں واقعی کوئی غیر متوقع انقلاب آچکا ہے۔ اسلام کی تعلیم کے متعلق سنی سنائی باتوں سے اُسے ایک تسکین

باب ۴۲

دمشق میں عاصم کی حالت اس مسافر کی سی تھی جو بدقول وحشت ناک صحراؤں میں بھٹکنے کے بعد ایک نخلستان کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کر رہا ہو۔ فلسطینہ دمشق کے حاکم کو شاہی فرمان دکھانے کے بعد اپنے نانا کی جائیداد حاصل کر چکی تھی۔ پھر اس کے پاس یوں بھی دولت کی کمی نہ تھی۔ چند بیش قیمت ہیرے ان کی عمر بھر کی ضروریات کے لیے کافی تھے۔ عاصم ہمداد کے عطا کردہ سونے سے تجارت شروع کرنا چاہتا تھا۔ لیکن فلسطینہ کو اپنے شوہر سے ایک لمحہ کی جدائی بھی ناگوار محسوس ہوتی تھی چنانچہ عاصم شہر سے باہر ایک باغ اور چند کھیت خرید کر مطمئن ہو گیا۔

شادی سے اگلے سال ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اور والدین نے اس کے لیے یولین کا نام پسند کیا۔ عاصم کے دل میں غریب الوطنی کا احساس تندرست ختم ہو رہا تھا اور ماضی کے آلام و مصائب اب اسے ایک خواب محسوس ہونے لگے۔ دمشق کے حکام اور رؤسا سے ایک ایسی قابل عزت خاتون کے شوہر کی حیثیت سے جانتے تھے جس کا باپ ایران کی فرج کا ایک جرنیل اور کسرے کا دوست ہونے کے باوجود روم کو کھلی تباہی سے بچانے کے لیے اپنی جان دے چکا تھا۔ اور اس نسبت سے دمشق کے انتہائی متعصب پادری اور راہب بھی اگر دل سے نہیں تو ظاہری طور پر اس کی عزت ضرور کرتے تھے۔ مذہب کے متعلق شوہر اور بیوی کے جذبات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ فلسطینہ کو بڑی شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ ایران کے ایک نامور جرنیل کی حیثیت سے اس کے باپ نے جو فتوحات حاصل کی تھیں وہ خدا کو پسند نہ تھیں۔ اور ان پر خوش ہونا باختر کرنا ایک گناہ تھا۔ اور اس کے لیے بہترین کفارہ بھی ہو سکتا تھا

محسوس ہوتی تھی۔ تاہم وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ غلاموں اور شہنشاہوں کی دنیا کی کاپیٹل کرنے کے لیے جس عظیم قوت کی ضرورت ہے وہ عرب سے نمودار ہو سکتی ہے۔

کلاڈیوس جو ہرقل کی محافظ فوج کے ساتھ یروشلم پہنچا تھا۔ واپس جانے کی بجائے وہاں کے رومی لشکر کی کمان سنبھال چکا تھا۔ اور چند ماہ بعد انطونیا بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔

سرد کے آس پاس عسائی روڈسا اپنے رومی سرپرستوں کو عرب کے حالات سے باخبر رکھتے تھے چنانچہ یروشلم سے کلاڈیوس ماصم کے نام جو خطوط بھیجا کرتا تھا، وہ اس ناقابل یقین انقلاب کی تصدیق کرتے تھے جو عرب کے اندر رونما ہو رہا تھا۔ عرب میں توحید کے پرستاروں اور عدل و انصاف کا جھنڈا بلند کرنے والوں کے آلام و مصائب ماصم کے نزدیک خلاف توقع نہ تھے۔ وہ پیغمبر اسلام اذان کے جان نثاروں کی ہجرت کے اسباب سمجھ سکتا تھا۔ لیکن اسلام کے جھنڈے تلے اوس اور خمرج اور یثرب کے دوسرے خاندانوں کا متحد ہو جانا اور پھر بے سرو سامان انسانوں کی ایک قلیل تعداد کا اہل مکہ کو شکست دینا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

عرب تاجروں کی زبانی بدر، احد اور خندق کی جنگوں کے واقعات سنتے کے بعد وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اہل مکہ اس وقت تک چین سے بیٹھ بیٹھیں گے جب تک کہ یثرب کی وادی کا ایک ایک گھراکھ کا ابناء رہیں بن جاتا۔ حدیبیہ کی صلح اور اس کے ساتھ ہی مشرق و مغرب کے تاجداروں کے نام غیر اسلام کے خطوط کی حیثیت اس کے نزدیک ایک مذاق سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن عرب تاجروں کی باتوں اور کلاڈیوس کے خطوط سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ معاملہ اب مذاق کی حد سے آگے گزر چکا ہے

○

یروشلم کی پیدائش کے چوتھے سال جب ماصم نے یہ خبر سنی کہ مسلمانوں نے بلقا کے عسائی رئیس سے اپنے بیٹی کے ایک اہلی کی قتل کا قصاص لینے کے لیے موتہ پر حملہ کر دیا ہے تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ پھر چند ماہ بعد اُسے کلاڈیوس کی طرف سے ایک طویل خط ملاحظہ کا مضمون یہ تھا:

”میرے دوست! گذشتہ چند ماہ سے میری مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ میں تمہیں خط نہ لکھ سکا۔ میں سردی جو کیوں کے معائنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اور وہاں کچھ ایسے حالات پیدا ہو رہے تھے کہ مجھے ہفتوں کی بجائے مہینوں، یروشلم سے باہر رہنا پڑا۔ تم موتہ پر مسلمانوں کی غیر متوقع پیش قدمی کے واقعات سن چکے ہو گے غالباً یہ تاریخ کا پہلا واقعہ ہے کہ صحرائے عرب کے تین ہزار بے سچو سامان آدمی ایک اہلی کا قصاص لینے کے لیے دنیا کی عظیم ترین سلطنت سے الجھنے کی جرأت کرتے ہیں۔ بلقا کا عسائی رئیس ہمارا باجگزار ہے۔ اور مسلمانوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی کہ اس کے علاقے پر حملہ رومی سلطنت کے خلاف اعلان جنگ تصور کیا جائے گا۔ عسائی قبائل کے پاس ایک لاکھ کے لگ بھگ تربیت یافتہ جنگجو موجود تھے اور پھر ہماری افواج جو پورے شام میں پھیلی ہوئی ہیں ان کی پشت پر تھیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود، یہ لوگ مرعوب نہیں ہوئے۔

ایک لشکر کسی فتح کی امید پر چڑھائی کرتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے طرز عمل سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ فتح اور شکست سے بے نیاز ہو کر میدان میں آتے ہیں۔ ان کی شکست یقینی تھی۔ لیکن میں اس جنگ میں حصہ لینے والے جن لوگوں سے ملا ہوں۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے جرأت اور شجاعت کا اس سے بڑا مظاہرہ نہیں دیکھا عسائی صرف اس بات پر فخر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پیچھے ہٹنے سے پہلے وہ عسائی لشکر کو اس قدر مرعوب کر چکے تھے کہ کسی کو ان کا تعاقب کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ مجھے تین ہزار مسلمانوں کے مقابلے میں ایک لاکھ آدمیوں کی اس کامیابی کو فتح کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ صرف ابتدا تھی۔ اب میں سنن کبھی میدانوں میں عرب قبائل کی اجتماعی قوت کو شکست دے چکے ہیں۔ انہوں نے مکہ جسے عرب کامرکز خیال کیا جاتا ہے فتح کر لیا ہے۔ انہوں نے

قبائل کے درمیان منافرت کی آہنی دیواریں توڑ دی ہیں۔ تم کہا کرتے تھے کہ ایک عرب اپنے قبیلے کے خلاف تلوار نہیں اٹھاتا لیکن میں عرب کے کئی تاجروں سے مل چکا ہوں۔ اور وہ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے دین کے دشمنوں کے خلاف لڑتے وقت اپنے خون کے رشتوں سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ تم کہتے تھے کہ مقتول کا انتقام لینا عرب کے باشندوں کا جہودِ ایمان ہے۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ کل تک جو قبائل مسلمانوں کے خون کے پایسے تھے وہ آج اپنی شمشیں بھول کر ان کے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔ میرے دوست عرب میں کوئی ایسا انقلاب آچکا ہے جو میری، تمہاری اور شاید دنیا کے تمام انسانوں کی سمجھ بے بالائے تم کہا کرتے تھے کہ اس وقت عرب میں یہودیوں سے زیادہ منظم اور متحد اور کوئی طاقت نہیں۔ اور ان کا سب سے بڑا مرکز خیبر ہے۔ لیکن میں ان یہودیوں سے مل چکا ہوں جو خیبر میں شکست کھانے کے بعد شام کی حدود میں پناہ لے چکے ہیں۔ اور انہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ عرب میں ایک دین کے ساتھ ایک عظیم فوجی قوت کا ظہور ہو رہا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے پیروجب انگلیوں پر گئے جا سکتے تھے تو بھی وہ عرب کے اندر اور عرب سے باہر کسی طاقت سے مرعوب نہیں تھے اور جب انہیں مٹانے کے لیے عرب قبائل متحد اور منظم ہو رہے تھے تو ان کے ہادی کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ وہ مشرق و مغرب کے حکمرانوں کو ایک ایسا دین قبول کرنے کی دعوت دے رہا تھا جس کی تعلیم اس دین سے بندہ و آقا کا امتیاز ٹھانا چاہتی ہے۔ یہ بنیادیں جو دنیا کے تمام قبیلوں اور نسلوں کے درمیان اخوت اور مساوات کے رشتے قائم کرنا چاہتا ہے۔ صرف عرب کی قبائلی عصبیتوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ ہر اس معاشرے کے خلاف ایک اعلانِ جنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو طاقت و زور کو زور و امیر کو عزیز اور اعلیٰ کو ادنیٰ پر اتھانی کا حق دیتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ آج اگر ہمارا قبضہ بھی یہ اعلان

کہوے کہ ایک رومی، ایک نشامی یا مصری پر برتری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یا خدا کے سامنے میرا اور میری رعایا کے ہر فرد کا درجہ برابر ہے۔ تو سلطنت کے امراء اور کلیسا کے پیشوا کیساں جوش و خروش کے ساتھ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور میرے خیال میں اس دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں کسی حکومت کے ابوالوں یا کسی مذہب کی عبادت گاہوں میں انسانی مساوات کے لیے جگہ ہو۔ میں محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے دین کو پوری دنیا کے خلاف اعلانِ جنگ سمجھتا ہوں اور میرے دل میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عرب کی سرزمین کسی ایسی عظیم قوت کو جنم دے سکے گی جو اس عظیم جنگ سے عمدہ برآ ہو سکے؟ تم عرب کے مستقبل سے یاس ہو کر نکلے تھے اور میں بھی اس بے آب و گیاہ زمین کے مستقبل کے ساتھ کوئی بلند توقعات وابستہ نہیں کر سکتا۔ لیکن تم حیران ہو گے کہ جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے ہیں، میں ان کے بدترین دشمنوں سے مل چکا ہوں اور وہ سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ دنیا کی کوئی مصیبت یا آرزائش اپنے ہادی کی صداقت پر ان کا یقین متزلزل نہیں کر سکتی پچھلے دنوں ایک تاجر سے جو مکہ اور مدینہ کے رستے پر وٹلم پہنچا تھا، میری ملاقات ہوئی تھی۔ اور وہ یہ کہتا تھا کہ اگر یہ لوگ آسمان کے تارے نوح لیں تو بھی مجھے تعجب نہیں ہوگا۔

— اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس دنیا کو اخوت اور مساوات کا درس دینا آسمان کے تارے نوح سے آسان نہیں۔

عاصم بن حیران ہو گے کہ موتہ کی جنگ کے بعد ہم کافی سنجیدگی کے ساتھ اپنی مشرقی سرحدوں کی طرف مسلمانوں کی پیش قدمی کا خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ میں قریباً چار میلے مغربی روم کے قلعوں اور چوکیوں کا معائنہ کرنے کے بعد روم واپس آیا ہوں۔ وہاں یہودیوں نے اس قسم کی افواہیں پھیلا رکھی ہیں کہ مسلمان حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے یہ بات ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے۔ موتہ کی جنگ کے بعد

انہیں ہماری قوت کا تصور ابست اندازہ ضرور ہو گیا ہو گا۔ اور اس کے بعد اگر انہوں نے شام کا رخ کرنے کی جسارت کی تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہم ان بیگ زاروں تک ان کا تعاقب کرنے پر مجبور ہو جائیں گے جہاں بول کے کانٹوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش میں اس نبی کو قریب سے دیکھ سکتا۔

قیصر کو اس نئے دین کے حامیوں کے ساتھ الجھنا پسند نہیں لیکن سلطنت اور کلیسا کے اکابر یہ خدشہ محسوس کرتے ہیں کہ جو قوت عرب قبائل کے اندر اتحاد اور مرکزیت پیدا کر سکتی ہے وہ آگے چل کر عرب کے ہمسایہ ممالک پر رومیوں کے اقتدار کے لیے خطرناک ثابت ہوگی۔ شام، ایشیائے کوچک اور مصر کے ممالک میں ہم پر اس تحریک کی مخالفت کریں گے جو وہاں کے عوام میں رومی حکومت کے خلاف بغاوت کے جذبات بیدار کر سکتی ہو۔ اور اس مقصد کے لیے اگر ہمیں عرب پر چڑھانی کرنی پڑی تو جی ہم اس سے دریغ نہیں کریں گے۔ روم اور ایران کی جنگ کی ہولناکیاں مجھے کسی نئی جنگ سے متنفر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن امن کا طلب گار ہونے کے باوجود میں ایک سپاہی ہوں اور اس دنیا میں اسباب و نتائج کے متعلق صرف ایک سپاہی کے ذہن سے سوچ سکتا ہوں۔ اور عرب کے نبی کے متعلق سنی سنی باتوں سے متاثر ہونے کے باوجود مجھے وہ اسباب نظر نہیں آتے جو رومی سلطنت کی عظیم قوت کے ساتھ متصادم ہونے کے بعد اس کے ماننے والوں کے لیے ایک عبرتناک شکست یا مکمل تباہی کے سوا کوئی اور نتیجہ پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر اس دین کے علمبرداروں کی نگاہیں صرف عرب پر مرکوز رہیں تو ممکن تھا کہ وہ کسی دن جمالت کی ذلزل سے نکل کر ایک منہدم قوم بن جاتے۔ لیکن انہوں نے ابتدا میں ہی مشرق و مغرب کے حکمرانوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ امن اور عدل آج انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور یہ ضرورت انسانوں کے درمیان اخوت اور مساوات

کے رشتے قائم کیے بغیر پوری نہیں ہو سکتی لیکن روم و ایران کے شہنشاہوں اور دوسرے چھوٹے اور بڑے حکمرانوں کو ایسے امن کی ضرورت نہیں جس کی اولین شرط آقا اور غلام کا امتیاز مٹانا ہے۔

ان دلوں میرے دل میں بار بار صرف ایک ہی سوال آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کونسی طاقت ہے جس کے بل بوتے پر عرب کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایران اور روم کے فرمانرواؤں کو اپنے دین کی دعوت دینے کی جسارت کی ہے؟ اور وہ کونسی قوت ہے جس کی بدولت اس کے پیرو کسی کامیابی یا فتح کی امید رکھتے ہیں؟ اور میں جس قدر سوچتا ہوں اسی قدر مجھے الجھن محسوس ہوتی ہے اور میری الجھن کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں یہ دشلم میں کئی ایسے خدار سیدہ آدمیوں سے بل چکا ہوں جو فرس کی طرح کسی نبی کے منتظر ہیں۔

میں اب تک عرب کے کئی تاجروں سے اس نبی کے متعلق پوچھ چکا ہوں اور ان میں سے چند ایسے بھی تھے جو مکہ کے رہنے والے تھے۔ اور وہ سب اس بات کی تصدیق کرتے تھے کہ جب ایرانیوں کی فوجات کا سیلاب پھر روم کے کناروں تک پہنچ چکا تھا اور ہمارے دوبارہ اٹھنے اور سنہلنے کی تمام امیدیں معدوم ہو چکی تھیں۔ تو اس نبی نے پورے دھوکے کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ یہ جنگ بالآخر رومیوں کی فتح پر ختم ہوگی۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ خدا نے اپنے کسی بندے کو آنے والے حالات سے آگاہ کر دیا ہو اور میں یہ بھی تسلیم کر سکتا ہوں کہ عربوں کی کامیابی کے لیے قدرت کی ان دیکھی اور ان جانی قوتیں اس نبی کی رہنمائی کر رہی ہیں لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ قدرت کا کوئی معجزہ ان صحرا نشینوں کو ہمارے مقابلے میں کھڑا کر سکتا ہے۔ ہم گئی گزری حالت میں بھی ایرانیوں کے بعد دنیا کی دوسری عظیم قوت تھے اور اپنی بدترین شکستوں کے دور میں بھی یہ امید ہمارا آخری سہارا

حتیٰ کہ شاید حالات بدل جائیں۔ اور ہمارا یایوس اور بددل حکمران کسی دن اپنے زخمی ہاتھوں سے اپنے گسے ہوئے پرچم کو اٹھالے۔ لیکن عرب اور روم کی طاقت میں اتنا فرق ہے کہ اگر روئے زمین کے تمام خدراں سیدہ لوگ یک زبان ہو کر یہ پیش گوئی کریں کہ ہماری سلطنت کو اہل عرب سے کوئی بڑا خطرہ پیش آسکتا ہے تو بھی مجھے یقین نہیں آئے گا۔ اور مسلمانوں کے نبی کے حوا تم یہ ہیں کہ اس نے قیصر کے علاوہ کئی اور حکمرانوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے اور اُسے ماننے والوں کو اس بات کا یقین ہے کہ دنیا کی کوئی سلطنت ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

عاصم! مجھے یقین ہے کہ جس سیلاب کی لہر موت تک پہنچ گئی تھی وہ دوبارہ شام کی سرحدوں کا رخ نہیں کرے گا۔ تاہم کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کا یہ دور ناقابل یقین واقعات کا دور ہے۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر تمہاری طرح ایک عرب ہوتا تو موت سے پہلے اس نبی کو دیکھنے کی کوشش ضرور کرتا جس کی تعلیم دنیا کے تمام حکمرانوں کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہے اور جسے ماننے والے مٹھی بھر انسان اپنی فتح پر یقین رکھتے ہیں اور پھر اگر مجھے اس میں کوئی صداقت نظر آتی تو میں واپس آکر اپنے رومی دوستوں کے سامنے یہ اعلان کرتا کہ اس نے میری نگاہوں سے مستقبل کے سارے پردے اٹھا دیئے ہیں۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ مغرب اور مشرق کے انسانوں کو صرف اسی کے دامن رحمت میں پناہ مل سکتی ہے اور جب اس کا قافلہ عرب کی حدود سے باہر نکلے گا تو تمہاری تلواریں اس کا راستہ نہیں روک سکیں گی۔

میرے دوست! قیصر کا ایک جان نثار ہونے، اور صبح وشام باذنی سلطنت کی سلامتی کی دعائیں مانگنے کے باوجود کبھی کبھی مجھے اپنے دل میں یہ غلش محسوس ہوتی ہے کہ اگر وہ سچا ہے، اگر یہ وہی ہے جس کا اس دنیا کو انتظار ہے تو

صغیر لکری

کیا میں اپنے ضمیر کو ہلاک کیے بغیر اس کے خلاف تلوار اٹھا سکوں گا؟ یہاں میری عقل جواب دے جاتی ہے اور پھر میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی پینے کی کوشش کرتا ہوں کہ کلاڈیوس تم ایک رومی ہو۔ تم قیصر کے سپاہی ہو اور تمہارا کام صرف بازنطینی سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت ہے اور پھر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دماغ کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے۔ اگر تم میرے پاس ہوتے تو شاید میں اس امید پر تمہیں یثرب کا سفر کرنے پر مجبور کرتا کہ تم واپس آکر مجھے ان لوگوں کے صحیح حالات بتا سکو گے کہ جہی کے متعلق سوچتے ہوئے مجھے اضطراب، الجھن اور پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بروشلیم کی طرح دمشق میں بھی عرب تاجراتے ہوں گے۔ کیا ان کی باتیں سن کر تمہارے دل میں کسی دن وہاں جانے کا خیال پیدا نہیں ہوتا؟ اور میں یہ سوال اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اگر ہیں کسی دن عرب کے حالات کے متعلق پوری واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس مقصد کے لیے میرے نزدیک تم سے زیادہ قابل اعتماد اور کوئی نہیں ہوگا۔

تمہارا دوست

کلاڈیوس



فسطینہ سے کلاڈیوس کے خط کا مضمون سننے کے بعد عاصم کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اچانک یونس بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے عاصم کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن جب عاصم نے اس کی طرف توجہ نہ دی تو وہ پریشان سا ہو کر ماں کی طرف بڑھا۔ اور اس کی گود میں بیٹھ گیا۔

فسطینہ نے غموم لہجے میں سوال کیا۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟

”کچھ نہیں۔“ عاصم نے بے توجہی سے جواب دیا۔

فسطیہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کروں گی۔“

عاصم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کون سا راستہ؟“

فسطیہ نے جواب دیا۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ اپنا وطن دیکھنا چاہیں۔ اور مجھے اس بات کا اطمینان ہو کہ آپ کو وہاں جانے میں کوئی مضطرہ نہیں تو میں چند دنوں یا چند ہفتوں کی جدائی برداشت کر سکوں گی۔“

”اس دنیا میں تمہارے گھر کے سوا میرا کوئی وطن نہیں“ عاصم نے یہ کہہ کر یونس کی طرف ہاتھ پھیلا دیے اور وہ مال کی گود سے اتر کر اس کی گود میں آ بیٹھا اور فسطیہ کے معنوم سر پر ہنسنا شروع کیا۔

عاصم نے کہا۔ ”فسطیہ! اب میں تمہاری مسکراہٹوں اور یونس کے ہنسنے سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ لیکن کاش خدا کا کوئی بندہ بادشاہوں اور غلاموں کی اس دنیا میں مجھے تمہارے لیے دائمی راجتیں

اور مسرتیں حاصل کرنے کا طریقہ سمجھا سکتا۔ کاش میں تمہارے لیے کوئی ایسا نخلستان تلاش کر سکتا جس کی بہاروں کو خزاں کا خوف نہ ہو۔ مجھے عجب سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن اگر مجھے اس بات کا یقین ہو

جائے کہ اس نئے دین کی فتح کے انعامات پوری انسانیت کے لیے یکساں ہوں گے اور جس روشنی میں اوس اور خزر ج سلامتی کا راستہ دیکھ چکے ہیں وہ کسی دن یہاں بھی پہنچ سکتی ہے۔ اور یہ گھر، یہ شہر

اور یہ ملک زمانے کی ان آندھیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے جس کی ہولناکیوں سے ہمارا ماضی لبریز ہے تو میں سمجھوں گا کہ اس نبی کی اطاعت اور اس کے دین کی اعانت میری زندگی کا پہلا اور آخری فرض ہے۔

اور پھر اگر میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا تو میرے لیے تمہیں بھی یہ اطمینان دلانا مشکل نہیں ہوگا کہ میں ایک انسان، ایک شوہر اور ایک باپ کا فرض پورا کر رہا ہوں۔ اور میری ذاتی خواہش اس سے

زیادہ نہیں کہ مرتے وقت مجھے یہ اطمینان ہو کہ میرے بیٹے کی دنیا میری دنیا سے بہتر ہوگی۔“

فسطیہ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ”آپ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ جب آپ اچھائی کی تلاش میں نکلیں گے

تو ہم آپ کے ساتھ نہیں ہوں گے۔“

یونس جو پریشان سا ہو کر اپنے والدین کی باتیں سن رہا تھا صرف اتنا سمجھ سکا۔ کہ اس کا باپ کہیں

جانے کا ارادہ کر رہا ہے اس نے مضطرب سا ہو کر کہا۔ ”ابا جان! میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“

عاصم نے اُسے اپنے سینے کے ساتھ چپٹا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ اور

اس کے بعد وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے ذہن سے ایک بوجھ اتر چکا ہے۔ اگلے دن وہ کلاڈیوس کے

خط کا جواب لکھوا رہا تھا اور اس جواب میں اس نے صرف یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میری بیوی

اور بیٹا خوش ہیں۔ اور اب مجھے یہ جاننے کی خواہش نہیں کہ میرے گھر کی چار دیواری سے باہر کیا ہو رہا ہے

اس نے یونس کی معصوم نثراتوں اور بھولی باتوں کا ذکر کیا تھا۔ اس نے انطونیا اور اس کے بچوں کے

حالات دریافت کئے تھے۔ اس نے کلاڈیوس کو دمشق آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن جہاں تک عجب

کے حالات کا تعلق تھا۔ اس نے صرف یہ لکھ کر بات ختم کر دی تھی کہ اب میرے دل میں کسی اور منزل کی طرف

دیکھنے کی خواہش باقی نہیں رہی۔ فسطیہ سے خط لکھواتے ہوئے وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ ظاہری اطمینان

آسودگی اور قناعت کے باوجود اپنے ماضی کے ساتھ اس کے سارے رشتے منقطع نہیں ہوئے۔ اور ابھی

تک اس کے دل میں اپنے وطن کے ناقابل یقین انقلاب کے متعلق مزید سننے اور جاننے کی خواہش

کروٹیں لے رہی ہے۔

اور پھر اس کے بعد آئے دن دادی تیرب سے جو اطلاعات موصول ہو رہی تھیں وہ ایسی تھیں

کہ تمام دماغی حالات اور واقعات سے بیگانہ بابے تعلق رہ سکتا۔ عجب سے جو تاجر دمشق آتے تھے۔ وہ

اپنے ساتھ اسلام کی تازہ فتوحات اور نئی کامیابیوں کی خبریں لاتے تھے۔ شام کے شہروں میں عجب کی

کایا پلٹ قبائل کے اتحاد اور اسلام کی روز افزوں قوت کے ناقابل یقین قہقہے سنانے میں وہ یہودی

پیش پیش تھے جو اپنے جرائم کی پاداش میں وہاں سے نکالے گئے تھے۔ اور جن کے نزدیک مسلمانوں سے

انتقام لینے کی یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ رومی ان کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ شام

کے رومی حاکموں کو مسلمانوں کے خلاف اُکسانے کے لیے وہ غسانی روسا بھی یکساں بے تاب تھے

تھے۔

جنہیں اسلام کی برہمتی ہوئی طاقت کا خطرہ اپنی سرحدوں سے زیادہ قریب دکھائی دیتا تھا۔ یہ لوگ عیسائی تھے اور ان کے مذہبی پیشوا اپنے رومی سرپرستوں کو بلا تائیز صحرائے عرب پر چڑھ دوڑنے کا مشورہ مے رہے تھے۔ فلسطینہ آئے دن دمشق کے گرجوں اور خانقاہوں سے واپس آ کر اپنے شوہر کو ناقابل یقین خبریں سناتی۔ عاصم نگاہبران جبروں کو مذاق میں ٹانے کی کوشش کرتا۔ لیکن اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ ہمیشہ یہ سوچ کرنا تھا۔ کہ یہ سب باتیں غلط نہیں ہو سکتیں۔ مدینہ اور حیر سے نکلے ہوئے یہودی رومی اور شاہی عیسائیوں کو مشتعل کرنے کے لیے غلط بیانی سے کام لے سکتے ہیں۔ لیکن وہ عرب جو جانچی کے عالم میں بھی اپنی شکست کا اعتراف نہیں کرتے، بلاوجہ اپنے حریف کی طاقت اور عظمت کا اعتراف نہیں کر سکتے۔

ایک دن دمشق کے ایک چوراہے میں لوگوں کا جھوم مین کے ایک تاجر کی زبانی یہ خبر سن رہا تھا کہ مسلمانوں نے مکہ فتح کر لیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے پیغمبر اسلام کا جاہ و جلال دیکھا ہے۔ میں نے وہاں اپنے کانوں سے اللہ اکبر کی آوازیں سنی ہیں۔ وہ بت جو کبھی کے اندر نصب تھے توڑ دیے گئے ہیں۔ قریش کے سرداروں کا نور و خاک میں مل چکا ہے۔ اب عرب کے اندر کوئی ایسی قوت باقی نہیں رہی جو اسلام کا راستہ روک سکے۔ جب ہم مکہ سے روانہ ہوئے تھے۔ تو مسلمانوں کا لشکر ادھاس کی طرف کوچ کر چکا تھا۔ مدینہ پہنچ کر میں یہ اطلاع ملی کہ قریش کی طرح ہوازن اور ثقیف قبائل کا نور بھی خاک میں مل چکا ہے۔ یہ معمولی واقعات نہیں۔ جب میں نے مین میں یہ خبر سنی تھی کہ مسلمانوں کا ایک لشکر بقیانک پہنچ کر واپس آ گیا ہے تو میں اسے ایک مذاق سمجھتا تھا۔ لیکن اب مجھے کوئی بات ناقابل یقین محسوس نہیں ہوتی اب اگر میں یہ سنوں کہ وہ دمشق کا رخ کر رہے ہیں تو مجھے یقین آجائے گا۔

ایک شامی نے غضب ناک ہو کر تاجر کا گلا دبوچ لیا۔ اور بلند آواز میں چلایا۔ ”تم بکتے ہو۔ تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم ہمارے دشمن کے جاسوس ہو۔“

عاصم جھوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے شامی کو دھکا دے کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”دشمن کے جاسوس چوراہوں میں کھڑے ہو کر تقریریں نہیں کرتے۔“

تاجر جھوم کے توجہ دیکھ کر سہم گیا۔ اور اس نے کہا۔ ”بھائیو! میں مسلمان نہیں ہوں۔ میرا مقصد تم

لوگوں کو خبردار کرنا تھا۔ میرے قبیلے کے کئی خاندان اسلام قبول کر چکے ہیں۔ ہمالا ایرانی حاکم بھی مسلمان ہو چکا ہے۔ لیکن میں نے اپنے اسلاف کا مذہب نہیں چھوڑا۔“

عاصم نے کہا۔ ”تمہیں ایک یہ قوت آدمی کی باتوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔“ پھر وہ تاجر کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسے اپنے مکان کے ایک آرائشہ کمرے میں بٹھا کر یہ پوچھ رہا تھا۔ ”کیا تم واقعی مکہ سے ہو کر آئے ہو؟“

”ہاں مجھے جھوٹ کہنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”کیا مسلمان واقعی مکہ پر قبضہ کر چکے ہیں؟“

”ہاں۔“

”جب جنگ ہوئی تھی تو تم وہاں تھے؟“

”مکہ فتح کرنے کے لیے مسلمانوں کو کسی بڑی لڑائی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ قریش کا ایک گرو معمولی مزاحمت کے بعد بھاگ گیا تھا۔ اس کے بعد اہل مکہ نے لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیئے تھے۔“

”یہ ناممکن ہے۔ میں قریش کے مشنق یہ نہیں مان سکتا کہ وہ جیسے جی ہار مان سکتے ہیں۔“

مدینہ پر سکریا۔ ”راتے میں جن قبائل کے لوگوں کے ساتھ میری ملاقات ہوئی تھی وہ سب یہی کہتے تھے، کہ قریش مکہ ہار نہیں مان سکتے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ واقعات دیکھے ہیں۔“

”اچھا۔ یہ بتاؤ۔ مسلمانوں نے مکہ فتح کرنے کے بعد اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟“

”انہوں نے قریش کے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو آج تک کسی فاتح نے اپنے دشمن کے ساتھ نہیں کیا۔“

نہیں یقین نہیں آئے گا۔ لیکن مکہ میں داخل ہونے کے بعد مسلمانوں نے اپنے ان دشمنوں کو بھی معاف کر دیا تھا جو انہیں بدترین آذیتیں دیا کرتے تھے۔ ان کے بنی نے ان لوگوں سے بھی باز پرس نہیں کی جو اس کے راستے میں کلنے بچھایا کرتے تھے۔ اور جن کے ہاتھ کمزور اور بے بس مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ جب اسلام کا لشکر مکہ کی طرف بڑھ رہا تھا تو اہل مکہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ قدرت نے ہلاکت اور بربادی کے سائے طوفانوں کا رخ ان کی طرف پھیر دیا ہے۔ کسی کو چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ رہنے کی امید نہ تھی۔ لیکن تھوڑی

دو ہفتے میں طوفان رحمت کی گھنٹوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اہل مکہ کو صرف اس بات کا طائل تھا کہ ان کے ایک گروہ نے بلادِ عربیہ مسلمانوں کے ساتھ الجھ کر تیرہ آدمیوں کی جانیں گواہی دی ہیں۔ میں نے مسلمانوں کے نبی کو پہلی بار اس وقت دیکھا تھا۔ جب قریش کے اکابر گردین جھکائے ان کے سامنے کھڑے تھے اور وہ یہ پوچھ رہے تھے ”تین معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کرنے والا ہوں؟“ اور قریش کے اکابر یہ کہہ رہے تھے ”تو تفریق بھائی اور شریف برادر زادہ ہے“

عاصم نے بے چینی سا ہو کر سوال کیا ”پھر مسلمانوں کے نبی نے کیا جواب دیا؟“

اس کا جواب یہ تھا۔ ”تم پر کچھ الزام نہیں جاؤ تم آزاد ہو“

عاصم نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا ”مجھے یقین ہے جو نبی ایک ناسخ کی حیثیت سے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ یہ سلوک کر سکتا ہے وہ پوری انسانیت کا نجات دہندہ ثابت ہوگا۔ خدا کی قسم! روم اور ایران کے لشکر اس دین کا راستہ نہیں روک سکیں گے جو ناداروں کو طاقت اور زیر دستوں کو بالادستی عطا کرنے کے بعد بھی انتقام سے باز رکھ سکتا ہے۔“

”تاہم نے کہا۔“ میرے لیے سب سے زیادہ عجیب چیز بات یہی تھی کہ مسلمان ہجرت کے وقت جس تند منگول تھے اس قدر اپنی فتح کے دن رحم دل تھے۔ قریش کے پرچم ٹوٹ چکے تھے۔ ان کا غرور خاک میں مل چکا ہے۔ کعبہ کے بن سوساٹھ بت پاؤں تلے روندے جا چکے ہیں۔ لیکن اس عظیم فتح کے باوجود میں نے کسی مسلمان کے چہرے پر غرور کا نشانہ نہ تک نہیں دیکھا۔ میں مختلف قبیلوں اور خاندانوں کے مسلمانوں سے مل چکا ہوں اور مجھے اس بات پر تعجب عسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے دین کے رشتے کو خون کے رشتوں پر مقدم سمجھتے ہیں۔ میں ایسا عسوس کرتا ہوں کہ ایک انسان اسلام قبول کرنے کے بعد ان تمام عادات اور خصائل سے محروم ہو جاتا ہے جن پر اہل عرب فخر کیا کرتے تھے۔“

عاصم نے کہا۔ ”اور تم یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود مسلمان نہیں ہوئے۔“

”تاہم نے جواب دیا۔“ ابھی میں نے ایک عرب کی زندگی کی راحتوں سے کارہ کش ہونے کا فیصلہ نہیں کیا ابھی اپنے دو بھائیوں کا قصاص میرے ذمے ہے اور میں یہ عسوس کرتا ہوں کہ اسلام قبول

کرنے کے بعد میرے سینے سے انتقام کی آگ بجھ جائے گی۔ اور اس کے بعد مجھے اپنی زندگی بہ سزا عسوس ہوگی۔“

عاصم نے کہا۔ ”میرے دست! تم مجھ سے زیادہ بد نصیب ہو۔ میں نے جوانی کے ایام میں اس احساس کے ساتھ اپنا وطن چھوڑا تھا کہ عرب کی سیاسی ریت کسی نیکی کو تہم نہیں دے سکتی۔ لیکن تم رحمت کے دریا کی طغیانیاں دیکھنے کے بعد بھی پیاسے ہو۔“

”تاہم نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔“ مکہ میں چند دن قیام کے دوران میں مجھے ایسا عسوس ہوتا تھا کہ میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن اب میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ میں نے وہاں جو نبی دیکھی تھی وہ مکتے دم تک میرا تعاقب کرتی رہے گی۔ اور شاید ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب میں اپنے سارے تعصبات کے باوجود اس دین کی صداقت پر ایمان لانے پر مجبور ہو جاؤں گا جس نے مجھ سے کہیں زیادہ ضدی انسانوں کی کاپیاں ڈی دی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اپنی ضد اور غرور کے معاملہ میں میں کاکوئی قبیلہ قریش کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ میں یہ بھی عسوس کرتا ہوں کہ اہل عرب نے کئی برس جس دین کے راستے میں مزاحمت کی ہے وہ بڑی تیزی کے ساتھ عجم کی دستوں پر چھا جائے گا۔“

عاصم مسکرایا۔ ”تم اسلام قبول کیے بغیر اسلام کی تبلیغ کر رہے ہو۔“

”تاہم نے جواب دیا۔“ میں صرف اپنے احساسِ مروت کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ اور آج اگر تم عرب کے کسی یہودی سے بات کر دو تو وہ تمہیں مجھ سے کہیں زیادہ مروت نظر آئے گا۔“

عاصم کچھ دیر خیالی کے عالم میں چھپت کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ ”کاش میں وہاں جا سکتا۔ کاش میں اُسے دیکھ سکتا۔“ پھر وہ تاجر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”آپ میرے مہمان ہیں اور جب تک آپ دمشق میں ہیں اس گھر کو اپنا گھر سمجھئے۔“

”تاہم نے جواب دیا۔“ نہیں نہیں کل یہ و شکم کے راستے واپس جا رہا ہوں۔ اور اس وقت میرے ساتھ سرائے میں میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

ظہور ہی بعد عاصم اُسے اپنے دروازے سے باہر رخصت کرتے ہوئے یہ کہہ رہا۔ ”مجھے افسوس

ہے کہ آپ میرے پاس نہیں ٹھہر سکتے۔ اب میں آپ کو ایک بار پھر یہ نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیشہ ہی مسلمانوں کا ذکر کرنے میں احتیاط سے کام لیں۔ ایران کو شکست دینے کے بعد کوئی شاہی یار دمی یہ سننا پسند نہیں کرتا، کہ اہل عرب ان کے لیے کسی خطرہ کا باعث ہو سکتے ہیں۔“

تاجر نے جواب دیا: ”میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا۔ آج مجھ سے جو حافقت ہوئی ہے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ بازار میں ایک غسانی مسلمانوں کے متعلق اپنی ذاتی معلومات بیان کر رہا تھا۔ اور وہ یہ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملتا ہے تھے چونکہ میری معلومات ان سب سے زیادہ تھیں اس لیے میں خاموش نہ رہ سکا۔“

اس واقعہ سے چند دن بعد دمشق میں یہ خبر گرم تھی کہ مسلمانوں کے خلاف غسانوں کے جو حصے بلند رکھنے کے لیے شام کی سردمی چوکوں پر رومی سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ کیا جا رہا ہے اور قسطنطنیہ سے ہرقل کی تازہ افواج شام کے ساحل پر اتر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات مشہور ہونے لگی کہ عتقریب غسانی اور رومی افواج عرب پر حملہ کر کے مسلمانوں کو کچل ڈالیں گی۔

عاصم کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اگر اہل شام نے عرب پر یلغار کر دی تو اس کا طرز عمل کیا ہوگا۔ جب وہ اپنے مستقبل کے متعلق سوچتا تو اس کے دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ اب شام کے سوا میرا اور کوئی وطن نہیں۔ اس لیے اسے ہر اندرونی اور بیرونی خطرے سے محفوظ رہنا چاہیے۔ لیکن جب وہ اپنی ذات سے بالاتر ہو کر اس مسئلے پر غور کرتا تو وہ یہ محسوس کرتا کہ اسلام کے علمبرداروں کی شکست کے ساتھ عرب پھر ایک بار اپنے ماضی کی ظلمتوں کے آغوش میں چھپ جائے گا۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ جس دین کی قوت نے ہوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر دیا ہے اس کے کمزور ہوتے ہی عرب کے قبائل پھر ایک بار اندر زنی ظلمتوں کا شکار ہو جائیں گے۔ چنانچہ کسی کسی اس کے دل سے غیر شعوری طور پر یہ دو ماحول جاتی تھی کہ کاش شام ارد روم کی افواج عربوں کے خلاف پیش قدمی کا اللادہ ترک کر دیں۔

باب ۳۳

ایک شام عاصم اور مطینہ بائیں باغ میں بیٹھے ہوئے تھے اور نخیائوس پاس ہی ایک چھوٹی سی کمان کے ساتھ تیراندازی کی مشق کر رہا تھا۔ ایک نوکر جھانکا ہوا عاصم کے قریب پہنچا اور اس نے ایک خط پیش کرتے ہوئے کہا۔ جناب یروشلیم سے کلاڈیوس کا اچھی یہ خط لایا ہے۔“

عاصم نے خط کھول کر قسطنطنیہ کو پیش کر دیا۔ اور اس نے کچھ کے بغیر پڑھنا شروع کر دیا۔

کلاڈیوس نے ہچکچاہٹ۔

میرے دوست مسلمانوں کے حوائج کے متعلق ہمیں جو تازہ اطلاع ملی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا بنی تیس ہزار لشکر کے ساتھ تبوک پہنچ چکا ہے۔ یہ پیش قدمی اس قدر غیر متوقع تھی کہ ہم غسانیوں کی مدد کے لیے کوئی لشکر نہیں بھیج سکتے۔ اس لشکر میں دس ہزار سوار ہیں۔ اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ایلد کے سردار نے مسلمانوں کی قوت سے مرعوب ہو کر جزیرہ دینا منظور کر لیا ہے۔ مسلمانوں نے تبوک میں پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ اور قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ تبوک سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں لیکن ہمارے علمبرداروں نے یہ اطلاع دی ہے کہ مسلمانوں کی فوج کا ایک جری سالار چند دستوں کے ساتھ تبوک سے آگے نکل گیا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کی منزل مقصود کیا ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ جو فوج تبوک سے آگے بڑھے گی اس کا ہر قدم تباہی کی طرف ہوگا۔ ہر حال ان کی جہاد قابل داد ہے۔ اور اگر میں تمہاری طرح عرب کا باشندہ ہوتا تو میرے

”میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ وہاں جانا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔“

فسطینہ نے جواب دیا۔ ”آپ کو کتنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کے دل کا حال جانتی ہوں۔ اور میرے متعلق آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں آپ کا انتظار کر سکتی ہوں۔ بڑھاپے میں یہ انتظار میرے لیے زیادہ صبر آزما ہوگا۔ اس لیے میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ جلد جائیں اور جلد واپس آجائیں۔“

”لیکن میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟“

”مجھے معلوم نہیں۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ کسی دن آپ اچانک وہاں جانے کا فیصلہ کریں گے اور میری التجائیں اور آسوا آپ کا راستہ نہیں روک سکیں گے۔ لیکن میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں اپنی محبت کو آپ کے پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دوں گی۔ میں زندگی کے سفر میں آپ کی رفیق ہوں۔ لیکن اس سفر کی منازل متعین کرنا آپ کا کام ہے۔“

عاصم نے پارے فسطینہ کی ٹھوڑی پکڑ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس وقت میری منزل میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اور اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میں ان خوب صورت آنکھوں کی گہرائیوں میں گم ہو جاؤں اور کسی اور طرف نہ دیکھوں۔“

فسطینہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”اور میری آنکھوں کی گہرائیوں میں بھی شاید آپ وہ صحرا اور نخلستان دیکھ سکیں جو آپ کو ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہیں۔“

عاصم نے جواب دیا۔ ”میں ان صحراؤں اور نخلستانوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکا ہوں۔ اب اگر میں وہاں گیا بھی تو وہاں مجھے ماضی کی تلخ یادوں کے سوا کیا حاصل ہو سکتا ہے؟“

”آپ نے جس وطن کو چھوڑا تھا وہ اب دندوں کی شکار گاہ نہیں۔ بلکہ انسانیت کی بلند ترین اہمیتوں کا مرکز بن چکا ہے۔ کلاڈیوس کے اس خط کے بعد میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ جس زمین کے کانٹوں سے آپ کے پاؤں زخمی ہوئے تھے وہاں پھولوں کی مسکراہٹیں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ جب آپ وہاں سے ہو کر واپس آئیں گے تو میں آپ کے منہ سے صرف یہ سننا پسند کروں گی کہ آپ نے کوئی ایسی جگہ تلاش کر لیا ہے جہاں شہنشاہوں کی قبائیں محکوموں کے خون سے واغدار نہیں ہوتیں۔ جہاں ایک انسان کے ہاتھ دوسرے سے

انہاں کی شاہرگ تک نہیں پہنچتے۔ اور جہاں ہمارے بیٹے کا مستقبل شام سے زیادہ محفوظ ہے۔ میں آپ کے لیے یہ سفر اس لیے بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ اگر عرب کے نبی اور اس پر ایمان لانے والوں کو قریب سے دیکھ کر آپ کی توقعات پوری نہ ہوئیں تو ہم اپنی زندگی کے باقی دن نسبتاً اطمینان کے ساتھ گزار سکیں گے۔ اور مستقبل کے متعلق موبہم امیدیں آپ کو پریشان نہیں کریں گی۔ عاصم! رات کی تاریکی صرف ان مسافروں کیلئے صبر آزما ہو سکتی ہے جنہیں طلوعِ سحر کی امید ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر عرب کا انقلاب آپ کو نئی روشنی دکھانے سے قاصر رہا تو ہمارے لیے زندگی کی ان راحتوں پر قناعت کر لینا مشکل نہیں ہوگا جو ہمیں اس گھر کی چار دیواری کے اندر میسر ہیں۔ پھر میں صبح و شام آپ کی مخموم نگاہوں کو نکالیں جھٹکے ہوئے نہیں دیکھوں گی پھر مجھے رات کے پچھلے پراس بات کا احساس پریشان نہیں کرے گا کہ میرا شوہر آرام کی نیند سونے کی بجائے کرب کی حالت میں کرے سے باہر نکل رہا ہے۔“

عاصم نے کہا۔ ”فسطینہ تم زندگی کا سب سے بڑا انعام ہو۔ اور اگر تم نے کبھی میری نگاہوں کو فضا میں جھٹکے یا مجھے رات کے پچھلے پر بے چین اور مضطرب دیکھا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اس دنیا کو تمہارے لیے زیادہ مکمل، زیادہ پُر امن اور زیادہ خوشحال دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے ماضی میں بے گناہوں کے خون کی ندیاں دیکھی ہیں۔ میں نے مظلوموں کے آنسوؤں کو خاک میں جذب ہونے دیکھا ہے۔ میں نے بے بسوں کی چیخوں کے جواب میں ظالموں کے تھکے سستے ہیں۔ میں نے غلاموں کی ہڈیوں پر پتھروں کو اپنے عورت کرے تعمیر کرتے دیکھا ہے۔ میں نے محنت کے پھولوں کو نفرت اور غور کے ہتھم کا زہن بننے دیکھا ہے۔ اور میری زندگی میں ایک وقت ایسا بھی تھا۔ جب میں یہ سب کچھ برداشت کر سکتا تھا۔ لیکن یونیس کی دُنیا کو میں اپنی دنیا سے مختلف دیکھنا چاہتا ہوں۔ کاش میں یونیس کے بیلسی دنیا تلاش کر سکوں جہاں ایک بے بس، کمزور اور مظلوم کے آنسوؤں سے پوری انسانیت کا ضمیر زلزلے جہاں ناداروں کی زبان فریاد کے لیے نہیں بلکہ شکر کے لیے کھلتی ہو۔ کاش عرب میں ایسی دنیا تعمیر ہو رہی ہو۔“

فسطینہ نے اچانک سوال کیا۔ ”آپ کب جانا چاہتے ہیں؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”ابھی میں نے جانے کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ لیکن اگر تم خوشی سے اجازت سے رہی ہو۔ تو میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“

اگلی صبح عاصم گھوڑے پر سوار ہو کر میرے لیے نکلا لیکن جلد ہی واپس آ گیا۔ فسطینہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”آپ اتنی جلدی واپس کیوں آ گئے؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”میں نے گھر سے نکلتے ہی ایک ناقابل یقین خبر سنی ہے۔ مسلمانوں کی ایک فوج نے اچانک دومتہ الجندل پر حملہ کر کے وہاں کے سردار ایکد ر بن عبد الملک کو گرفتار اور اس کے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔“

”یہ ناممکن ہے۔“

”میں فوج کے ایک ذمہ دار افسر سے اس خبر کی تصدیق کر چکا ہوں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا مسلمانوں کی فوج اتنی زیادہ تھی کہ ہمارا لشکر ان کا راستہ نہیں روک سکا۔“

”ان کی تعداد چار پانچ سو سواروں سے زیادہ نہیں تھی۔ اور رومیوں کی ملک پہنچنے سے پہلے وہ ایکد ر کو گرفتار کر کے واپس جا چکے تھے۔“ ایک رومی یہ کہہ رہا ہے کہ اگر یہ خبر درست ہے تو میں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمان ہو امیں آڑ کر دو دم پہنچے تھے۔“

”اب کیا ہو گا۔“ فسطینہ نے سوال کیا۔

”کچھ نہیں۔ رومیوں کا خیال تھا کہ ان کی فوجی نقل و حرکت مسلمانوں کو مرعوب کر دے گی۔ لیکن

اب مسلمانوں نے حکماً یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ جب چاہیں شام کے کسی بھی شہر پر حملہ کر سکتے ہیں۔“

”لیکن یہ فیصلہ کی تین ہے اور رومی اسے برداشت نہیں کریں گے۔“

عاصم نے جواب دیا۔ ”یہ بھی ممکن ہے کہ ان واقعات کے بعد مسلمانوں کی قوت کے متعلق قبیلہ کے اندازے بدل جائیں اور وہ فوری جنگ کا ارادہ بدل دے۔“

فسطینہ نے کہا۔ ”نہیں فیصلہ کو کلیسا کی خواہشات کا احترام کرنا پڑے گا۔ اور کلیسا کی خواہش یہ نہیں ہو سکتی کہ اہل عرب ایک کمر در ہمسایہ کی بجائے ایک طاقتور حریت کی حیثیت اختیار کر لیں۔ مجھے یقین ہے کہ فیصلہ جو ابی کاروانی میں زیادہ تاخیر سے کام نہیں لے گا۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”اگر تم سفر کے متعلق پوچھ رہی ہو تو میں نے ابھی کوئی ارادہ نہیں کیا۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر عرب اور روم کے درمیان باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی تو میں وہاں نہیں جا سوں گا۔ اور کلاڈیوس بھی مجھے وہاں جانے کا مشورہ نہیں دے گا۔“



چند دن بعد اہل دمشق یہ خبر سن رہے تھے کہ لشکر اسلام تبوک سے واپس لوٹ گیا ہے۔ اس کے بعد عاصم پر دشمن جانے کے ارادے کو اگلے دن، اگلے ہفتے اور اگلے مہینے پر ٹالنا رہا۔ اور کلاڈیوس نے بھی اسے دوبارہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ تقریباً ایک سال گزر گیا اور اس عرصہ میں شام کی مشرقی سرحد سے کوئی ایسی خبر نہ آئی جو رومیوں کے لیے کسی تشویش کا باعث ہو سکتی تھی۔ تاہم اسلام ایک حیرت انگیز رفتار کے ساتھ بحیرہ نما تے عرب کی دستوں کو اپنے آغوش میں لے رہا تھا۔ اور رومی جن کے نزدیک فرزند ان صحرا کا اتحاد عرب کی تاریخ کا ایک ناقابل یقین واقعہ تھا۔ اس صورت حال سے غافل نہ تھے۔

ایک شام عاصم دمشق کے بازار میں گھومنے کے بعد گھر واپس آیا۔ تو لوگ نے اسے بتایا کہ اندر ایک مہمان آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا۔ اور ایک کشتادہ اور روشن کمرے کے قریب پہنچ کر اسے ایک مافوس آواز سنائی دی اور وہ ”کلاڈیوس! کلاڈیوس! کتا ہوا اندر داخل ہوا۔“

نوٹ: ۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک پہنچ کر حضرت خالد بن ولیدؓ کو دومہ کی مہم پر روانہ

کر دیا تھا۔ حضرت خالد رومی تیر زفاری کا یہ عالم تھا کہ وہ رومی لشکر کے حرکت میں آنے سے قبل

اس مہم سے فارغ ہو کر واپس جا چکے تھے۔

کلاڈیوس یولس کو اپنی گود سے اتار کر اٹھا۔ اور دوڑوں ایک سرے سے بغل گیر ہو گئے۔

”تم کب آئے۔ تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔ سلفونیہ کیسی ہے؟ تمہارے بچے کیسے ہیں؟ تم انہیں ساتھ کیوں نہیں لاتے؟“ عاصم نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر دیے۔

”وہ سب ٹھیک ہیں۔ اگر یہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہو تا تو انہیں ضرور لاتا۔ لیکن میں علی الصباح انطاکیہ جا رہا ہوں۔“

”میں نے سنا ہے کہ قیصر وہاں آ رہا ہے؟“

”ہاں۔ عرب کے حالات نے انہیں پھر ایک بار اپنے مشرقی علاقوں کی دیکھ بھال پر مجبور کر دیا ہے۔“ عاصم نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تمہاری دعوت پر یروشلم نہ آسکا۔ میں نے کئی بار سفر کا ارادہ کیا۔ لیکن اب شاید میں عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا ہوں جب کہ ایک انسان کی قوت عمل اس کے اڑوں کا سٹھا نہیں دیتی۔ آپ کہتے ہیں کہ عرب کے حالات نے قیصر کو انطاکیہ آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تہوک سے واپسی کے بعد مسلمانوں کے ارادے بدل گئے ہیں۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اگر نونہ کا حکم محمد احسن اللہ علیہ وسلم کے ایچی کو قتل کرنے کی طوطی نہ کرتا تو وہ شام کی سرحدوں کی طرف کبھی نہ دیکھتے۔“

کلاڈیوس نے کہا۔ ”میں مسلمانوں کے عوام کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اسلام کے ساتھ عرب میں جو انقلاب رونما ہو رہا ہے وہ انسانی تاریخ کا ایک عظیم ترین معجزہ ہے۔ موتہ اور تہوک پر ان کے حملے ہمارے لیے کسی بڑی پریشانی کا باعث نہ تھے لیکن ان کے چند مہینوں میں عرب کی جو کاپاپلٹ ہوئی ہے وہ ہمارے لیے سرحدی لڑائی سے کہیں زیادہ تشویش ناک ہے۔ پچھلے سال جب میں نے تیس یروشلم آنے اور وہاں سے تہوک یا اس سے آگے اپنے وطن کی سیاحت کی دعوت دی تھی تو مجھے یقین تھا کہ عرب کے تازہ حالات سننے ہی تم سفر پر آمادہ ہو جاؤ گے۔ میں نہیں رومی حکومت کے ایک جاسوس کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسے انسان کی حیثیت سے وہاں بھیجنا چاہتا تھا۔ جس کی گواہی پر مجھے یقین آسکتا تھا۔ موتہ اور اس کے بعد تہوک پر مسلمانوں کے حملوں کی نسبت میرے لیے یہ بات کہیں زیادہ

اہم تھی کہ اسلام نے شراب، جوئے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اس کے باوجود عرب جو قی دزد جو قیہ دین قبول کر رہے ہیں۔ اسلام نے چوری اور بدکاری کے لیے ہولناک سزائیں مقرر کی ہیں۔ اور عربوں کی تمام وہ بڑی عادات یکسر بدل دی ہیں جن پر وہ صدیوں سے فخر کرتے چلے آ رہے تھے۔ مکہ میں قریش کی شکست کے بعد بھی ہم یہ سوچتے تھے کہ عرب کے طول و عرض میں ان تہوں کی پوجا کرنے والے قبائل پوری شدت کے ساتھ اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے، ہو کہہ کے اندر تو دے دیے گئے ہیں۔ ہمیں یہ بھی یقین تھا کہ عربوں کی قبائلی عصبیتیں انہیں ہمیشہ ایک ایسے دین کے خلاف آسانی رہیں گی جس کا مقصد نسل اور خون کے امتیازات کو مٹانا ہے۔ پھر ہماری آخری امید یہ تھی کہ جب مسلمان مکہ سے آگے بڑھیں گے تو انہیں سیکڑوں قبائل کی متحدہ قوت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور ان کا انجام اس نذی سے مختلف نہیں ہوگا جو بالآخر صحرا کی پیاسی ریت میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن گذشتہ ایک سال کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عرب کے انقلاب کی وسعت اور گیرائی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ عرب سے آئے دن ہیں صرف اس قسم کی اطلاعات ملتی ہیں کہ آج فلاں قبیلے کے ذمہ نے محمد (ص علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے اور آج فلاں علاقے کے اتنے خاندان مسلمان ہو گئے ہیں جو لوگ چند سال قبل اسلام کے مبلغین کو قتل کیا کرتے تھے اب اسلام کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بذات خود مدینہ جاتے ہیں مجھے تمام قبائل کے نام یاد نہیں رہے لیکن تم حیران ہو گے کہ حضرت موتہ اور میں سے لے کر جامتہ تک عرب کے بیشتر قبائل اسلام قبول کر چکے ہیں۔ قریش مکہ نے کافی مدت مقابلہ کرنے کے بعد اپنی شکست کا اعتراف کیا تھا۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورا عرب اس دین کی بے پناہ اخلاقی اور روحانی قوت کے سامنے ہتھیار ڈال چکا ہے۔ یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے اپنے اسلاف کے بت توڑ رہے ہیں۔ اہل عرب پہلے ہر ایک حکومت کے جھنڈے تلے متحد اور منظم ہو رہے ہیں۔ اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جب شاہراہ حیات کا یہ نیا قافلہ اپنی منازل کی طرف رخ کرے گا تو روم اور ایران کی ساری عظمتیں اس کے راستے کے گرد و خوار میں گم ہو کر رہ جائیں گی۔“

کلاڈیوس یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور عاصم اور سلفونیہ دیر تک سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھتے

رہے۔ بالآخر عاصم نے کہا۔ ”آپ مجھے دوبارہ اپنے وطن جانے کی دعوت دے رہے ہیں اور مجھے دہرے کہ اس دفعہ نہیں شاید انکار نہ کر سکیں“

کلاڈیوس نے جواب دیا۔ ”عاصم! اگر میں ایک عرب ہوتا اور تمہاری طرح وہاں کے حالات سے یابوس اور بدول ہو کر نکلتا اور پھر عرب الوطنی میں مجھے کوئی یہ مزہ نہ سناتا کہ جس زمین پر تم نے جہالت اور ظلم کی اندھی اور بہری قوتوں کی ہولناکیاں دیکھی تھیں، وہاں رحم، عدل اور انصاف کے چراغ روشن کیئے جا رہے ہیں تو میرے دل میں وہاں جانے کی خواہش ضرور بیدار ہوتی۔ عاصم تم میرے دوست اور محسن ہو۔ تم نے مجھے موت کے چبڑوں سے نکالا تھا۔ اور میں اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے تمہیں قسطنطنیہ لے گیا تھا۔ لیکن آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر عرب کے متعلق جو کچھ میں نے سنا ہے صحیح ہے تو زندگی کی جو مسرتیں وہاں تھا انتظار کر رہی ہیں وہ شاید تمہیں قیصر کے ایوان میں بھی نصیب نہ ہوں۔ اگر خدا کو رب کی حالت پر رحم آگیا ہے اور وہاں اس کی رحمتوں کا نزول ہو رہا ہے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ تم وہاں جا کر اپنا دامن بھرو۔ اگر عرب کے متعلق میری معلومات سراسر غلط ہیں تو میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم وہاں جا کر واپس آنے کی بجائے قسطنطنیہ اور یوس کو بھی وہیں بلا لو گے اور اس کے بعد یہ ممکن ہے کہ زندگی میں ہماری ملاقات نہ ہو سکے۔ لیکن میرے لیے یہ اطمینان کافی ہو گا کہ تم اس دنیا میں اپنا صحیح مقام حاصل کر چکے ہو۔“

عاصم بولا۔ ”کلاڈیوس سچ کہو۔ کیا میرے متعلق تمہارے اضطراب کی وجہ یہ نہیں کہ تم میرے لیے دمشق کو غیر محفوظ سمجھتے ہو۔“

کلاڈیوس نے جواب دیا۔ ”میرے دوست! تم یہ جانتے ہو کہ تمہاری حفاظت کے لیے میں اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔“

”یہ میں جانتا ہوں۔ لیکن تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

کلاڈیوس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”اگر تم اس سوال کے جواب پر اس قدر مصر ہو تو سنو! میں ان لوگوں میں سے ہوں جو عرب کے ساتھ رومی حکومت کا نفاذ مانگ رہے ہیں اور جب سے میں نے یہ

سنا ہے کہ بخران کے تمام عیسائی قبائل مسلمان ہو چکے ہیں۔ اور بعض عسائی رومی بھی اسلام کی طرف مائل ہیں۔ میرا یہ یقین اور پختہ ہو گیا ہے کہ کلیسا کے اکابر قیصر کو زیادہ دیر آرام سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ وہ عیسائیت کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانے پر مجبور ہو جائے گا۔ اور مجھے یہ کہتے ہوئے ندامت محسوس ہوتی ہے کہ جب یوب اور شام کا معرکہ شروع ہو گا تو تم یہاں صرف ایک عرب کی حیثیت سے دیکھے اور پہچانے جاؤ گے جن لوگوں نے قسطنطنیہ کے نانا کو اس کی عظیم خدمات کے باوجود ایرانیوں کا ظفر سبھ کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، وہ تمہاری خدمات کا لحاظ نہیں کریں گے۔ تمہارے خلاف حوام کو مشتعل کرنے کے لیے کسی متعصب پارسی کا یہ کہہ دینا کافی ہو گا۔ کہ تم شرب کے باشندے ہو اور تمہاری دلی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ ان حالات میں رومی حکومت کو اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے تم عربوں کے خلاف تلوار اٹھانے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ عاصم میں تمہیں اس امتحان سے بچانا چاہتا ہوں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ تمہاری جنگ کسی دشمن کے خلاف نہیں بلکہ اپنے ضمیر کے خلاف ہو گی اور میرے نزدیک تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو اپنے ضمیر کی موت کے بعد صرف اس بات پر قانع رہ سکتے ہیں کہ انہیں چند سال اور زندگی کے سانس لینے کی مصلحت مل گئی ہے۔“

قسطنطنیہ نے کلاڈیوس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں اس گھر کے بدلے اپنے شوہر کے ضمیر کی قربانی مانگوں گی تو آپ غلطی پر ہیں۔ خدایا قسم! اگر اہل روم اتنے ناشکر گزار ہیں تو میں اسی وقت دمشق چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ میرے لیے صحرا کا ایک جھونپڑا زیادہ آرام دہ ہو گا۔“

کلاڈیوس نے جواب دیا۔ ”میری بہن، تم سین کی بیٹی ہو اور تمہارے لیے یہ جسمنا شکل نہیں کہ جنگ کے وقت قوموں کی تقدیر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے جو دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کرتے یہ ہو سکتا ہے کہ جنگ شروع نہ ہو اور دمشق میں آپ کی ساری زندگی خیریت سے گزر جائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ جنگ شروع ہو جائے اور عاصم اس سے الگ تھلک رہ کر اس گھر کے اندر اطمینان کا سانس لے سکے۔ جنگ کے ایام میں قیصر کی رعایا کا جو درد مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانے میں پس و پیش کرے گا، اسے حکومت کلیسا کا دشمن سمجھا جائے گا۔ میری باتوں کو برا نہ مانیں۔ میں اس وقت جو کچھ کہ رہا ہوں وہ دوستی کے

تقاضوں سے مجبور ہو کر کہہ رہا ہوں۔ کلاڈیوس یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اور عاصم دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے فلسطینہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”فلسطینہ! ہم وہاں جا رہے ہیں۔ ہم تینوں وہاں جا رہے ہیں۔ تم تیار ہو جاؤ۔ ہم تین دن کے اندر اندر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“
فلسطینہ نے جواب دیا۔ ”میں کل ہی روانہ ہونے کے لیے تیار ہوں۔“
کلاڈیوس نے کہا۔ ”نہیں عاصم یہ بہتر ہوگا کہ میں انطاکیہ سے واپس آ جاؤں۔ اس کے بعد میں عرب کی سرحد تک تمہارے سفر کا انتظام کروں گا۔“

”آپ کب واپس آئیں گے؟“

”مجھے دس دن سے زیادہ نہیں لگیں گے۔“

فلسطینہ نے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ دس دن بعد ان کا ارادہ بدل جائے گا۔“

عاصم مسکرایا۔ ”میں اپنے لیے نہیں یونس کے لیے جا رہا ہوں۔ اور اب اگر روم کی پوری

فوج میرے راستے میں کھڑی ہو جائے تو بھی میں اپنا ارادہ تبدیل نہیں کروں گا۔“

باب ۴۴

قریباً دو ماہ بعد ایک سہ پہر کے وقت عاصم اور فلسطینہ ایک ٹیلے کے سامنے میں گھوڑے روک کر سامنے یثرب کی پہاڑیوں اور نخلستانوں کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ یونس جس کا چہرہ گرمی سے مرجھایا ہوا تھا۔ اپنے باپ کے ساتھ سوار تھا۔ اُس نے پوچھا۔ ”اباجان! یہ آپ کا شہر ہے؟“
”ہاں، بیٹا۔“

”پھر آپ رگ کیوں گئے ہیں۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“

”گھبراؤ نہیں بیٹا، ہم ابھی وہاں پہنچ جائیں گے۔“ عاصم نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

تھوڑی دیر بعد یونس نے پوچھا۔ ”اباجان! وہاں پانی مل جائے گا نا؟“

”ہاں بیٹا! وہاں تمہارے لئے کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔“

وہ کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہے۔ عاصم کے دل کی گہرائیوں سے ماضی کی ان گنت یادیں ابھر رہی تھیں اور وہ نئی جو اس نے یثرب کی پہلی جھلک دیکھتے وقت اپنی آنکھوں میں محسوس کی تھی بتدریج آنسوؤں میں تبدیل ہو رہی تھی۔

جب وہ ایک نخلستان کے قریب سے گزر رہے تھے تو عاصم نے مڑ کر فلسطینہ کی طرف دیکھا اور اپنا گھوڑا روک کر کہا۔ ”فلسطینہ یہ سمیرا کا گھر ہے اور اب شاید وہاں مجھے پہچاننے والا بھی کوئی نہ ہو۔“

یونس نے سوال کیا۔ ”اباجان! یہاں کے لوگ کسی کو پہچاننے بغیر پانی نہیں دیتے؟“

”نہیں، بیٹا! اس گھر کے کلین پانی مانگنے والوں کو دودھ پیش کیا کرتے ہیں۔“ عاصم یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے

کے لئے ماضی کی دستوں میں کھو گیا۔

فسطینہ نے سوال کیا۔ ”آپ وہاں جانا چاہتے ہیں؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”ہاں! یہ گھر میرے لئے اپنے گھر سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اور نعمان کا حال معلوم نئے بغیر یہاں سے گزر جانا مجھے کافی صبر آزما محسوس ہوتا ہے۔“

آبا جان! نعمان کون ہے؟۔ یونس نے سوال کیا۔

”وہ میرا دوست تھا بیٹا!“

”تو پھر آپ میرے لئے پانی کیوں نہیں منگواتے؟“

ایک لڑکا جس کی عمر دس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی، بارغ سے نمودار ہوا اور اُس نے کہا۔

”آپ کو پانی چاہیے؟“

”ہاں“ عاصم نے جواب دیا۔ ”تم اس گھر میں رہتے ہو؟“

”ہاں“

”تمہارا کیا نام ہے؟“

”میرا نام عبداللہ ہے۔“

”تم نعمان کو جانتے ہو؟“

”وہ میرے آبا جان ہیں، آئیے، اندر آئیے!“ عبداللہ نے یہ کہہ کر عاصم کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی

عاصم نے یونس کو بازو سے پکڑ کر نیچے اتارتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنے اس ننھے نعمان کو پانی پلا دو۔“

”آپ کو ہمارا اہمان بننا پسند نہیں؟“

”نہیں، اس وقت ہم آگے جا رہے ہیں۔ تم اسے جلدی لے آؤ۔“

”بہت اچھا“ عبداللہ نے یہ کہہ کر یونس کا ہاتھ پکڑ لیا، اور وہ بارغ میں غائب ہو گئے۔

مختوذی دیر بعد وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک خوش وضع آدمی تھا۔ عاصم اُسے دیکھتے ہی گھوڑے سے اتر پڑا۔ نووارد نے کہا ”میرے بیٹے کو یہ شکایت ہے کہ دو معزز مسافر پیاس کے باوجود پلے

گھر میں پاؤں رکھنا پسند نہیں کرتے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

”ہم بہت دُور سے آئے ہیں؟“

”میرا بیٹا یہ بھی کہتا ہے کہ آپ کو میرا نام معلوم ہے اور اگر یہ درست تو آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میرے گھر کا دروازہ جہانوں کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔“

عاصم نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ اس گھر کے کین اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہیں کرتے۔“ اور اس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو اُٹھ آئے۔

یونس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ ”ہاں، آبا جان! میں نے پانی مانگا تھا اور یہ مجھے زبردستی دو دے پلانا چاہتے تھے۔“

عاصم کی تڑپ ضبط جواب دے چکی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”نعمان! تم نے مجھے پچھانا نہیں؟“

وہ ایک ثنائیہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہا اور پھر عاصم، عاصم! کہتا ہوا اُس کے ساتھ لپٹ گیا۔

”میرے دوست، میرے بھائی، تم کہاں تھے۔ میں اور سالم تمہاری تلاش میں عرب و عجم کی خاک چھان چکے ہیں۔ اور اب تم میرے گھر کے دروازے سے باہر کھڑے ہو؟“

نعمان کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر مسکراہٹیں تھیں۔

اچانک وہ عاصم کو چھوڑ کر فسطینہ کی طرف متوجہ ہوا۔

عاصم نے کہا۔ ”نعمان! یہ میری بیوی ہے۔“

”آئیے! نعمان نے یہ کہہ کر فسطینہ کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ عبداللہ نے عاصم کا گھوڑا سنبھال لیا۔“

اور وہ اُس بارغ کے اندر داخل ہوئے جو عاصم کو اپنی جوانی کی انگلیوں کا قبرستان محسوس ہوتا تھا۔

نعمان نے کہا۔ ”اگر آپ مختوذی دیر پہلے آتے تو سالم سے یہیں ملاقات ہو جاتی۔“

عاصم نے پوچھا۔ ”سعادت کیسی ہے؟“

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

”عباد زندہ ہے۔“

”نہیں وہ آپ کے جانے سے دو سال بعد فوت ہو گیا تھا۔ مرنے سے قبل اُس کا آخری کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے شمعوں کو قتل کر دیا تھا۔“

بارخ عبود کرنے کے بعد وہ مکان کے صحن میں داخل ہوئے۔ وہاں ایک عورت اُون کات رہی تھی، اور ایک کسن بھی اُس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ عورت نعمان کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر جلدی سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی۔ ایک نوکر گھوڑے لے کر اصطبل کی طرف چلا گیا اور یہ سب کھلی ہوا میں ایک چٹائی پر بیٹھ گئے۔ نعمان نے انہیں پانی پلایا اور پھر عبداللہ سے کہا: ”بیٹا تم سالم کو بلا لاؤ۔“

عاصم نے کہا: ”میں اپنے خاندان میں سب سے پہلے سعاد کو دیکھنا چاہتا ہوں، اس لئے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ میں خود چلا جاؤں۔“

نعمان نے کہا: ”سعاد بھی یہیں آجائے گی۔“

عاصم نے کہا: ”یہ بات مجھے ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے۔“

”اب آپ کے گھرانے کا کوئی فرد اس گھر کے لئے اجنبی نہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

نعمان یہ کہہ کر مکان کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اُس کی بیوی جو چرخہ چھوڑ کر اندر چلی گئی تھی اُس کے ساتھ تھی۔

عاصم نے اچانک اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی بیوی کو پریشان دیکھ کر نعمان نے کہا: ”سعاد! تم نہیں جانتیں یہ کون ہیں؟“

اُس نے عاصم کی طرف غور سے دیکھا۔ چند قدم آگے بڑھی جھکی اور پھر اُچی! انہی! کہتی ہوئی بے اختیار اُس سے لپٹ گئی۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم زندہ ہو۔ تم کسی دن ضرور آؤ گے۔ اور میں ہر نماز کے ساتھ یہ دعا کیا کرتی تھی کہ میں تمہاری واپسی تک زندہ رہوں۔“ پھر اُس کے الفاظ سسکیوں میں ڈوب کر رہ گئے، اور سسکیاں دہنی دہنی چھین میں تبدیل ہونے لگیں۔ کسن ٹوکی جو حیرت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہی تھی اچانک چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی اور فسطینہ نے اُسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھالیا۔

سعاد اپنے آنسو پونچنے کے بعد فسطینہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”میں مجھے معاف کرنا۔ میں تھوڑی

دیر کے لئے مہمان نوازی کے آداب بھول گئی تھی۔“

فسطینہ نے جواب دیا: ”ہن میرے لئے آپ کے جذبات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ آپ کا بھائی اکثر آپ کا ذکر کیا کرتا تھا۔ اور جب میں آپ کا تصور کرتی تھی تو مجھے یہ تسکین ہوتی تھی کہ آپ کی ہمسائی میں مجھے غریب الوطنی کا احساس نہیں ہوگا۔“

نعمان نے کہا: ”اگر آپ کا یہاں کوئی جان بچاؤ والا نہ ہوتا تو بھی آپ کو غریب الوطنی کا احساس، پریشان نہ کرتا۔ اب ہمیں یہاں انسانی رشتے، خون کے رشتوں سے بھی زیادہ اہم محسوس ہوتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ ایسے وقت یہاں آئے ہیں، جب کہ ہمارا ہادی جس نے ہماری زندگی کے دھارے بدل دیئے تھے، ہم سے رخصت ہو چکا ہے۔ لیکن وہ روشنی جس میں ہم نے انسانیت کی نئی عظمتیں دیکھی ہیں، ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگی۔ یہ زمین جہاں قبیلوں اور نسلوں کے درمیان نفرت کی آگ کے پہاڑ کھڑے تھے، انسانی اخوت کا مرکز بن چکی ہے اور اب یہاں کسی انسان کو اپنی اجنبیت یا غریب الوطنی کا احساس پریشان نہیں کر سکتا۔“

عاصم نے کہا: ”نعمان مجھے کل ہی ہادی اسلام کی وفات کی خبر ملی تھی۔ اور راستے میں بعض لوگوں کی باتیں سُن کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اسلام سے منحرف ہو جائیں گے۔ اپنی صدیوں کی زندگی پر جو قیود انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت سے مرعوب ہو کر قبول کر لی تھیں، اب انہیں ناقابل برداشت محسوس ہوں گی۔ اور میں بذاتِ خود یہ محسوس کرتا ہوں کہ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد حالات بدل چکے ہیں اور وہ عرب جو شراب، جو شے، سود، چوری، ڈاکہ زنی اور قتل و غارت اور ظلم و جور کو اپنی زندگی کے مفاصل میں شمار کرتے تھے، پوری شدت کے ساتھ اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔“

نعمان نے جواب دیا: ”یہ حالات ہمارے لئے غیر متوقع نہیں۔ ہم اُن قبائل کو جانتے ہیں جنہوں نے بحالتِ مجبوری اسلام قبول کیا تھا۔ ہم اُن جھوٹے نبیوں سے بھی خبر نہیں جو انہیں گمراہ کر رہے ہیں لیکن اسلام خدا کا دین ہے اور ہم یقین ہے کہ اس دین کے علمبردار ہر ابتلا اور ہر آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلیں گے۔ اللہ کے دین کی راہ کا ہر کاٹنا مسل دیا جائے گا اور صرف عرب کی حدود کے اندر ہی نہیں

بلکہ عرب کے باہر بھی جو طاقتیں اسلام سے متصادم ہوں گی، وہ اس سیلاب کے آگے تنکوں کے برابر ثابت ہوں گی۔“

عاصم نے پوچھا: کیا یہ درست ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل یہاں سے ایک لشکر شام پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا؟

”ہاں! میں اور سالم اس لشکر کے ساتھ جا رہے تھے۔ لیکن حضورؐ کی علالت اور وفات کے باعث ہم ٹک گئے ہیں۔“

عاصم بولا: ”اور اب شاید مقامی حالات اس لشکر کو ہمیشہ کے لئے شام پر چڑھانی کا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیں۔“

”مہینوں تمہارا قیاس غلط ہے۔ ہمارے امیر ابو بکر صدیق کو جن لوگوں نے فروری خطرات کے پیش نظر شام کی طرف لشکر کی روانگی ملتوی کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ انہیں یہ جواب ملا ہے کہ اگر مجھے یہ یقین ہو کہ جنگ کے درندے مدینے میں داخل ہو کر مجھے اٹھالے جائیں گے تو مجھے اس لشکر کو میں نہیں روک سکتا، جس کی روانگی کا حکم رسول اللہ نے دیا تھا۔“

عاصم نے پریشان ہو کر سوال کیا: ”لیکن تم اسے قرین مصلحت سمجھتے ہو کہ عرب کے باغی قبائل بیٹھے پر لشکر کشی کر دیں اور یہاں کی فوج شام کی طرف روانہ ہو جائے؟“

نعمان مسکرایا: ”ہمارے لئے رسول اللہ کا حکم ہی سب سے بڑی مصلحت اور دانائی ہے۔“

”اس فوج کا سپہ سالار کون ہے؟“

”اُن کا نام اسامہ ہے اور وہ رسول اللہ کے غلام زید بن حارث کے بیٹے ہیں۔“

”تم یہ کہتے ہو کہ ایک غلام کا بیٹا، رومی سلطنت کے خلاف عربوں کی قیادت کر رہا ہے۔“

”مہینوں بلکہ رسول اللہ کے ایک جان نثار کو اسلام کے غازیوں کی امارت سونپی گئی ہے۔ اور اس

کو حضورؐ نے ہی اس خدمت کے لئے منتخب کیا تھا۔“

”کیا وہ بہت زیادہ تجربہ کار ہے؟“

”اُس کی عمر پچیس سال سے بھی کم ہے۔“

”اگر عربوں نے اُسے اپنا سپہ سالار تسلیم کر لیا ہے تو یہ یقیناً ایک مجزہ ہے۔“

”مہینوں مجزہ یہ ہے کہ عرب مسلمان بن گئے ہیں۔“

عاصم نے کہا: ”میں اسلام کے متعلق بہت کچھ جاننا چاہتا ہوں، لیکن پہلے مجھے اس سوال کا جواب دو کہ اوس اور خزرج واقعی ایک دوسرے کے دوست بن چکے ہیں؟“

”ہاں! آج بھی یقین نہیں آتا کہ ہم کبھی ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ تمہارے ردپوش ہونے سے

چند دن بعد ہمارا آخری معرکہ ہوا تھا، اور ہماری رگوں میں جتنا فالمتزخون تھا، وہی شرب کی خاک میں جذب

ہو گیا تھا۔ اُس کے بعد تمہارے جیسے چند آدمی ہدایت کی تلاش میں مکہ پہنچ گئے اور ہمیں اپنے مستقبل کے

انق پر نئی روشنی دکھائی دینے لگی۔ پھر جب پیغمبر اسلام کے لئے مکہ کی زمین تنگ ہو گئی تھی تو اللہ نے اہل

یشرب کو اُن کی میزبانی کا شرف عطا کیا اور یہاں خدا کی رحمتوں کی بارش ہونے لگی۔ اب ہم یثرب کو مدینہ منورہ

کہتے ہیں۔ اب اس مقدس خاک میں صرف نیکیاں جم لیتی ہیں۔ عاصم! جب تم یہاں سے نکلے تھے تو یہ کون

کہہ سکتا تھا کہ اوس اور خزرج کسی دن ایک ہو جائیں گے۔ آپ کے جانے سے تین دن بعد عباد نے رات

کے وقت میری اور سالم کی ملاقات کرائی تھی اور ہم سے یہ عہد لیا تھا کہ یثرب کے حالات خواہ کچھ ہو جائیں

ہم ایک دوسرے پر تلوار نہیں اٹھائیں گے۔ لیکن ہمیں اگلے دن ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ اوس اور خزرج

کی جنگ ناگزیر ہے اور ہم یہاں رہتے ہوئے اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکیں گے۔ چنانچہ ایک رات ہم یہاں

سے مدائن کی طرف بھاگ نکلے۔ وہاں تین سال گزارنے کے بعد ہم نے تاجروں کے ایک ٹانفلے کے ساتھ

یروشلم اور دمشق کی سیاحت کی۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید تم کہیں مل جاؤ۔ اس کے بعد ہم واپس آئے تو یہاں

روئے زمین کی ساری نعمتیں ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔“

عاصم نے کرب انگیز لہجے میں کہا: ”اور میں اتنا بد نصیب تھا کہ انہیں دیکھ بھی نہ سکا۔“

” نہیں، عاصم! اگر تمہیں حق کی تلاش ہے تو تم بد نصیب نہیں ہو۔ آقا نے انسانیت کو نجات کا جو راستہ دکھایا ہے وہ کہکشاں سے زیادہ تابناک ہے۔ اب عصر کی نماز کا وقت جا رہا ہے، میں ابھی فارغ ہو کر تمہیں یہ بتاؤں گا کہ عرب میں کتنا عظیم انقلاب آچکا ہے۔“



تھوڑی دیر بعد عاصم اور منطینہ دم بخود ہو کر نعمان کی تقریر سن رہے تھے۔ وہ رسول اللہ کے جانشینوں پر اہل مکہ کے مظالم بیان کر رہا تھا۔ وہ بدر، احد اور خندق کے معرکوں کے نقشے کھینچ رہا تھا۔ رسول اللہ کے مطبوعات بیان کر رہا تھا۔ اور ان بشارتوں اور پیش گوئیوں کا ذکر کر رہا تھا جو پوری سوجھی بھینسیں تھیں۔ وہ اُس قافلے کی سرگزشت سنا رہا تھا، جسے اہل مکہ کے جبر و تشدد نے مدینے کی طرف ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ جہا جہا جگہ کے صبر و استقلال اور انصاف مدینہ کے ایشاور غلوں کی داستانیں بیان کر رہا تھا۔ وہ شمع رسالت کے اُن پڑاؤں کی ارواح کو تشکر کے آنسو پیش کر رہا تھا، جنہوں نے اپنے خون سے شجر اسلام کی آبیاری کی تھی، اور وہ انسانیت کے اُس عظیم ترین محسن کو درود اور سلام بھیج رہا تھا، جس نے عرب کے ظلمتکدے میں ہدایت کے چراغ روشن کئے تھے۔ عاصم کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور جب نعمان نے اپنی تقریر ختم کی تو وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے دل سے ماضی کا سارا گرد و غبار دھل چکا ہے۔

اُس نے پوچھا۔ ”نعمان کیا یہ درست ہے کہ جب کسریٰ کی افواج شام پر لیٹا کر رہی تھیں تو انہوں نے رومیوں کی فتح کی بشارت دی تھی؟“

”ہاں! یہ بشارت قرآن پاک میں موجود ہے۔ مجھے وہ آیات یاد ہیں، سنو! نعمان نے یہ کہہ کر سوڑھم

سنادی۔

عاصم نے کہا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ اگر اُس زمانے میں خدا کا کوئی بندہ قسطنطنیہ پہنچ کر بھی اس قسم کی پیش گوئی

کرتا تو لوگ اُس کا مذاق اڑاتے؟“

نعمان نے جواب دیا۔ ”اُس زمانے میں اہل مکہ بھی اس بشارت پر یقین کرنے والوں کا مذاق اڑاتے

تھے۔ عالم میں ایک عام آدمی ہوں۔ اور میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں رسول اللہ کی زندگی کے کسی بہنویر بھی پوری روشنی ڈال سکتا ہوں۔ لیکن مدینے میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ رُزِ عالم کی محنت اور اطاعت کے لئے وقف تھا۔ یہ وہ آئینے ہیں جن میں تم اُن کے حسن و جمال کا عکس دیکھ سکو گے۔“

”لیکن جب تم اُن کے ساتھ باتیں کرو گے تو وہ بھی یہی کہیں گے کہ اُن کی نگاہیں، نور کے ایک سمندر کی چند لہروں سے آگے نہیں جا سکیں۔“

”اور ان لوگوں کو اس بات کا یقین ہے کہ وہ روم کی عظیم سلطنت کے ساتھ ٹکر لے سکتے ہیں؟“

”ہاں! انہیں یقین ہے کہ کسی دن قیصر اور کسریٰ کے تاج اُن کے پاؤں کے نیچے ہوں گے۔ لیکن اگر

یہ یقین نہ ہو تو بھی انہیں جہاد کا راستہ دکھانے کے لئے رسول اللہ کا حکم کافی ہے۔ مسلمانوں کے لئے زندگی

کی سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں شہید ہو جائے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ مسلمان فتح کی اُمید کے بغیر بھی لڑ سکتے ہیں۔“

”ہاں! اسلام کے غازیوں کو شہادت کا شوق، فتح اور شکست سے بے نیاز کر دیتا ہے۔“

نعمان نے کہا۔ ”یعنی سالم اُگیا۔“

عاصم نے مڑ کر دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سالم نے السلام علیکم کہا۔ اور پریشان سا ہو کر عاصم کی

طرف دیکھنے لگا۔

سعاد نے کہا۔ ”ابھی! آپ انہیں نہیں پہچانتے؟“

سالم کے تذبذب پر عاصم نے کہا۔ ”سالم میں عاصم ہوں۔“

سالم چند ثانیے سکتے کے عالم میں کھڑا ہوا اور پھر بے اختیار عاصم سے لپٹ گیا۔

کچھ دیر سالم سے گفتگو کے بعد عاصم نے نعمان کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”اب شام ہونے والی ہے

اور میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم تھوڑی دیر شہر میں گھوم آئیں۔“

نعمان نے کہا۔ ”چلئے! لیکن آج آپ کو مدینے کی گلیاں خوشیوں سے خالی نظر آئیں گی۔ مسلمان ابھی رسول اللہ

کا غم نہیں بھڑے۔“

عاصم میں نے ابھی تک ایک اہم فریضہ ادا نہیں کیا اور وہ یہ ہے کہ میں نہیں اسلام کی دعوت میں مدینہ میں جن لوگوں کو آپ سے محبت ہے، ان کے لئے اس سے بڑی خوشی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ تم اسلام قبول کر لو، ابھی جب میں رسول اللہ کی زندگی کے واقعات بیان کر رہا تھا تو تمہارے آنسو اینٹ لٹ کی گڑھی دے رہے تھے کہ اسلام کی روشنی تمہارے دل سے دور نہیں رہ سکتی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ایک مسلمان کی حیثیت سے مدینہ کی گلیوں کا طواف کرو۔“

عاصم نے جواب دیا: ”نعمان میں تمہاری دعوت قبول کرتا ہوں۔ اگر خلیفہ مجھے مسلمان بنا سکتے ہیں تو مجھے ابھی ان کے پاس لے چلو۔“

نعمان نے جواب دیا: ”اسلام قبول کرنے کے لئے آپ کو خلیفہ کے پاس جانے یا کوئی رسومات ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف زبان سے چند کلمات کافی ہیں۔“

فسطینہ نے سریانی میں اپنے شوہر سے کچھ کہا۔ اور وہ نعمان سے مخاطب ہو کر بولا: ”فسطینہ کوشکایت ہے کہ آپ نے اُسے قبول اسلام کی دعوت نہیں دی؟“

نعمان نے جواب دیا: ”میں خوش قسمت ہوں کہ یہ سعادت میرے مقدر میں تھی، میں آپ دونوں کو کلمہ توحید پڑھانے کے لئے تیار ہوں۔“

غروب آفتاب سے کچھ دیر بعد عاصم، نعمان اور سالم کے ساتھ گھر سے باہر نکلا تو اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کے دل سے ایک بوجھ اتر چکا ہے، اور اُس کی روح ماضی کی زنجیروں سے آزاد ہو چکی ہے۔ نعمان اور سالم نے درود پڑھنا شروع کیا اور وہ اُن کے ساتھ شریک ہو گیا۔ پھر اُس کی آواز بلند ہوتی گئی اور پھر سسکیوں میں دب کر رہ گئی، اور اُس نے کہا: ”نعمان! مجھے اُن کی قبر پر لے چلو۔“

”ہم وہیں جا رہے ہیں عاصم! اُس نے جواب دیا۔“

راستے میں ایک نوجوان ملا اور اُس نے نعمان سے مخاطب ہو کر کہا: ”آپ نے خلیفۃ المسلمین کا

اعلان سُن لیا۔“

”نہیں۔“

”انہوں نے حکم دیا ہے کہ شام تک تمام مجاہدین جروت میں جمع ہو جائیں۔ اور پرسوں صبح وہاں سے کوچ کر دیں۔“

نعمان اور سالم کچھ دیر اس نوجوان کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد وہاں سے چل پڑے۔ جب وہ مسجد نبوی کے صحن میں داخل ہوئے تو وہاں لوگوں کا ہجوم تھا اور وہ باری باری اُس حجرے کے اندر داخل ہو رہے تھے جہاں رسول اللہ دفن تھے۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد عاصم اور اُس کے ساتھیوں کی باری آئی اور وہ اندر داخل ہوئے، یہ حجرہ چراغوں سے روشن تھا اور لوگ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہے تھے۔ نعمان اور سالم کی تقلید میں عاصم نے بھی ہاتھ اٹھائے، لیکن کچھ دیر دعا کے لئے کوئی موزوں الفاظ اُس کے ہونٹوں پر نہ آسکے یا آخر اُس نے کہا: ”میرے آقا تیری قبر پر خدا کی رحمتوں کی بارش ہو۔ میرے آقا میں بہت دیر سے آیا۔ کاش! میں تجھے ایک بار دیکھ سکتا۔ لیکن اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود، میں تیرے اللہ کی رحمت کا طلبگار ہوں۔“ پھر اُس کی آواز بلیٹھ گئی۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو اُڑائے۔ اور یہ آنسو ایک فرد کی بجائے اُن لاتعداد انسانوں کے جذبہ تشکر کی ترجمانی کر رہے تھے جنہیں رحمتہ للعالمین نے زندگی کی حقیقی مسرتوں سے آشنا کیا تھا۔



تیسرے دن عاصم مدینہ سے ایک کوس دور جروت کے مقام پر اُس لشکر کی روانگی کا روح پرور نظارہ دیکھ رہا تھا، جسے توحید کا پرچم عرب کی سرحدوں سے آگے لے جانے کی سعادت عطا ہوئی تھی۔ عبد اللہ، اپنے باپ نعمان اور اپنے ماموں سالم کو الوداع کہنے کے لئے اُس کے ساتھ آیا تھا اور وہ عاصم کے گھوڑے کی باگ تھامے ایک طرف کھڑا تھا۔

اس لشکر میں قبائل عرب کے وہ رؤسا موجود تھے جو اسلام قبول کرنے سے قبل ادنیٰ اور اعلیٰ کا امتیاز قائم رکھتا اپنی زندگی کا اولین مقصد سمجھتے تھے اور جو صرف اپنے قبیلوں کی برتری کا ثبوت دینے کے لئے

نہ مدینہ سے ایک کوس دور وہ مقام جہاں شام کی طرف کوچ کرنے والی فوج نے پڑاؤ ڈالا تھا۔

ہمیشہ خون کی ندیاں بہانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس لشکر میں وہ ملیں اللہ رحمانی موجود تھے جنہیں اپنی بزرگی اور پاکیزگی کے علاوہ خاندانی رشتوں کی بدولت رسول اللہ کی قربت کا فخر حاصل تھا۔ اور یہاں ان لوگوں کا بہادر اور تجربہ کار سپاہیوں کی بھی کمی نہ تھی۔ جو ہر آزمائش اور ہر امتحان میں پورے اتر چکے تھے۔ لیکن اس لشکر کی قیادت ایک ایسے فوجوان کو سونپی گئی تھی، جس کی سب سے بڑی متاع رسول اللہ کی محبت تھی اور جس سے باپ کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں انسانیت کی عظمتیں نصیب ہوتی تھیں۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ گھوڑے پر سوار تھے اور حضرت ابوبکرؓ کو کھڑے انہیں ہدایات دے رہے تھے۔ کسی کو اعتراض کی مجال نہ تھی کسی کو یہ کہنے کا یا رانہ تھا کہ انتہائی معزز صحابیوں، آزمودہ کار سالاروں، اور انتہائی بااقتبالی سرداروں کی موجودگی میں اتنی اہم عہد کی قیادت اسامہ کو کیوں سونپی گئی ہے۔ اسلام آقا اور غلام کا امتیاز مٹا چکا تھا۔ اللہ کے دین کی روشنی زمانہ جاہلیت کی تمام عصبیتوں کو شکست دے چکی تھی۔ اس سے قبل جن بزرگوں نے گروہ پیش کے حالات سے پریشان ہو کر اسامہ کی بجائے کسی زیادہ عمر اور تجربہ کار آدمی کو یہ عہد سونپنے کی تجویز پیش کی تھی، انہیں مطمئن کرنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ جواب کافی تھا کہ اسامہ کو رسول اللہ نے منتخب کیا تھا اور بڑے سے بڑا خطرہ بھی مجھے اس فیصلہ میں تبدیل پر آمادہ نہیں کر سکتا۔

پھر جب اسلام کا یہ لشکر روانہ ہوا تو اسامہ بن زید گھوڑے پر سوار تھے اور ابوبکر صدیقؓ ان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پیدل چل رہے تھے۔

حضرت اسامہؓ خلیفہ اول کے مقام سے بے خبر نہ تھے۔ انہوں نے ملتی ہو کر گھوڑے غلیظہ رسول اللہؐ مجھے شرمسار نہ کیجئے، آپ گھوڑے پر سوار ہو جائیے، ورنہ میں بھی اتر چڑتا ہوں۔“

اور انہوں نے فرمایا ”نہیں اسامہ، مجھے تھوڑی دور اللہ کی راہ میں اپنے پاؤں غبار آلود کرنے سے منع نہ کرو۔“

جب لشکر تھوڑی دور چلا گیا تو عاصم نے عبد اللہ کے ہاتھ سے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا ”عبد اللہ میں تمہارے باپ اور ماموں کے ساتھ جا رہا ہوں۔“

عبد اللہ نے کہا ”لیکن آپ تو صرف انہیں الوداع کہنے آئے تھے۔“

عاصم نے گھوڑے پر سوار ہو کر جواب دیا ”سعاد سے کہہ دینا کہ یونس کی اتنی میری واپسی تک تمہارے گھر رہے گی۔“

ان کی آن میں وہ اُس قافلے کے ساتھ شامل ہو چکا تھا، جس کی راہ کے عباد کو کہکشاں کی دلکشی اور تابندگی عطا ہونے والی تھی۔ راہ حق کے یہ مسافر اُن مجاہدوں کے پیش رو تھے، جن کے گھوڑوں کی ٹاپ قیصر اور کسری کے یوانوں تک سنائی دینے والی تھی۔ حال اُن کے حوصلوں اور دلوں سے لبریز تھا۔ اور مستقبل کی فتوحات پر مرکب اجنادین اور قاصد سید کے میدانوں میں اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور چند معزز صحابی جنہیں انہوں نے مدینہ کی حفاظت کے لئے روک لیا تھا، کچھ دور اسامہ بن زیدؓ کا ساتھ دینے کے بعد اُن بچوں اور بوڑھوں کے درمیان کھڑے تھے جو اپنے عزیزوں کو رخصت کرنے آئے تھے۔ یہ لوگ اُن خطرات سے بے خبر نہ تھے جو رسول اکرمؐ کے وصال کے بعد مدینہ کو اسلام سے انحراف کا راستہ اختیار کرنے والے قبائل کی طرف سے پیش آنے والے تھے۔ لیکن اُن کے چہروں پر خوف و ہراس کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ اس بات پر مطمئن اور مسرور تھے کہ اُن کے آقا کے آخری حکم کی تعمیل ہو رہی ہے۔ اُن کے ہونٹوں پر غازیان اسلام کی فتح اور نصرت کی دعائیں تھیں اور صدیق اکبرؓ سے زیادہ یہ کون جانتا تھا کہ یہ دعائیں قبول ہونے والی ہیں۔ وہ پورے اطمینان اور یقین کے ساتھ اُس قافلے کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے۔ جس کی راہ کے غبار میں قیصر و کسری کی عظمتیں گم ہونے والی تھیں۔ ملت اسلام کے کسین بیٹوں کو جو ابھی تک تلواریں اٹھانے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ اُن کی نگاہیں بشارت دے رہی تھیں کہ غازیان اسلام اُس عظیم لشکر کا دستہ ہر اول ہیں جسے قدرت نے عجم میں جہالت اور ظلم کے جھنڈے سرنگوں کرنے کے لئے منتخب کیا ہے۔ جب وہ شام کی مہم سے واپس آئیں گے تو تم مسرت کے نعروں کے ساتھ اُن کا غیر مقدم کرو گے اور پھر جب تمہاری باری آئے گی تو تم اللہ کے دین کا پرچم اُن سرداروں سے آگے لے جاؤ گے جہاں سائرس اور سکندر کے قدم رک گئے تھے۔ لیکن وہ ظاہر ہیں جو نتائج کو صرف اسباب کی روشنی میں دیکھ سکتے تھے جنہوں نے کسری پر یز کی فتوحات کے دور میں رومیوں کے دوبارہ غالب آنے کے متعلق قرآن حکیم کی آیات کا مذاق اڑایا تھا، جنہوں نے پیغمبر اسلام کی وفات کی خبر سنتے ہی حال اور مستقبل کی روشنی سے

منہ پھیر کر ماضی کی جھیا ننگ تار یکیوں سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔ آج بھی یہ سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے کہ انہوں نے اُس پاس کے ٹیلوں کی اوٹ سے جس لشکر کی روانگی کا منظر دیکھا ہے۔ وہ روم کی عظیم قوت کے ساتھ ٹکر لے سکتا ہے۔ انہیں اگر کوئی اطمینان تھا تو وہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے شام پر چڑھائی کے شوق میں مدینہ کو اُن کے دھم دکر م پر چھوڑ دیا ہے۔

لیکن چند دن بعد مدینہ کو تاخت و تاراج کرنے کی مہم میں ناکامی اور شام کی مہم سے اسامہ کی کامیاب مراجعت کے باعث اُن کے حوصلے ٹوٹ چکے تھے۔ اور وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ فرزندِ ادم کی تاریخ میں معجزات کا دور ابھی ختم نہیں ہوا۔